INDIA WINS FREEDOM

ہندوستان آزاد ہو گیا

مولانا ابوالکلام آزاد

ترجمہ نعیم اللہ ملک

امامُ الہند کی وصیّت کے مطابق تیس سال تک سربمہر رکھے گئے تیس صفحات کے اضافے کے ساتھ

ہندوستان آزاد ہو گیا

مولانا ابوالکلام آزاد

ترجمہ
نعیم اللہ ملک

نشریات

۴۰ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۴۵۸۹۴۱۹۔۰۳۲۱

نام کتاب : ہندوستان آزاد ہو گیا
مصنف : مولانا ابوالکلام آزاد
مترجم : نعیم اللہ ملک
اہتمام : نشریات، لاہور
مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور
اشاعت : ۲۰۱۰ء
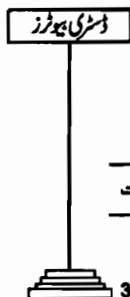
دوست اور ساتھی
جواہر لعل نہرو کے لیے

ترتیب

مولانا آزاد۔ایک بے پناہ شخصیت

''لیکن انسانوں کی بدعملی سے تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جاسکتی۔ اسلام کی تعلیم اس کی مقدس کتاب قرآن میں ہے۔ وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتا کہ مسلمان آزادی کھوکر زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں ہے۔''

مولانا کے یہ الفاظ بچپن سے میرے کانوں میں گونجتے رہے ہیں۔ میں نے ہوش سنبھالا تو مولانا کی تحریروں، خاص طور پر سورہ فاتحہ کی تفسیر ام الکتاب، ترجمان القرآن، تذکرہ، غبار خاطر، انڈیا ونز فریڈم اور کلکتہ میں مقدمہ بغاوت کی سماعت کے دوران آپ کے تاریخی بیان کا پورے انہماک اور ذوق وشوق کے ساتھ مطالعہ شروع کر دیا۔ مولانا کی عمر ۱۸ سال تھی جب انھوں نے آزادی وحق طلبی میں تقریر وتحریر کا آغاز کیا اور زندگی کا بہترین حصہ یعنی عہد شباب صرف اسی مقصد میں قربان کر دیا۔ لیکن زمانہ اس نابغہ روزگار شخصیت کے جوہر کا ادراک نہ کرسکا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''افسوس کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کرسکا۔ مذہب، علوم و فنون، انشا، شاعری غرض کوئی ایسی وادی نہیں ہے جس کی بے شمار نئی راہیں مبدا فیض نے مجھ نامراد کے دل ودماغ پر نہ کھول دی ہوں۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔''

بھارت کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے دہلی یونیورسٹی کی طرف سے مولانا کو پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری دیتے ہوئے یہ یادگار الفاظ کہے تھے:

''اردو زبان کو ہمیشہ اس بات پر فخر رہے گا کہ وہ ابوالکلام کے منہ سے بولی اور ان کے قلم سے لکھی گئی ہے۔''

نثر نگاری میں مولانا کے پائے کا تو کیا، ان کی گرد تک پہنچنے والا کوئی ادیب اور مصنف اس برعظیم نے اب تک پیدا نہیں کیا۔

مولانا کی زندگی کا ایک اور بے مثل جوہر یہ ہے کہ وہ ایک بلند مرتبت سیاسی مفکر تھے۔ ان کی کئی پیش گوئیاں درست ثابت ہو چکی ہیں اور درست ثابت ہو رہی ہیں۔ اگرچہ مسلم لیگ کی قیادت نے انہیں

''کانگریس کا شو بوائے'' کہا لیکن مولانا کی سیاسی بصیرت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا اور انگریزوں کے خلاف آزادی کا مقدمہ نہیں لڑا بلکہ عملی جدوجہد میں زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے میں صرف کیا۔ وہ ایک پُر آشوب دور میں سات برس تک کانگریس کے صدر رہے لیکن انھوں نے یہ عہدہ کسی سیاسی مصلحت کے ناتے نہیں، میرٹ پر حاصل کیا تھا۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لعل نہرو ان جیسا سیاسی وژن نہیں رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ گاندھی جب مرن برت توڑتے تو کہتے کہ مولانا کو بلائیں تاکہ وہ ان کے ہاتھ سے سنگترے کا جوس پئیں۔ اسی طرح جواہر لعل مولانا کی کار کا دروازہ کھولنے میں فخر محسوس کرتے۔

ہمارے بے شمار قومی المیوں میں ایک المیہ یہ ہے کہ ہم پہلے سے طے شدہ رائے کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے۔ مولانا کی اس سوانح عمری کو پڑھ کر قارئین کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے گا کہ برعظیم کی آزادی کے بارے میں ان کا وژن کیا تھا اور یہ کہ وہ ایک عظیم مذہبی رہنما، امام الہند اور مفسر قرآن ہی نہیں، اپنے زمانے کے بہت بڑے سیاسی مفکر بھی تھے۔ وہ بھارت میں رہ جانے والے کروڑوں بے بس مسلمانوں کی آواز تھے۔ مسلمانوں کی جانیں بچانے میں انھوں نے جو کردار ادا کیا، وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

افسوس! ہمارے نام نہاد دانشوروں نے مولانا کی بلند قامت شخصیت کو مسخ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس کتاب کے ترجمے میں بدترین ادبی خیانت کی، اس میں اپنی مرضی سے اضافے کیے گئے اور کئی پیراگراف حذف کر دیے۔ مجھے بچپن سے مولانا کے ساتھ عقیدت رہی ہے اور وہ میری آئیڈیل شخصیت تھے۔ یہ کتاب مولانا کا قرض اتارنے کی ایک کوشش ہے۔

مولانا کی عظیم شخصیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہاں ایک واقعہ نقل کر دینا ہی کافی ہے جو ہندوستان کے اس وقت کے بڑے اردو اخبار ریاست کے اڈیٹر دیوان سنگھ مفتون نے اپنی سوانح حیات ''ناقابل فراموش'' میں بیان کیا ہے:

ملاقات کے لیے وقت مقرر ہونے پر میں مولانا کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ میں ان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ آپ کے سیکرٹری اجمل خان کمرے میں داخل ہوئے اور انھوں نے بتایا کہ جواہر لعل کا ٹیلی فون آیا ہے، وہ دس بجے ملنے کے لیے آ رہے ہیں۔ یہ سن کر مولانا نے کہا: جواہر لعل سے کہہ دو کہ گیارہ بجے آئیں۔ میں اپنے ایک دوست سے باتیں کر رہا ہوں۔ یہ سن کر اجمل خان تو جواہر لعل کو ٹیلی فون کرنے چلے گئے اور میں حیران کہ ہندوستان کا وزیر تعلیم اپنے وزیر اعظم سے کہہ رہا تھا کہ ابھی نہ آئیں، وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم کے سوال پر مولانا نے ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کو جو بیان جاری کیا، وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے:

> ''میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے اس حق کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوں کہ پورے ہندوستان کو میدانِ عمل سمجھوں اور اس کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کی تشکیل میں شرکت کروں۔ میرے لیے یہ بڑی بزدلی کی بات ہے کہ میں اپنے آبائی ورثے سے دست بردار ہو کر اس کے ایک ٹکڑے پر قناعت کرلوں۔''

مشہور مقدمہ بغاوت کی کارروائی کے دوران مولانا نے ۱۱ جنوری ۱۹۲۲ کو پریذیڈنسی جیل علی پور کلکتہ میں جو بیان دیا، وہ ان کی جرأت ایمانی اور حریت فکر کا لازوال نمونہ ہے۔ فرماتے ہیں:

میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تحریری یا تقریری بیان یہاں پیش کروں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لیے نہ تو کسی طرح کی امید ہے، نہ طلب ہے، نہ شکایت ہے۔ یہ ایک موڑ ہے جس سے گزرے بغیر ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے اپنی مرضی کے خلاف یہاں دم لینا پڑتا ہے۔

ہمارے اس دور کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی نئی نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل اور حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ نہیں۔

تاریخ انسانی کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدان جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں میں ہی ہوئی ہیں۔ دنیا کے مقدس بانیانِ مذہب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ بلاشبہ زمانے کے انقلاب سے عہد قدیم کی بہت سی برائیاں مٹ گئیں اور اب دنیا میں دوسری صدی کی خوفناک رومی عدالتیں ازمنۂ متوسط کی پراسرار ''انکویزیشن'' وجود نہیں رکھتیں لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے، ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں ضرور گرادی گئی ہیں جن کے اندر خوفناک اسرار بند تھے لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں؟

عدالتوں کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے، تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کیے گئے۔ ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فلورنس کے فداکار حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے جو اپنی معلومات و

مشاہدات کو اس لیے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم تھا۔ مجرموں کا یہ کٹہرا کیسی عجیب مگر عظیم الشان جگہ ہے جہاں سب سے اچھے اور سب سے برے دونوں طرح کے آدمی کھڑے کیے جاتے ہیں۔

ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں، گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آجائے، اگر باز نہیں آسکتی تو مٹادی جائے گی۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر کہے جاسکتے ہیں۔

میں مسلمان ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اسلام آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے جو بنی نوع انسان کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خودغرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی یہ اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگانِ خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔

انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلابِ فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہ تھا بلکہ ایک عملی نظام تھا جو مشہور مورخ گبن کے لفظوں میں "اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا"۔

پہلے دور کے مسلمانوں کی حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ دارالخلافت کی ایک بڑھیا عورت خلیفہ وقت سے برسرِعام کہہ سکتی تھی: اگر انصاف نہ کرو گے تو تکلے کی طرح تمہارے بل نکال دیں گے۔ لیکن وہ مقدمہ بغاوت چلانے کی جگہ خدا کا شکرادا کرتا کہ قوم میں ایسی راست باز زبانیں موجود ہیں۔ عین جمعہ کے مجمع میں جب خلیفہ منبر پر خطبہ دینے کے لیے کھڑا ہوتا اور کہتا: سنو اور اطاعت کرو تو ایک شخص کھڑا ہوجاتا اور کہتا: نہ تو سنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ تمہارے جسم پر جو چغہ ہے، وہ تمہارے حصے سے زیادہ کا بنا ہوا ہے۔ اس پر خلیفہ اپنے لڑکے سے گواہی دلاتا۔ وہ اعلان کرتا کہ میں نے اپنے حصے کا کپڑا بھی اپنے باپ کو دے دیا تھا، اس سے چغہ تیار ہوا۔ قوم کا یہ طرزِ عمل اس خلیفہ کے ساتھ تھا جس کی صولت اور سطوت نے مصر اور ایران کا تخت الٹ دیا تھا تاہم اسلامی حکومت میں کوئی دفعہ ۱۲۴ الف نہ تھی۔

ہشام بن عبدالملک نے طاؤسِ یمانی کو بلایا۔ وہ آئے مگر اس کا نام لے کر سلام کیا، امیر المومنین نہ کہا۔ ہشام نے سبب پوچھا تو کہا: قوم تیری حکومت سے راضی نہیں اس لیے تجھے ان کا امیر کہنا جھوٹ ہے۔ ہشام نے کہا: نصیحت کیجیے۔ فرمایا: خدا سے ڈر کیونکہ زمین تیرے ظلم سے بھر گئی ہے۔

مالک بن دینار بصرہ کی جامع مسجد میں اعلان کرتے: ان ظالم بادشاہوں کو خدا نے اپنے بندوں کا

چرواہا بنایا تھا تاکہ ان کی رکھوالی کریں۔ پر انہوں نے بکریوں کا گوشت کھالیا، بالوں کا کپڑا بن کر پہن لیا اور صرف ہڈیاں چھوڑ دیں۔

سلیمان بن عبدالملک جیسے ہیبت ناک خلیفہ سے ابو حازم کہتے: تیرے باپ دادوں نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مقہور کیا اور بلا قوم کی رائے اور انتخاب کے مالک بن بیٹھے۔ سلیمان نے کہا: اب کیا کیا جائے؟ جواب دیا: جن کا حق ہے، انہیں لوٹا دے۔ کہا: میرے لیے دعا کیجیے۔ فرمایا: خدایا اگر سلیمان حق پر چلے تو اس کو مہلت دے لیکن اگر ظلم سے باز نہ آئے تو پھر تو ہے اور اس کی گردن!

سعید بن مسیب بہت بڑے تابعی تھے۔ وہ علانیہ سرِ بازار حکام کے ظلم و جور کا اعلان کرتے اور کہتے: کتوں کا پیٹ بھرتے ہو مگر انسانوں کو تم سے امان نہیں۔

منصور عباسی کے خوف اور ہیبت سے گھر میں بیٹھے ہوئے لوگ کانپا کرتے تھے۔ سفیان ثوری سے ایک بار اس نے کہا: مجھ سے اپنی کوئی حاجت بیان کیجیے۔ انہوں نے جواب دیا: خدا سے ڈر! زمین ظلم و جور سے بھر گئی ہے۔

مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید جب تخت نشین ہوا (جس نے فرانس کے شارلیمن کو ایک عجیب گھڑی تحفے کے طور پر بھیجی تھی اور قیصر روم کو بقول گبن "اے کتے کے بچے!" کے لقب سے خط لکھا تھا) تو اس نے انہی سفیان ثوری کو اپنے ہاتھ سے اشتیاق ملاقات کا خط لکھ کر بھیجا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں نے تخت نشینی کی خوشی میں بے شمار مال و دولت لوگوں میں تقسیم کی ہے، تم بھی مجھ سے آ کر ملو۔ سفیان کوفہ کی مسجد میں ایک بڑے مجمع کے اندر بیٹھے ہوئے تھے کہ خط پہنچا لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا: جس چیز کو ایک ظالم کے ہاتھ نے چھوا ہے، میں اسے چھونا نہیں چاہتا۔ جب پڑھ کر سنایا گیا تو اسی کی پشت پر جواب لکھوا دیا: خدا کے مغرور بندے ہارون کو جس کا ذوق ایمان سلب ہو چکا ہے۔ معلوم ہو، تو نے قوم کا مال بلا کسی حق کے اپنی تخت نشینی کی خوشی میں لٹایا اور اس کا حال لکھ کر اپنے گناہ پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی گواہ ٹھہرایا۔ پس ہم کل کو اللہ کے آگے اس کی گواہی دیں گے۔ اے ہارون تو نے انصاف و حق سے کنارہ کیا، تو نے پسند کیا کہ ظالم بنے اور ظالموں کی سرداری پائے۔ تیرے حاکم بندگانِ خدا کو ظلم و جور سے پامال کر رہے ہیں اور تو تخت نشینی پر عیش کر رہا ہے۔ ہارون نے یہ خط پڑھا تو بے اختیار رونے لگا اور کہا: یہ خط ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔

منصور عباسی ایک دن کعبے کا طواف کر رہا تھا۔ آواز آئی کہ کوئی شخص دعا مانگ رہا ہے: خدایا میں تیرے آگے فریاد کرتا ہوں، ظلم غالب آ گیا ہے اور حق اور حق داروں کے درمیان روک بن گیا ہے۔ منصور نے اس شخص

کو بلا کر پوچھا: وہ کون ہے جس کا ظلم روک بن گیا ہے؟ کہا: تیرا وجود اور تیری حکومت!

حجاج بن یوسف کا ظلم وستم تاریخ اسلام کا نہایت مشہور واقعہ ہے لیکن اس کی بے پناہ تلوار بھی مسلمانوں کی حق گوئی پر غالب نہ آسکی۔ حطیط جب گرفتار ہوکر آیا تو پوچھا: اب میرے لیے کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا: تو خدا کی زمین پر اس کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ پوچھا: خلیفہ کے لیے کیا کہتے ہو؟ کہا: اس کا جرم تجھ سے بھی زیادہ ہے۔ تیرا ظلم تو اس کے بے شمار ظلموں میں سے صرف ایک ظلم ہے۔

مامون الرشید کے عہد میں ایسے مسلمان موجود تھے جو پکار پکار کر برسرِ دربار کہتے: اے ظالم! میں ظالم ہوں اگر تجھے ظالم کہہ کر نہ پکاروں۔

ہمارے سامنے قانون کا ایک ڈراما کھیلا جا رہا ہے جسے ہم کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں کہہ سکتے ہیں لیکن میں اسے ٹریجڈی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ حسن اتفاق سے اس کا چیف ایکٹر انگلستان کا سابق چیف جسٹس ہے۔ میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ سزا جو اس کے اختیار میں ہے، بلا تامل مجھے دے دے، مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت گارڈینیر برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا: زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے، بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی، اس کا عشرِ عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔

آخر میں مجھے ان حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس کتاب کو آپ تک پہنچانے میں میری معاونت کی ہے۔ سرورق کے لیے خطاطی محمد علی زاہد نے کی اور ٹائٹل کو ملک کی نامور ڈیزائنر محترمہ حویریہ حنیف نے تیار کیا ہے۔ حویریہ نے طلوعِ آزادی اور ہندوستان کی تقسیم پر ہونے والی تاریخ انسانی کی بدترین قتل و غارت گری کے خون آشام منظر کی کمال ہنرمندی کے ساتھ عکاسی کی ہے۔ شخصیات کا اشاریہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے چیف لائبریرین عبدالوحید نے تیار کیا جس پر میں ان کا سپاس گزار ہوں۔

نعیم اللہ ملک

مراکیوال، سیالکوٹ

یکم اپریل ۲۰۰۸

پبلشرز نوٹ

مرحوم پروفیسر ہمایوں کبیر نے مولانا آزاد کی وفات کے سات ماہ بعد ستمبر ۱۹۵۸ میں جب INDIA WINS FREEDOM کا مسودہ اشاعت کے لیے ہمارے حوالے کیا تو ہمیں بتایا گیا کہ کتاب کا مکمل متن، جس میں تیس صفحات کے قریب اضافی مواد شامل ہوگا، مولانا آزاد کی تیسویں برسی کے موقع پر ۲۲ فروری ۱۹۸۸ کو ہمارے سپرد کیا جائے گا۔

جب یہ وقت آیا تو بعض افراد کی طرف سے اٹھائے جانے والے مختلف ایشوز کے باعث کتاب کے مکمل متن کو اشاعت کے لیے ہمارے حوالے کرنے میں تاخیر ہوگئی۔ ان معاملات کی سماعت کلکتہ ہائی کورٹ، دہلی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں ہوئی چنانچہ دہلی ہائی کورٹ کے جسٹس بی این کرپال نے ۲۹ ستمبر ۱۹۸۸ کو یہ ہدایت جاری کی کہ کلکتہ کی نیشنل لائبریری اور نیشنل آرکائیوز دہلی میں اس کتاب کی جمع کرائی جانے والی کاپیاں اسی روز اورینٹ لانگ مین کے حوالے کردی جائیں۔ عدالت نے یہ ہدایت بھی جاری کی کہ دونوں کاپیوں کے موازنے کے بعد اسے دوبارہ شائع کیا جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ متن میں کوئی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ ہم نے متن کی مکمل چھان بین کرلی ہے۔

مسودوں کی جانچ پڑتال کے دوران یہ واضح ہوگیا کہ عمومی یقین کے برعکس یہ اضافی مواد مزید تیس صفحوں پر مشتمل نہیں بلکہ یہ مواد پورے متن میں منتشر صورت میں موجود تھا۔ شائع شدہ متن میں کئی جملے اور پیرے حذف کردیے گئے تھے جب کہ پروفیسر کبیر نے اصل متن میں مختلف مقامات پر کانٹ چھانٹ کی تھی۔ (دیکھیے ضمیمہ نمبر ۱: ہمایوں کبیر کا نوٹ)۔

موجودہ ایڈیشن میں ہمیں مہیا کی جانے والی کاپیوں کے مطابق مکمل متن شائع کردیا گیا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں اہم اضافوں کو شروع اور آخر میں ستارے ☆ کے نشان سے واضح کردیا گیا ہے۔ ہم نے پہلے سے شائع شدہ دیباچے اور ضمیموں کو بھی اس ایڈیشن میں شامل کرلیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۸۸

پہلے ایڈیشن کا دیباچہ

دو سال سے زیادہ عرصہ ہوا کہ میں نے مولانا آزاد کی خدمت میں یہ درخواست کی کہ وہ اپنی سوانح حیات لکھیں۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن مجھے دکھ بھرے دل کے ساتھ اس سوانح عمری کا دیباچہ لکھنا پڑے گا۔ مولانا اپنی نجی زندگی کے حالات کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے انہوں نے ذاتی حالات بیان کرنے میں تذبذب سے کام لیا۔ میں نے انہیں بڑی مشکل سے اس بات پر آمادہ کیا کہ چونکہ برطانیہ سے ہندوستان کے ہاتھوں اختیارات کی منتقلی میں ان کا حد درجہ نمایاں اور ممتاز کردار رہا ہے اس لیے ان کا فرض ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کے سامنے اس یادگار زمانے کے متعلق اپنے مشاہدات ضبط تحریر میں لائیں۔ مولانا کے تذبذب کی ایک جزوی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی صحت تباہ ہو چکی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں اپنی تمام تر صلاحیتیں ان ناگزیر سیاسی اور انتظامی کاموں کے لیے وقف کر دینی چاہئیں جن کا بوجھ ان کے کندھوں پر ڈال دیا گیا تھا۔ آخر جب میں نے انہیں یقین دلا دیا کہ میں حتی الامکان انہیں اپنے ہاتھ سے لکھنے کی زحمت نہیں دوں گا تو وہ راضی ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی عوام ان کی اپنی زبان میں لکھی ہوئی سوانح عمری کے پڑھنے کے شرف سے محروم رہیں گے اور ہندوستانی ادب خاص طور پر اردو زبان میں یہ ایک بہت بڑی کمی رہ جائے گی۔ لیکن کچھ نہ ہونے سے تو یہی بہتر ہے کہ ان کی ہدایت اور نگرانی میں انگریزی میں لکھی کتاب تیار ہو جائے۔

میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ موجودہ کتاب کس طرح مرتب ہوئی ہے۔ پچھلے دو اڑھائی برس سے میرا یہ معمول رہا ہے کہ ماسوائے ان دنوں کے جب مجھے دہلی سے باہر جانا پڑتا، میں ہر شام گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مولانا کی صحبت میں گزارتا۔ انہیں گفتگو کے فن پر کمال ملکہ حاصل تھا اور وہ اپنے تجربات اور مشاہدات کو واضح اور شفاف انداز میں بیان کرتے۔ میں ساتھ ساتھ نوٹس لکھتا جاتا اور جب کسی معاملے میں مزید وضاحت یا معلومات کی ضرورت ہوتی، ان سے سوال پوچھ لیتا۔ وہ اپنے ذاتی معاملوں پر گفتگو کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہے البتہ پبلک امور پر انہوں نے کھلے دل اور کامل اخلاص کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ جب میرے پاس کتاب کے ایک باب کے لیے خاصا مواد جمع ہو جاتا تو میں انگریزی میں اس کا مسودہ تیار کر کے جلد سے جلد ان کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ وہ ہر باب کو پہلے خود دیکھتے اور پھر ہم دونوں مل کر اسے پڑھتے۔ اس موقع پر وہ مسودے میں کئی اضافے اور ترمیمیں کرتے اور بعض پیروں کو حذف کر دیتے۔ ہم اسی طرح کام کرتے رہے یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۵۷ میں مَیں نے پوری کتاب کا پہلا مسودہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

جب مکمل کتاب کا مسودہ مولانا آزاد کے ہاتھ میں آ گیا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ کتاب کے کوئی تیس صفحات، جن میں ایسے واقعات اور تاثرات پر بحث کی گئی ہے جو بڑی حد تک ذاتی اور شخصی تھے، فی الحال شائع نہیں ہونے چاہئیں۔ انہوں نے ہدایت کی کہ مکمل مسودے کی ایک ایک سربمہر نقل کلکتے کی نیشنل لائبریری اور نیشنل آرکائیوز دہلی میں محفوظ کر دی جائے البتہ انہیں یہ فکر تھی کہ ان پیروں کو حذف کرنے سے واقعات کی جو تصویر انہوں نے پیش کی تھی، وہ بگڑنے نہ پائے اور جو نتائج انہوں نے اخذ کیے تھے اُن کے نفسِ مضمون میں کوئی فرق نہ آئے۔ میں نے ان کی ہدایات کے مطابق مسودے میں تبدیلیاں کر دیں اور نظر ثانی اور کاٹ چھانٹ کے بعد نومبر ۱۹۵۷ء میں مسودہ مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا۔

جب میں آسٹریلیا گیا ہوا تھا تو اس دوران مولانا نے مسودے کو دوبارہ پڑھا۔ میری وطن واپسی پر ہم دونوں نے ایک ایک باب بلکہ ایک ایک جملے کو کئی بار پڑھا۔ انہوں نے بعض معمولی تبدیلیاں کیں مگر کوئی بڑی تبدیلی نہ کی۔ بعض صورتوں میں کسی ایک باب پر تین چار مرتبہ نظر ثانی کی گئی۔ اس سال یوم جمہوریہ کے موقعے پر مولانا آزاد نے فرمایا کہ اب وہ مسودے سے پوری طرح مطمئن ہیں اور اسے طباعت کے لیے بھیجا جا سکتا ہے۔ اس وقت جو کتاب شائع کی گئی ہے وہ اس حتمی طور پر منظور کیے گئے مسودے کے عین مطابق ہے۔

مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ یہ کتاب نومبر ۱۹۵۸ میں ان کی سترویں سالگرہ کے دن شائع ہو لیکن مشیتِ ایزدی کچھ اور تھی اور اب جو کتاب شائع ہوگی تو وہ ہم میں موجود نہ ہوں گے۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، مولانا شروع میں اس کتاب کی تیاری پر آمادہ نہیں تھے لیکن جوں جوں کتاب کا کام آگے بڑھا، ان کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ آخری چھ سات مہینوں میں بہت کم ایسا ہوا کہ انہوں نے کسی شام مسودے کی تیاری میں کوئی ناغہ کیا ہو۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کے حالات بیان کرنے سے حددرجہ گریزاں تھے لیکن آخر میں وہ خود ہی کتاب کا پہلا باب لکھنے پر آمادہ ہو گئے جس میں ان کی زندگی کے ابتدائی مراحل اور ۱۹۳۷ تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے خلاصے کی بھی منظوری دے دی جو اُن کی خواہش کے مطابق کتاب میں پہلے باب کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا ہے۔ مولانا آزاد ۱۹۴۸ کے بعد رونما ہونے والے واقعات پر بحث کے لیے تیسری جلد بھی لکھنا چاہتے تھے لیکن ہماری بدقسمتی کہ اب یہ جلد کبھی نہ لکھی جا سکے گی۔

میں نے اس کتاب کے سلسلے میں جو کچھ کیا ہے، وہ شوق اور محبت میں کیا ہے اور مجھے خوشی ہوگی اگر یہ کسی قدر بھی اس مقصد کو حاصل کرنے میں معاون ثابت ہو جو مولانا کو دل سے عزیز تھا۔ یہ مقصد تھا پہلے قدم کے طور پر ہندوستان کے مختلف طبقوں اور پھر اقوام عالم کے درمیان افہام و تفہیم کو فروغ دینا۔ مولانا کی یہ

بھی خواہش تھی کہ بھارت اور پاکستان کے عوام ایک دوسرے کو دوست اور پڑوسی سمجھیں۔ وہ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ تصور کرتے تھے اور اس کونسل کے آخری خطبۂ صدارت میں...... جو اُن کی تیار کی ہوئی آخری مطبوعہ تقریر تھی...... انہوں نے دونوں ریاستوں کے باشندوں کے درمیان، جو صرف دس برس پہلے تک ایک متحد ملک تھا، مفاہمت اور ہمدردی کے رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے پُر جوش اپیل کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب سے جو آمدنی ہو، اس کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں ہو سکتا کہ وہ اس مقصد کے لیے کونسل کو دے دی جائے تاکہ وہ اس رقم کو بھارت اور پاکستان میں رہنے والے مختلف طبقوں کے درمیان مفاہمت کو فروغ دینے کے لیے استعمال کر سکے۔ اس کتاب کی رائلٹی سے حاصل ہونے والی آمدنی کے ایک حصے کو چھوڑ کر، جو مولانا کے قریبی رشتے داروں کو ادا کی جائے گی، باقی رقم کونسل کو دے دی جائے گی تاکہ وہ ہر سال دو ایوارڈ دے سکے۔ ایک انعام ایسے غیر مسلم کو، جو اسلام پر اور دوسرا انعام بھارت یا پاکستان کے کسی ایسے مسلمان شہری کو، جو ہندومت پر بہترین مضمون لکھے، دیا جائے گا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ مولانا آزاد کو نوجوانوں سے کتنی محبت اور کتنا لحاظ تھا، اس مقابلے میں صرف وہی افراد شرکت کر سکیں گے جن کی عمر ہر سال ۲۲ فروری کو تیس سال یا اس سے کم ہوگی۔

اپنا بیان ختم کرنے سے پہلے میں ایک اور بات کو بالکل صاف اور واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ اس کتاب میں بعض ایسی رائیں، تجزیے اور خیالات درج کیے گئے ہیں جن سے مجھے اتفاق نہیں ہے لیکن چونکہ میرا کام صرف یہ تھا کہ مولانا آزاد نے جو نتائج اخذ کیے تھے میں انہیں ضبط تحریر میں لے آؤں اس لیے یہ کہنا نہایت نامناسب ہوگا کہ میں نے اس کتاب میں اپنے خیالات کی رنگ آمیزی کی ہے۔ جب وہ زندہ تھے تو میں اکثر ان پر ظاہر کرتا رہتا تھا کہ مجھے کن باتوں پر ان سے اختلاف ہے اور چونکہ کشادہ دلی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی اس لیے بعض اوقات وہ میری نکتہ چینی کے جواب میں اپنی رائے پر نظر ثانی کر لیتے۔ کئی مرتبہ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر کہتے: "یہ میرے خیالات ہیں اور مجھے یہ حق حاصل ہے کہ انہیں جس طرح چاہوں، بیان کروں"۔ اب چونکہ وہ ہمارے درمیان موجود نہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان کے خیالات کو بلا کم و کاست اسی صورت میں بیان کر دیا جائے۔

ایک شخص کے لیے کسی دوسرے کے خیالات اور آرا کو بالکل صحیح صحیح پیش کرنا ایک مشکل کام ہے۔ دونوں کی زبان ایک ہی ہو تب بھی مطلب میں نازک سا فرق پڑ جاتا ہے۔ اگر ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا جائے اور بات کے ایک پہلو کے بجائے دوسرے پر زیادہ زور دے دیا جائے تو اس سے بھی مفہوم بدل جاتا ہے۔ اردو اور انگریزی کے مزاج میں جو فرق ہے اس کی وجہ سے بھی مولانا آزاد کے خیالات کی ترجمانی ا

مشکل ہو جاتی ہے۔ بھارت کی دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی الفاظ اور محاوروں کی دولت سے مالا مال ہے۔ یہ ایک رنگین اور توانا زبان ہے لیکن اس کے برعکس انگریزی میں حقائق اور واقعات کی اہمیت کو کم کر کے بیان کیا جاتا ہے اور جب گفتگو کرنے والا اردو زبان میں وہ ملکہ رکھتا ہو جو مولانا آزاد کو حاصل تھا تو اس شخص کی حالت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اُن کے خیالات کی انگریزی میں ترجمانی کر رہا ہو۔ ان مشکلات کے باوجود میں نے مولانا کے خیالات کی صحیح عکاسی کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یہ حقیقت کہ انہوں نے میرے مسودے کو پسند کیا، میری محنت کا بیش قیمت معاوضہ ہے!

ہمایوں کبیر

نئی دہلی

۱۵ مارچ ۱۹۵۸

خاندان' بچپن اور جوانی

میرے آباء و اجداد بابر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ پہلے انہوں نے آگرہ کو مسکن بنایا اور بعد میں دہلی منتقل ہو گئے۔ یہ علمی ذوق رکھنے والا گھرانا تھا چنانچہ اکبر کے دور میں مولانا جمال الدین نے اپنے علم و فضل کی وجہ سے بہت شہرت پائی۔ پھر اس خاندان کے لوگ دنیاوی معاملات کی طرف راغب ہو گئے اور کئی ایک نے بڑے بڑے سرکاری عہدے حاصل کر لیے۔ شاہ جہان کے عہد میں محمد ہادی کو آگرہ قلعے کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

مولانا منور الدین میرے نانا تھے۔ مغل دور کے وہ آخری شخص تھے جنہیں رکن المدرسین کا خطاب دیا گیا۔ یہ عہدہ شروع میں شاہ جہان کے دور میں قائم ہوا تھا اور اس کا مقصد علم و فضل کے فروغ کے لیے حکومت کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنا تھا۔ رکن المدرسین کا فرض تھا کہ وہ عالموں اور مدرسوں کو حکومت کی جانب سے دی جانے والی زمینوں، وقف املاک اور وظائف کا انتظام کرے۔ اس لحاظ سے اسے دور جدید کا ڈائریکٹر تعلیمات کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت مغلوں کا اقتدار زوال پذیر تھا لیکن رکن المدرسین جیسے بڑے عہدے ابھی باقی تھے۔

میرے دادا کا جب انتقال ہوا تو میرے والد مولانا خیر الدین اس وقت بچے ہی تھے اس لیے ان کی پرورش ان کے نانا نے کی۔ غدر سے دو سال پہلے مولانا منور الدین نے ہندوستان کے حالات سے دلبرداشتہ ہو کر مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن جب وہ بھوپال پہنچے تو نواب سکندر جہاں بیگم نے انہیں روک لیا۔ وہ بھوپال میں ہی تھے کہ بغاوت شروع ہو گئی اور وہ دو سال تک وہاں سے نکل نہ سکے۔ پھر وہ بمبئی پہنچے لیکن موت نے انہیں آن گھیرا اور انہیں مکہ معظمہ جانا نصیب نہ ہوا۔

میرے والد کی عمر اس وقت کوئی پچیس برس تھی۔ وہ مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں انہوں نے اپنے لیے مکان بنایا اور شیخ محمد ظاہر وتری کی صاحبزادی سے شادی کر لی۔ شیخ محمد ظاہر وتری مدینہ منورہ کے ممتاز عالم دین تھے جن کی شہرت عرب سے باہر پہنچ چکی تھی۔ میرے والد کی عربی زبان میں دس جلدوں پر مشتمل کتاب جب مصر میں شائع ہوئی تو وہ بھی پورے عالم اسلام میں معروف ہو گئے۔ وہ کئی مرتبہ بمبئی اور ایک بار کلکتہ آئے۔ ان دونوں شہروں میں ان کے کئی مداح اور مرید ہو گئے۔ انہوں نے عراق، شام اور ترکی کی بھی سیاحت کی۔

مکہ معظمہ کی آبادی کے لیے نہر زبیدہ پانی حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ تھی۔ یہ نہر خلیفہ ہارون الرشید

کی بیگم زبیدہ خاتون نے تعمیر کرائی تھی۔ وقت کے ساتھ اس نہر کی حالت مخدوش ہو جانے پر شہر میں پانی کی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ حج کے زمانے میں پانی کی زبردست کمی شدت سے محسوس کی جاتی اور حاجیوں کو بہت تکلیف اٹھانا پڑتی۔ میرے والد نے اس نہر کی مرمت کرائی اور اس مقصد کے لیے ہندوستان، مصر، شام اور ترکی میں بیس لاکھ کا فنڈ جمع کیا۔ انہوں نے نہر کی اس انداز سے مرمت کرائی کہ بدو اسے دوبارہ نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اس وقت سلطان عبدالمجید ترکی کے فرماں روا تھے۔ انہوں نے اس خدمت کے صلے میں میرے والد کو فرسٹ کلاس مجیدی میڈل دیا۔

میں مکہ معظمہ میں ۱۸۸۸ میں پیدا ہوا۔ دو سال بعد میرے والد پورے خاندان کو لے کر کلکتہ آ گئے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے وہ جدہ میں گر پڑے تھے اور ان کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ ہڈی اپنی جگہ بٹھا تو دی گئی لیکن وہ اچھی طرح سے نہیں بیٹھی تھی۔ لوگوں نے انہیں مشورہ دیا کہ کلکتے کے سرجن اسے ٹھیک کر دیں گے۔ وہ صرف مختصر مدت کے لیے کلکتے میں قیام کرنا چاہتے تھے مگر ان کے مریدوں اور مداحوں نے انہیں جانے نہ دیا۔ کلکتہ آنے کے ایک سال بعد میری والدہ نے وفات پائی اور انہیں وہیں دفن کیا گیا۔

میرے والد زندگی کے روایتی طریقے کو پسند کرتے تھے۔ انہیں مغربی تعلیم پر ذرا بھی اعتقاد نہیں تھا اور انہیں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ مجھے جدید تعلیم دلوائیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ جدید تعلیم مذہبی عقیدے کو تباہ کر دے گی چنانچہ انہوں نے میری تعلیم کا پرانے دستور کے مطابق انتظام کیا۔

اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ رواج تھا کہ لڑکوں کو پہلے فارسی اور پھر عربی کی تعلیم دی جاتی۔ جب زبان میں کسی قدر مہارت ہو جاتی تو انہیں عربی میں فلسفے، اقلیدس، ریاضی اور الجبرے کا درس دیا جاتا۔ دینیات کی تعلیم بھی اس نظام کا لازمی جزو تھی۔ میرے والد نے بھی مجھے گھر میں تعلیم دی کیونکہ وہ مجھے کسی مدرسے میں نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ اگرچہ اس وقت کلکتہ مدرسہ موجود تھا لیکن میرے والد اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ شروع شروع میں انہوں نے خود مجھے پڑھایا اور بعد میں مختلف مضامین کے لیے مختلف اساتذہ مقرر کر دیے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر شعبے کے نامور اسکالر مجھے پڑھائیں۔

روایتی طریقے پر تعلیم پانے والے طالب علم عام طور پر بیس اور پچیس سال کی عمر کے درمیان اپنا کورس مکمل کر لیتے تھے۔ اس میں وہ مدت بھی شامل تھی جس میں طالب علم مبتدیوں کو درس دے کر یہ ثابت کرتا تھا کہ اس کا اپنا علم پختہ ہو گیا ہے۔ میں نے اپنا نصاب سولہ برس کی عمر میں مکمل کر لیا اور میرے والد نے کوئی پندرہ طالب علم جمع کیے جنہیں میں فلسفے، ریاضی اور منطق کی تعلیم دیتا تھا۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد مجھے پہلی مرتبہ سر سید احمد خان کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا اور جدید تعلیم

کے بارے میں ان کے خیالات کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک کوئی شخص سائنس، فلسفے اور ادب کا مطالعہ نہیں کرتا، جدید دور میں وہ صحیح معنوں میں پڑھا لکھا شخص نہیں بن سکتا چنانچہ میں نے انگریزی پڑھنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے مولوی محمد یوسف جعفری سے یہ ذکر کیا جو اس زمانے میں مشرقی علوم کے نصاب کے صدر ممتحن تھے۔ انہوں نے مجھے انگریزی کی ابجد سکھائی اور پیارے چرن سرکار کی ''فرسٹ بک'' پڑھنے کو دی۔ جیسے ہی مجھ میں زبان کی کچھ شدبد ہوئی، میں نے انجیل کو پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے انگریزی، فارسی اور اردو کے نسخے لیے اور ان تینوں کو سامنے رکھ کر پڑھنے لگا۔ اس سے مجھے عبارت کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ میں نے ڈکشنری کی مدد سے انگریزی اخبارات کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ اس طرح میں بہت جلد انگریزی کتابیں پڑھنے کے قابل ہوگیا۔ میں تاریخ اور فلسفے کا خاص طور پر مطالعہ کرتا رہا۔

میرے لیے یہ شدید ذہنی کشمکش کا دور تھا۔ میں جس گھرانے میں پیدا ہوا، وہ مذہبی روایات کے بہت گہرے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ہمارے خاندان میں روایتی زندگی کا ہر دستور اور قاعدہ بغیر چوں چرا کے مانا جاتا تھا اور خاندان کے لوگ قدیم وضع کے طور طریقوں سے سرمُو ہٹنا پسند نہیں کرتے تھے۔ میں اپنے آپ کو مروجہ رسموں اور عقیدوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہ کرسکا۔ میرا دل بغاوت کے ایک نئے احساس سے لبریز تھا۔ اپنے خاندان اور ابتدائی تربیت کی بدولت جو نظریات مجھے ملے تھے، میں ان سے ہرگز مطمئن نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ حق تک پہنچنے کی سبیل مجھے خود کرنا ہوگی چنانچہ میں نے دانستہ طور پر خاندان کے دائرہ اثر سے باہر نکلنے اور اپنے لیے الگ راہ تلاش کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

پہلی بات جس سے میں پریشان ہوا، وہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلافات کا مسئلہ تھا۔ میں یہ سمجھنے سے بالکل قاصر تھا کہ جب تمام فرقے ایک ہی سرچشمے سے روحانی سرمایہ حیات حاصل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو پھر ان میں یہ مخالفت اور عداوت کیوں ہے؟ میں یہ بھی سمجھ نہیں پاتا تھا کہ ہر فرقہ دوسروں پر پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ گمراہی اور بدعت کا الزام کیوں لگاتا ہے؟ مختلف فرقوں کے اختلافات کی وجہ سے میرے دل و دماغ میں خود بخود مذہب کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہونے لگے۔

میں یہ سوچنے لگا کہ اگر مذہب آفاقی سچائی کا مظہر ہے تو پھر مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان اختلافات اور تنازعے کیوں ہیں؟ اور ہر مذہب کی طرف سے یہ دعویٰ کیوں کیا جارہا ہے کہ صرف وہی حق کا آئینہ اور سچائی کا مخزن ہے، ہر مذہب دوسروں کو کیوں گمراہ اور باطل گردان رہا ہے؟

دو تین برس تک میں اسی بے چینی کا شکار رہا۔ میں ان شکوک کو دور کرنے کا آرزومند تھا۔ مجھ پر کبھی کوئی کیفیت طاری ہوتی اور کبھی کوئی۔ آخر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ وہ تمام بندشیں ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوگئیں جو میرے

خاندان اور تربیت نے میرے ذہن پر لگا رکھی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں تمام روایتی رشتوں اور پابندیوں سے آزاد ہو گیا ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنی منزل کا تعین خود کروں گا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب میں نے "آزاد" کا قلمی نام اختیار کر لیا جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ اب میں روایتی اور موروثی عقائد کے بندھنوں سے آزاد ہو گیا ہوں۔ میں ان تبدیلیوں کا تفصیلی ذکر اپنی سوانح عمری کی پہلی جلد میں کروں گا۔

میرے سیاسی خیالات میں تبدیلیاں بھی اسی زمانے میں رونما ہوئیں۔ اس وقت لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ ان کے تحکمانہ انداز اور انتظامی اقدامات کی وجہ سے ہندوستان کی سیاسی بے چینی میں ایک نئی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے بنگال کو خاص طور پر اپنی توجہ کا سزاوار سمجھا اور سب سے زیادہ شورش بھی اسی صوبے میں ہوئی۔ سیاسی اعتبار سے یہ ہندوستان کا سب سے ترقی یافتہ حصہ تھا اور بنگال کے ہندوؤں نے ہندوستان کی سیاسی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ۱۹۰۵ میں لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ہندو کمزور پڑ جائیں گے اور بنگال کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک مستقل خلیج انہیں ایک دوسرے سے الگ رکھے گی۔

بنگال نے اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا۔ اس فیصلے کے خلاف اس قدر سیاسی اور انقلابی جوش پیدا ہوا جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ شری آر بندو گھوش بڑودہ سے کلکتے آ گئے تا کہ اس شہر کو اپنی سرگرمیوں کا محور بنا سکیں۔ ان کا اخبار "کرمایوگن" قومی بیداری اور بغاوت کی علامت بن گیا۔

اسی زمانے میں شری شیام سندر چکروتی سے میرا تعارف ہو گیا جو اُن دنوں اہم انقلابی کارکن تھے۔ ان کی وساطت سے میری دوسرے انقلابیوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ مجھے یاد ہے شری آر بندو گھوش کے ساتھ بھی میری دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دل میں انقلابی سیاست کے لیے کشش پیدا ہو گئی اور میں ان کے ایک گروپ میں شامل ہو گیا۔

ان دنوں انقلابی جماعتیں اپنے کارکن صرف متوسط طبقے کے ہندوؤں سے چنا کرتی تھیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تمام انقلابی گروپ مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ برطانوی حکومت نے مسلمانوں کو ہندوستان کی سیاسی تحریک کے خلاف آلہ کار بنا رکھا ہے اور مسلمان اس کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مشرقی بنگال ایک علیحدہ صوبہ بن چکا تھا اور بیم فیلڈ فلر، جو اُس وقت لیفٹیننٹ گورنر تھا، علانیہ یہ کہتا تھا کہ حکومت مسلمانوں کو اس نظر سے دیکھتی ہے جیسے کوئی شوہر اپنی پسندیدہ بیوی کو۔ انقلابی یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان حصول آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور انہیں دوسری رکاوٹوں کی طرح راستے سے ہٹا دینا چاہیے۔

مسلمانوں سے انقلابیوں کی نفرت کا ایک اور سبب بھی تھا۔ انگریز حکومت یہ محسوس کرتی تھی کہ بنگال کے

ہندو سیاسی اعتبار سے اس قدر بیدار ہیں کہ انقلابیوں سے نمٹنے کے سلسلے میں کسی ہندو افسر پر مکمل اعتماد نہیں کیا جا سکتا چنانچہ حکومت نے یو پی کے کئی مسلمان افسروں کو بلا کر انہیں پولیس کی انٹیلی جنس برانچ میں تعینات کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال کے ہندوؤں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ مسلمان ہندوستان کی سیاسی آزادی اور ہندوؤں کے خلاف ہیں۔

شیام سندر چکروتی نے جب دوسرے انقلابیوں سے میرا تعارف کرایا اور میرے نئے دوستوں نے دیکھا کہ میں ان کے ساتھ شامل ہونے کو تیار ہوں تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ شروع میں وہ مجھ پر بھروسا نہ کرتے اور مجھے اپنی مخصوص محفلوں سے الگ رکھنے کی کوشش کرتے لیکن رفتہ رفتہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور مجھے ان کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ میں نے ان کے سامنے یہ استدلال پیش کیا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے ان کے دشمن ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ بنگال کے چند مسلمان افسروں کی وجہ سے تمام مسلمانوں پر الزام تراشی نامناسب ہے۔ مصر، ایران اور ترکی کے مسلمان جمہوریت اور آزادی کے لیے انقلابی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور اگر ہم مسلمانوں میں کام کریں اور انہیں اپنا دوست بنانے کی کوشش کریں تو ہندوستان کے مسلمان بھی سیاسی جدو جہد میں شامل ہو جائیں گے۔ میں نے اس جانب بھی اشارہ کیا کہ مسلمانوں کی طرف سے سرگرم مخالفت یا سیاسی تحریک سے بے تعلق رہنے کی صورت میں سیاسی آزادی کی تحریک مشکلات سے دوچار ہو جائے گی اس لیے ہمیں مسلمانوں کی حمایت اور دوستی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

پہلے تو میں اپنے انقلابی دوستوں کو یہ قائل نہ کر سکا کہ میری تشخیص درست ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں سے بعض میرے ہم خیال ہو گئے۔ اسی دوران میں نے مسلمانوں میں کام شروع کر دیا اور میں نے دیکھا کہ نوجوانوں کی ایک جماعت نئی سیاسی ذمے داریاں سنبھالنے کو تیار ہے۔

جب میں پہلی مرتبہ انقلابیوں میں شامل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ان کی سرگرمیاں بنگال اور بہار تک محدود ہیں۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ بہار اس وقت صوبہ بنگال کا حصہ تھا۔ میں نے اپنے دوستوں کو اس جانب متوجہ کیا کہ ہمیں ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اپنی سرگرمیاں شروع کرنی چاہئیں۔ پہلے انہیں تامل ہوا اور انہوں نے کہا کہ ان کی سرگرمیوں کا تقاضا ہے کہ انہیں خفیہ رکھا جائے۔ اپنے دائرہ کار اور تعلقات کو وسیع کرنا خطرے سے خالی نہیں اور اگر دوسرے صوبوں میں شاخیں کھولی گئیں تو راز داری برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا جو کامیابی کے لیے بے حد ضروری ہے تاہم میں نے انہیں اس پر آمادہ کر لیا اور انقلابی جماعت میں میری شمولیت کے دو برسوں کے اندر شمالی ہندوستان کے کئی اہم شہروں اور بمبئی میں انقلابیوں کی خفیہ انجمنیں بن گئیں۔ یہ انجمنیں کیسے قائم ہوئیں اور نئے کارکن کیسے بھرتی کیے گئے، میں اس کے بارے میں

بہت سے دلچسپ اور مضحکہ خیز قصے سنا سکتا ہوں۔ یہ تفصیلات میری سوانح عمری کی پہلی جلد میں بیان کی جائیں گی اور قارئین کو اس کا انتظار کرنا پڑے گا۔

اسی زمانے میں مجھے ہندوستان سے باہر جانے اور عراق، مصر، شام اور ترکی کے سفر کرنے کا موقع ملا۔ میں نے ان تمام ملکوں میں لوگوں کی فرانسیسی زبان میں دلچسپی کا مشاہدہ کیا۔ مجھ میں بھی یہ ذوق پیدا ہوا اور میں نے فرانسیسی سیکھنا شروع کر دی البتہ میں نے دیکھا کہ انگریزی تیزی کے ساتھ بین الاقوامی زبان بنتی جارہی ہے اور یہ زبان میری بیشتر ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

یہاں میں ایک غلط فہمی کو دور کر دوں جس کا آنجہانی مہادیو ڈیسائی کی وجہ سے بہت چرچا ہوا۔ جب وہ میری سوانح عمری لکھ رہے تھے تو انہوں نے کئی سوالات قلمبند کیے اور مجھ سے ان کے جواب لکھنے کو کہا۔ ایک سوال کے جواب میں مَیں نے لکھا کہ جب میری عمر بیس سال تھی تو میں نے مشرق وسطیٰ کے ملکوں کا دورہ کیا اور ایک عرصے تک مصر میں رہا۔ ایک اور سوال کے جواب میں مَیں نے کہا تھا کہ روایتی طریقہ تعلیم نہ صرف ہندوستان میں ناقابل اطمینان اور بے سود ہے بلکہ قاہرہ کی مشہور یونیورسٹی الازہر میں بھی اس کی حالت کچھ بہتر نہیں ہے۔ اس سے مہادیو ڈیسائی نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ میں جامعہ الازہر میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مصر گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں ایک دن بھی طالب علم کی حیثیت سے وہاں نہیں رہا۔ شاید ان کی غلطی کی وجہ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر کسی شخص نے کچھ علم حاصل کیا ہے تو اس نے ضرور کسی یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہوگی۔ جب مہادیو ڈیسائی کو معلوم ہوا کہ میں ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں نہیں پڑھا تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ میں نے جامعہ الازہر سے سند حاصل کی ہوگی۔

۱۹۰۸ میں جب میں قاہرہ گیا تو جامعہ الازہر کا نظام تعلیم اس قدر ناقص تھا کہ اس سے نہ تو ذہن کی کوئی تربیت ہوتی اور نہ ہی قدیم اسلامی سائنس اور فلسفے پر عبور حاصل ہوتا۔ شیخ محمد عبدہٗ نے اس نظام میں اصلاح کرنا چاہی تھی لیکن بوڑھے قدامت پسند علما نے ان کی تمام تدبیروں کو ناکام بنا دیا۔ جب انہیں الازہر کی اصلاح کی کوئی امید نہ رہی تو انہوں نے قاہرہ میں دارالعلوم کے نام سے نیا کالج قائم کر لیا جو اَب تک موجود ہے۔ جب الازہر کی یہ حالت تھی تو میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے وہاں کیوں جاتا؟

مصر سے میں ترکی اور فرانس گیا۔ میں لندن بھی جانا چاہتا تھا لیکن وہاں مجھے اپنے والد کی علالت کی خبر مل گئی اس لیے میں لندن نہ جا سکا اور پیرس سے واپس ہندوستان آ گیا۔ لندن جانے کی نوبت کئی سال بعد تک نہ آئی۔

میں پہلے ہی یہ کہہ چکا ہوں کہ میں ۱۹۰۸ میں کلکتہ چھوڑنے سے پہلے ہی سیاسی نظریات کے حوالے سے انقلابی سرگرمیوں کی طرف مائل ہو چکا تھا۔ جب میں عراق گیا تو وہاں ایران کے بعض انقلابیوں سے میری

ملاقات ہوگئی۔ مصر میں مصطفیٰ کمال پاشا کے پیروؤں سے میرا رابطہ ہو گیا۔ میں ینگ ٹرکس کے ایک گروپ سے بھی ملا جس نے قاہرہ میں اپنا مرکز قائم کر رکھا تھا اور وہاں سے ایک ہفتہ وار اخبار شائع کرتا تھا۔ میں ترکی گیا تو ینگ ٹرکس تحریک کے چند لیڈروں سے میری دوستی ہوگئی۔ ہندوستان واپس آنے کے کئی سال بعد تک ان کے ساتھ میری خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

عرب اور ترک انقلابیوں کے ساتھ میرے روابط کی بدولت میرے سیاسی عقائد پختہ ہو گئے۔ ان انقلابیوں کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ ہندوستانی مسلمان قومی مطالبوں سے بے اعتنائی برتتے ہیں یا ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کی رائے تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو آزادی کی قومی تحریک کی قیادت کرنی چاہیے تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے پٹھو کیوں ہیں؟ اب میرا عقیدہ اور پختہ ہو گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی سیاسی آزادی کی مہم میں شرکت اور معاونت کرنی چاہیے اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں کہ برطانوی حکومت انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکے۔ میں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں نئی تحریک پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کی اور یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان واپس جا کر میں زیادہ انہماک اور جذبے کے ساتھ سیاسی جدو جہد کروں گا۔

وطن واپسی کے بعد میں کچھ عرصے کے لیے مستقبل کے لائحہ عمل پر غور کرتا رہا۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہمیں رائے عامہ ہموار کرنی چاہیے اور اس کے لیے ایک جریدے کا اجرا ضروری ہے۔ اس وقت پنجاب اور یو پی سے اردو میں کئی روزنامہ، ہفتہ وار اور ماہانہ رسالے شائع ہوتے تھے لیکن ان کا معیار کچھ بلند نہیں تھا۔ وہ دیدہ زیب نہیں ہوتے تھے اور مواد کی طرح ان کی چھپائی بھی نہایت ناقص ہوتی تھی۔ یہ اخبار اور رسالے لیتھو میں چھپتے تھے اس لیے ان میں جدید صحافت کی کوئی خوبی اور خصوصیت نظر نہیں آتی تھی۔ ان میں ہاف ٹون تصویریں بھی نہیں چھپ سکتی تھیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں ایک ایسا جریدہ شائع کروں گا جو نہ صرف طباعت کے اعتبار سے معیاری ہوگا بلکہ اس میں چھپنے والا مواد قارئین کے دل میں اتر جائے گا۔ میں نے یہ بھی طے کیا کہ اس کا مواد ٹائپ کیا جائے گا اور اس کی اشاعت کے لیے لیتھوگرافک پراسیس اختیار کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے میں نے الہلال پریس قائم کیا اور جون ۱۹۱۲ میں الہلال کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔

الہلال کی اشاعت سے اردو صحافت کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ اس اخبار کو مختصر مدت میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ نہ صرف اس کی اعلیٰ پرنٹنگ اور پروڈکشن بلکہ قومیت کے شدید جذبے کی تشہیر کی بنا پر عوام اس کی طرف راغب ہو گئے۔ غرض الہلال نے لوگوں میں ایک انقلابی تحریک پیدا کر دی۔ الہلال کی مانگ اس قدر بڑھ گئی کہ ابتدائی تین مہینوں کے اندر تمام پرانے شماروں کو دوبارہ شائع کرنا پڑا کیونکہ ہر نیا خریدار یہ چاہتا تھا کہ اس کا مکمل سیٹ اس کے پاس ہو۔

اس وقت مسلمانوں کی سیاسی قیادت علی گڑھ پارٹی کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے ارکان اپنے آپ کو سرسید احمد کی پالیسیوں کا امین سمجھتے تھے۔ ان کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو تاج برطانیہ کا وفادار اور تحریک آزادی سے الگ اور بے تعلق رہنا چاہیے۔

جب الہلال نے ایک مختلف نعرہ لگایا اور اس کی مقبولیت اور اشاعت تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی قیادت خطرے میں پڑ گئی ہے اس لیے انہوں نے الہلال کی مخالفت شروع کر دی اور اس مخالفت میں یہاں تک شدت برتی کہ اس کے ایڈیٹر کو قتل کرنے کی دھمکیاں دینے لگے۔ پرانی قیادت نے الہلال کی جتنی مخالفت کی، اسی قدر اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ دو برسوں کے اندر الہلال کی اشاعت ۲۶,۰۰۰ فی ہفتہ ہوگئی۔ اردو صحافت کی تاریخ میں اتنی اشاعت کا امکان اور وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

الہلال کی کامیابی کو دیکھ کر حکومت بھی پریشان ہوگئی اور اس نے پریس ایکٹ کے تحت دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس کارروائی کے نتیجے میں الہلال کا تند و تیز لہجہ نرم ہو جائے گا لیکن حکومت کی اس انتقامی کارروائی سے میرے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی۔ جلد ہی حکومت نے یہ ضمانت ضبط کر کے دس ہزار روپے کی مزید ضمانت کا مطالبہ کر دیا اور ضمانت کی یہ رقم بھی ضبط کر لی گئی۔ اسی دوران ۱۹۱۴ میں جنگ شروع ہوگئی اور ۱۹۱۵ میں الہلال پریس ضبط کر لیا گیا۔ پانچ ماہ بعد میں نے البلاغ کے نام سے نیا پریس قائم کر کے اسی نام سے جریدے کا آغاز کر دیا۔ حکومت کو اب یہ احساس ہو گیا کہ وہ صرف پریس ایکٹ کو استعمال کر کے میری سرگرمیوں کو بند نہیں کر سکتی چنانچہ اس نے نئے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز کو استعمال کر کے اپریل ۱۹۱۶ میں مجھے کلکتہ چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ پنجاب، دہلی، یو پی اور بمبئی کی حکومتوں نے انہی ریگولیشنز کے تحت پہلے ہی میرے ان صوبوں میں داخلے پر پابندی لگا دی تھی۔ اب میں صرف بہار جا سکتا تھا اس لیے میں رانچی چلا گیا۔ چھ ماہ بعد مجھے رانچی میں نظر بند کر دیا گیا اور میں ۱۳ دسمبر ۱۹۱۹ تک وہاں قید رہا۔ یکم جنوری ۱۹۲۰ کو مجھے دوسرے نظر بندوں اور قیدیوں کے ساتھ شاہ انگلستان کے اعلان کے تحت رہا کر دیا گیا۔

اس وقت تک گاندھی جی ہندوستان کے سیاسی منظر پر نمودار ہو چکے تھے۔ جب میں رانچی میں نظر بند تھا تو وہ چمپارن کے کسانوں کے لیے کام کر رہے تھے اور اس سلسلے میں رانچی آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن بہار کی حکومت نے انہیں مطلوبہ اجازت نہ دی۔ اس طرح رہائی کے بعد جنوری ۱۹۲۰ میں دہلی میں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ اس وقت ایک تجویز زیر غور تھی کہ خلافت اور ترکی کے مستقبل کے بارے میں ہندوستانی مسلمانوں کے جو احساسات تھے، وائسرائے کو ان سے مطلع کرنے کے لیے ایک وفد بھیجا جائے۔ گاندھی جی ان بحثوں میں شریک ہوئے اور انہوں نے اس تجویز سے مکمل ہمدردی اور

دلچسپی ظاہر کی۔ انہوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ اس مسئلے میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے کو تیار ہیں۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۰ کو دہلی میں ایک جلسہ ہوا۔ گاندھی جی کے علاوہ لوکمانیہ تلک اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے بھی خلافت کے سوال پر ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کی حمایت کی۔

وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ میں نے عرضداشت پر دستخط کیے لیکن وفد میں شامل نہ ہوا کیونکہ میرا نقطہ نظر یہ تھا کہ اب یہ معاملہ عرضداشتوں اور وفدوں سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ وائسرائے نے اپنے جواب میں کہا کہ اگر برطانوی حکومت کے سامنے مسلمانوں کا نقطہ نظر پیش کرنے کے لیے کوئی وفد لندن جائے تو وہ اس کے لیے ضروری سہولتیں فراہم کریں گے۔ انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کارروائی کرنے سے معذوری ظاہر کی۔

اب سوال پیدا ہوا کہ اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟ ایک اجلاس ہوا جس میں مسٹر محمد علی، مسٹر شوکت علی، حکیم اجمل خان اور فرنگی محل لکھنؤ کے مولوی عبدالباری بھی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر گاندھی جی نے اپنا عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ اب وفدوں اور عرضداشتوں کا زمانہ گزر چکا ہے، ہمیں حکومت کی حمایت سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ ہم صرف اسی طریقے سے حکومت کو معاملات طے کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ تمام سرکاری خطابات واپس کر دیے جائیں، عدالتوں اور تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے، ہندوستانی سرکاری ملازمتوں سے استعفا دے دیں اور نئی قانون ساز اسمبلیوں کی کارروائی میں کوئی حصہ نہ لیں۔

جیسے ہی گاندھی جی نے اپنی تجویز پیش کی، مجھے یاد آیا کہ یہ وہی پروگرام ہے جس کا خاکہ ٹالسٹائی نے کئی سال پہلے پیش کیا تھا۔ ۱۹۰۱ میں انارکسٹوں نے اٹلی کے بادشاہ پر حملہ کیا تھا اور اس موقعے پر ٹالسٹائی نے انارکسٹوں کے نام ایک کھلے خط میں کہا تھا کہ تشدد کا طریقہ اخلاقی طور پر غلط اور سیاسی نقطہ نظر سے بے سود ہے۔ اگر ایک شخص کو قتل کر دیا جاتا ہے تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لے لے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ تشدد کا نتیجہ ہمیشہ بڑے تشدد کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ یونانیوں کی ایک کہاوت ہے کہ ہر مارے جانے والے جنگجو کے خون کے چھینٹوں سے ۹۹۹ جنگجو پیدا ہوتے ہیں۔ سیاسی قتل کا مطلب اپنے دشمنوں کی تعداد بڑھانا ہے۔ ٹالسٹائی نے مشورہ دیا کہ کسی جابر حکومت کو مفلوج کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کیا جائے، تمام ملازمتوں سے استعفا دے دیا جائے اور حکومت کے تمام معاون اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ اس قسم کا پروگرام کسی بھی حکومت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے گا۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ خود میں نے بھی الہلال کے بعض مضامین میں ایسا ہی پروگرام تجویز کیا تھا۔

ہر شخص نے اپنے پس منظر کے مطابق ردعمل ظاہر کیا۔ حکیم اجمل خان نے کہا کہ انہیں اس پروگرام پر غور کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ وہ اس وقت تک دوسروں کو مشورہ دینا پسند نہیں کرتے تھے جب تک کہ وہ خود اس پروگرام پر عمل کرنے کو تیار نہ ہوں۔ مولوی عبدالباری نے کہا کہ گاندھی جی کی تجویزوں میں بنیادی اہمیت کے سوال اٹھائے گئے ہیں اور جب تک وہ مراقبہ نہ کرلیں اور انہیں خدا کی طرف سے کوئی اشارہ نہ ملے، اس وقت تک وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ محمد علی اور شوکت علی نے کہا کہ وہ مولوی عبدالباری کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد گاندھی جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میں نے ایک لمحہ تامل کیے بغیر کہا کہ میں اس پروگرام کو مکمل طور پر تسلیم کرتا ہوں۔ اگر لوگ واقعی ترکی کی امداد کرنا چاہتے ہیں تو گاندھی جی کے پیش کیے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ایک ہفتے بعد میرٹھ میں ایک خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہی کانفرنس تھی جس میں گاندھی جی نے پہلی بار ایک پبلک پلیٹ فارم سے عدم تعاون کے پروگرام پر عمل کرنے کی تلقین کی۔ ان کے بعد میں نے تقریر کی جس میں مَیں نے ان کی غیر مشروط تائید کی۔

ستمبر ۱۹۲۰ میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس کلکتے میں منعقد ہوا جس میں گاندھی جی کے عملی پروگرام پر غور کیا گیا۔ گاندھی جی نے کہا کہ سوراج کو حاصل کرنے اور خلافت کے مسئلے کو اطمینان بخش طریقے سے حل کرنے کے لیے عدم تعاون کا پروگرام ضروری ہے۔ اس اجلاس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی اور اس میں شرکت کرنے والی ممتاز شخصیات میں مسٹر سی آر داس بھی شامل تھے۔ ان دونوں میں سے کسی نے گاندھی جی سے اتفاق نہ کیا۔ بپن چندر پال نے پرزور تقریر کی اور کہا کہ برطانوی حکومت کے ساتھ لڑنے کے لیے سب سے بہترین ہتھیار یہ ہے کہ برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ انہیں گاندھی جی کے پروگرام کے دوسرے حصوں پر یقین نہیں تھا۔ ان لوگوں کی مخالفت کے باوجود عدم تعاون تحریک کی قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی گئی۔

اس کے بعد ملک کو عدم تعاون پروگرام کے لیے تیار کرنے کی غرض سے کئی مقامات کے دورے کیے گئے۔ گاندھی جی نے ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ میں بیشتر وقت ان کے ساتھ رہا۔ محمد علی اور شوکت علی بھی اکثر ہمارے ہم سفر ہوتے تھے۔ دسمبر ۱۹۲۰ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا۔ اس عرصے میں ملک کا مزاج بدل چکا تھا، مسٹر سی آر داس اب عدم تعاون پروگرام کی علانیہ حمایت کرنے لگے تھے۔ لالہ لاجپت رائے نے شروع میں قدرے مخالفت کی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ پنجاب کے مندوبین گاندھی جی کی تائید کر رہے ہیں تو وہ بھی ہماری صفوں میں شامل ہو گئے۔ اسی اجلاس میں مسٹر جناح کانگریس سے قطعی طور پر الگ ہو گئے۔

حکومت نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے ملک بھر میں لیڈروں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بنگال میں سب سے پہلے مسٹر سی آر داس اور مجھے گرفتار کیا گیا۔ سبھاش چندر بوس اور برندرا ناتھ سسمل بھی جیل میں آ کر ہم سے مل گئے۔ ہم سب کو علی پور سنٹرل جیل کے یورپی وارڈ میں رکھا گیا جو بعد میں سیاسی بحث مباحثوں کا مرکز بن گیا۔

مسٹر سی آر داس کو چھ ماہ قید کی سزا ملی۔ میرا مقدمہ بہت دنوں تک چلتا رہا اور آخر مجھے ایک سال کی سزا دے دی گئی لیکن مجھے یکم جنوری ۱۹۲۳ تک رہا نہ کیا گیا۔ مسٹر سی آر داس کو پہلے رہا کر دیا گیا اور انہوں نے کانگریس کے گیا اجلاس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں کانگریس کے لیڈروں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ مسٹر سی آر داس، موتی لعل نہرو اور حکیم اجمل خان نے سوراج پارٹی بنالی اور کونسلوں میں داخلے کا پروگرام پیش کیا۔ گاندھی جی کے کٹر پیروکاروں نے اس پروگرام کی مخالفت کی اور اس طرح کانگریس دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ ایک دھڑا تبدیلی اور دوسرا حالات کو جوں کا توں رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے دونوں گروپوں میں مفاہمت کی کوشش کی اور ستمبر ۱۹۲۳ میں کانگریس کے خصوصی اجلاس میں فریقین کے درمیان ایک معاہدہ ہو گیا۔ میری عمر اس وقت ۳۵ سال تھی اور مجھ سے اس اجلاس کی صدارت کرنے کے لیے کہا گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ میں کانگریس کا صدر منتخب ہونے والا سب سے کم عمر شخص ہوں۔

۱۹۲۳ کے بعد کانگریس کی سرگرمیاں عام طور پر سوراج پارٹی کے ہاتھ میں رہیں۔ اسے تقریباً تمام قانون ساز اسمبلیوں میں اکثریت حاصل ہوگئی اور وہ پارلیمانی محاذ پر برسر پیکار رہی۔ وہ ارکان کانگریس، جو سوراج پارٹی سے الگ رہے، انہوں نے اپنا تعمیری پروگرام جاری رکھا لیکن وہ سوراج پارٹی کے مقابلے میں عوامی تائید وحمایت حاصل نہ کر سکے۔ اس زمانے میں کئی ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر گہرا اثر پڑا لیکن اس کتاب کے قارئین سے میری درخواست ہے کہ وہ مفصل حالات کے لیے میری سوانح عمری کی پہلی جلد کی اشاعت تک انتظار کریں۔

۱۹۲۸ میں سائمن کمیشن کے تقرر اور اس کے ہندوستان کے دورے سے سیاسی ہیجان اور جوش وخروش بڑھ گیا۔ ۱۹۲۹ میں کانگریس نے کامل آزادی کی قرارداد منظور کر لی اور برطانوی حکومت کو مطلع کر دیا کہ اگر ایک سال کے اندر قومی مطالبہ پورا نہ کیا گیا تو حکومت کے خلاف عوامی تحریک شروع کر دی جائے گی۔ انگریزوں نے ہمارے مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا چنانچہ ۱۹۳۰ میں کانگریس نے نمک سازی کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے کا اعلان کر دیا۔ جب نمک کی ستیہ گرہ شروع ہوئی تو بہت سے لوگوں کو اس کی کامیابی میں شبہ تھا لیکن جب یہ تحریک زور پکڑ گئی تو اس کی اٹھان نے حکومت اور عوام دونوں کو حیرت میں ڈال دیا۔

حکومت نے سخت کارروائی کی اور کانگریس کو غیر قانونی تنظیم قرار دے کر کانگریس کے صدر اور اس کی ورکنگ کمیٹی کے ارکان کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ ہم نے ہر صدر کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا اختیار دے کر اس چیلنج کا مقابلہ کیا۔ مجھے بھی صدر منتخب کیا گیا اور میں نے اپنی ورکنگ کمیٹی کے ارکان نامزد کر دیے۔ میں نے اپنی گرفتاری سے پہلے ڈاکٹر انصاری کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ شروع میں وہ تحریک میں حصہ لینے پر آمادہ نہ ہوئے لیکن میں نے انہیں راضی کر لیا۔ اس طرح ہم حکومت کو مات دے کر تحریک کو جاری رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔

مجھے ایک تقریر کی بنا پر حراست میں لیا گیا جو میں نے میرٹھ میں کی تھی۔ چنانچہ مجھے تقریباً ڈیڑھ سال تک میرٹھ کی جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔

ایک سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہنے والی تحریک کے بعد لارڈ اردن نے گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ارکان کو رہا کر دیا۔ ہمارا پہلا اجلاس الٰہ آباد میں اور پھر دہلی میں ہوا اور اس کے بعد گاندھی اردن پیکٹ پر دستخط ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام کانگریسی رہا کر دیے گئے اور کانگریس گول میز کانفرنس میں شریک ہو گئی۔ ہم نے گاندھی جی کو اپنا واحد نمائندہ بنا کر بھیجا لیکن مذاکرات بے سود رہے اور گاندھی جی خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ لندن سے واپسی پر گاندھی جی کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور حکومت نے ظلم اور جبر کی پالیسی پر پھر عمل شروع کر دیا۔ لارڈ ولنگڈن نئے وائسرائے مقرر ہوئے اور انہوں نے تمام کانگریسیوں کے خلاف سخت کارروائی کی۔ میں دہلی میں تھا اور مجھے ایک سال سے زیادہ عرصے تک دہلی جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس دوران ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے لیکن ان کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے بھی قارئین کو میری سوانح عمری کی پہلی جلد کے منظر عام پر آنے تک انتظار کرنا پڑے گا۔

۱۹۳۵ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور ہو گیا جس کی رو سے صوبوں کو خود مختاری دی گئی اور مرکز میں ایک وفاقی حکومت کے قیام پر اتفاق کیا گیا۔ یہاں سے واقعات کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جسے میں اس کتاب میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

کانگریس برسر اقتدار

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ کے تحت ہونے والے پہلے انتخابات میں کانگریس کو نمایاں فتح حاصل ہوئی۔ اسے پانچ بڑے صوبوں میں کامل اکثریت ملی اور چار صوبوں میں وہ سب سے بڑی واحد پارٹی تھی البتہ پنجاب اور سندھ میں کانگریس کو نسبتاً زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

کانگریس کی اس فتح کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شروع میں کانگریس الیکشن لڑنے میں تذبذب کا شکار تھی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں صوبوں کو مکمل خودمختاری دینے کی ضمانت دی گئی تھی لیکن اس میں بعض خرابیاں بھی موجود تھیں۔ اس ایکٹ میں گورنروں کو ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے خصوصی اختیارات دے دیے گئے اور ایمرجنسی کی صورت میں گورنر دستور کو معطل کر کے تمام اختیارات خود سنبھال سکتا تھا گویا صوبوں میں جمہوریت کی بقا گورنروں کی صوابدید پر منحصر تھی۔ مرکزی حکومت میں صورت حال اس سے بھی بدتر تھی۔ یہاں دو اتھارٹیوں کے اصول کے تحت حکومت چلانے کی دوبارہ کوشش کی گئی حالانکہ صوبوں میں پہلے ہی یہ اصول ناکام ہو چکا تھا۔ مرکزی حکومت کو ایک کمزور فیڈریشن کی شکل دے دی گئی اور والیان ریاست اور ان مفاد پرست عناصر کا پلہ بہت بھاری کر دیا گیا جن سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ملک کے برطانوی حکمرانوں کا ساتھ دیں گے۔

کانگریس ملک کی کامل آزادی کے لیے لڑ رہی تھی اس لیے اس نے ان انتظامات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس میں حیرت یا تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس طرح کانگریس نے مرکزی حکومت کے تجویز کردہ وفاق کی مذمت کی۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی بھی صوبائی خودمختاری کو تسلیم کرنے کی مسلسل مخالفت کر رہی تھی یہاں تک کہ کانگریس کا ایک طاقتور دھڑا الیکشن میں حصہ لینے کے خلاف تھا۔ لیکن میری رائے یہ تھی کہ انتخابات کا بائیکاٹ کرنا غلط ہوگا کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ اگر کانگریس نے الیکشن کا بائیکاٹ کیا تو ناپسندیدہ عناصر مرکزی اور صوبائی قانون ساز اداروں پر قبضہ کر لیں گے اور ہندوستانی عوام کی ترجمانی کا منصب ان کے ہاتھ میں آ جائے گا۔ اس کے علاوہ میرا خیال تھا کہ انتخابات عوام کو ہندوستانی سیاست کے بنیادی اصولوں سے روشناس کرانے کا بہترین موقع فراہم کریں گے۔ آخرکار وہ نقطہ نظر، جس کی میں ترجمانی کر رہا تھا، غالب رہا۔ چنانچہ کانگریس نے انتخابات میں حصہ لیا اور وہی نتائج برآمد ہوئے جن کی جانب میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔

اب کانگریسی قیادت میں نئے اختلافات پیدا ہو گئے۔ الیکشن میں حصہ لینے والوں کے ایک طبقے نے کانگریس کے نمائندوں کی طرف سے اقتدار سنبھالنے کی مخالفت شروع کر دی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ گورنروں کو خصوصی اختیارات دینے کے بعد صوبائی خودمختاری محض ایک فریب ہے اور کانگریس کے وزرا جب تک گورنر کو منظور ہوگا، اپنے عہدوں پر برقرار رہ سکیں گے۔ اگر کانگریس اپنے انتخابی وعدوں کو پورا کرنا چاہتی تو گورنر سے تصادم ناگزیر تھا۔ ان کا استدلال تھا کہ ان حالات میں کانگریس کو قانون ساز اسمبلی کے اندر دستور کو غارت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم میں سے بعض لوگوں کی رائے اس کے برعکس تھی اور ہمارا خیال تھا کہ صوبائی حکومتوں کو جو اختیارات دیے گئے ہیں، ان کا پورا پورا استعمال کرنا چاہیے۔ اگر گورنر کے ساتھ محاذ آرائی ہوتی ہے تو اس کا موقع محل کی مناسبت سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ اختیارات کو استعمال کیے بغیر کانگریس کے پروگرام پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔ اگر کانگریسی وزارتوں کو کسی عوامی مسئلے پر استعفا دینا پڑا تو اس سے عوام کے ذہنوں پر کانگریس کا تسلط اور بڑھ جائے گا۔

یہ بحث چل رہی تھی کہ تمام صوبوں میں عبوری حکومتیں تشکیل دے دی گئیں۔ یہ حکومتیں ان لوگوں نے بنائیں جو کانگریس میں شامل نہیں تھے بلکہ بعض صورتوں میں وہ کانگریس کے مخالف تھے۔ کانگریس کی طرف سے وزارتیں قبول کرنے کے سوال پر تذبذب کے باعث نہ صرف یہ عندیہ ملا کہ اس معاملے میں اس کی صفوں میں اختلاف رائے موجود ہے بلکہ اس سے بھی بری بات یہ ہوئی کہ اس سے رجعت پسندوں کو اپنی شکست کے بعد سنبھل جانے، نقصان کی تلافی کرنے اور اپنے قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ وائسرائے کے ساتھ طویل مذاکرات کے دوران یہ یقین دہانی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی کہ گورنر وزارتوں کے کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔

☆ ان مذاکرات کے نتیجے میں کانگریس نے بالآخر وزارتیں قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کانگریس نے پہلے ان صوبوں میں وزارتیں بنا لیں جہاں اسے پارلیمانی اکثریت حاصل تھی۔ اس کے بعد اس نے ان صوبوں میں وزارتیں تشکیل دیں جن میں وہ واحد بڑی جماعت تھی۔ آخر میں کانگریس نے ان صوبوں میں حکومتیں بنا لیں جہاں وہ سب سے بڑی پارٹی بن سکتی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ کانگریس انتظامی ذمے داریاں سنبھال رہی تھی اس لیے کانگریس کے لیے یہ ایک بہت بڑی آزمائش تھی اور عوام یہ دیکھ رہے تھے کہ وہ اپنا قومی کردار کس طرح نبھاتی ہے؟ کانگریس کے خلاف مسلم لیگ کا سب سے بڑا پروپیگنڈا یہ تھا کہ وہ محض برائے نام قومی جماعت ہے۔ مسلم لیگ اس پروپیگنڈے کی آڑ میں نہ صرف کانگریس کو بدنام کر رہی تھی بلکہ اس نے یہ الزام بھی لگایا کہ کانگریس کی وزارتیں اقلیتوں پر

مظالم ڈھا رہی ہیں۔ مسلم لیگ نے ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے اپنی رپورٹ میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ کانگریسی وزارتوں کے غیر منصفانہ سلوک کے بارے میں ہر قسم کے الزامات لگائے۔ میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ الزامات بالکل بے بنیاد اور لغو تھے۔ وائسرائے اور کئی صوبوں کے گورنروں کی بھی یہی رائے تھی چنانچہ باشعور اور سمجھدار لوگوں نے لیگ کی رپورٹ پر عدم اطمینان کا اظہار کر دیا۔

مسلم لیگ نے مختلف مظالم کے بارے میں جن قصے کہانیوں کی تشہیر کی، وہ بالکل من گھڑت تھیں لیکن اس وقت دو ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے صوبائی کانگریس کمیٹیوں کے رویے کے بارے میں برا تاثر پیدا ہو گیا۔ میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرتا ہوں کہ بہار اور بمبئی کے دونوں صوبوں میں کانگریس قوم پرستی کے دعووں میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ کانگریس ایک قومی تنظیم کے طور پر ابھری تھی اور اس نے مختلف طبقوں کے لوگوں کو قیادت کا موقع فراہم کیا تھا۔ بمبئی میں مسٹر نریمان مقامی کانگریس کے مسلمہ رہنما تھے اور جب صوبائی حکومت کی تشکیل کا معاملہ سامنے آیا تو عام طور پر یہ توقع کی جا رہی تھی کہ مسٹر نریمان کی حیثیت اور سابق ریکارڈ کے پیش نظر انہیں حکومت کی قیادت کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ صوبے کا وزیر اعلیٰ ایک پارسی ہو گا جبکہ کانگریس اسمبلی پارٹی میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ سردار پٹیل اور ان کے ساتھیوں نے اس صورت حال کو تسلیم نہ کیا اور انہوں نے محسوس کیا کہ کانگریس کے ہندو حامیوں کو وزارتِ اعلیٰ کے منصب سے محروم کرنا ناانصافی ہو گی چنانچہ مسٹر بی جی کھیر کو آگے لا کر انہیں بمبئی کی کانگریس پارٹی اسمبلی کا لیڈر منتخب کر لیا گیا۔

☆ مسٹر نریمان فطری طور پر اس فیصلے سے بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے اس مسئلے کو کانگریس کی ورکنگ پارٹی میں پیش کر دیا۔ جواہر لعل نہرو اس وقت پارٹی کے صدر تھے اور بہت سے لوگوں کو یہ توقع تھی کہ چونکہ وہ فرقہ وارانہ تعصب سے مکمل طور پر آزاد تھے اس لیے وہ مسٹر نریمان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کی تلافی کر دیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے انہوں نے اصلاح احوال کے لیے کوئی اقدام نہ کیا۔ جواہر لعل جانتے تھے کہ لوگ انہیں سردار پٹیل کا ناقد اور مخالف سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کوئی ایسی کارروائی نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے سردار پٹیل کے دوستوں کو ان پر نکتہ چینی کا موقع مل سکے چنانچہ انہوں نے پٹیل کو خوش کرنے کے لیے نریمان کی اپیل مسترد کر دی۔ ایسا لگتا ہے کہ جواہر لعل یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ اپنے دور صدارت میں سردار پٹیل پر الزام تراشیوں یا بہتان طرازی کی اجازت نہیں دیں گے۔

☆ نریمان کو جواہر لعل کے رویے پر بڑی حیرت ہوئی اور جب ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں جواہر لعل نے ان کے ساتھ تلخ انداز میں گفتگو کی اور ان پر چھینٹے چلائے تو نریمان کو اس پر دکھ ہوا۔ انہوں نے گاندھی جی سے

رابطہ کیا اور کہا کہ وہ اپنا مقدمہ گاندھی جی کے سامنے پیش کریں گے۔ گاندھی جی نے نریمان کی باتیں صبر و تحمل سے سنیں اور یہ ہدایت کی کہ سردار پٹیل کے خلاف الزامات کی ایک غیر جانبدار شخص سے تحقیقات کرائی جائے۔
چونکہ نریمان خود پارسی تھے اس لیے سردار پٹیل اور ان کے دوستوں نے تجویز پیش کی کہ انکوائری کا کام کسی پارسی کے سپرد کیا جائے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے گہرے غور و خوض کے بعد منصوبہ بندی کی اور اپنا مقدمہ اس انداز میں تیار کیا جس سے اصل مسائل پس پردہ چلے گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مختلف حیلے حربے اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور اس طرح بیچارے نریمان انکوائری شروع ہونے سے پہلے ہی مقدمہ ہار گئے۔ آخر یہ قرار دیا گیا کہ سردار پٹیل کے خلاف کوئی الزام ثابت نہیں ہوا۔
جو لوگ اصل قصے کو جانتے تھے وہ اس فیصلے سے مطمئن نہ ہوئے۔ ہم سب کو معلوم تھا کہ سردار پٹیل کے فرقہ وارانہ مطالبات کو تسلیم کرنے کے لیے سچائی کو قربان کر دیا گیا ہے۔ نریمان کا دل ٹوٹ گیا اور ان کی پبلک زندگی ختم ہوگئی۔
☆بہار میں بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ جب انتخابات ہوئے تو ڈاکٹر سید محمود صوبے کے نامور لیڈر تھے۔ وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سیکرٹری بھی تھے اور اس طرح صوبے کے اندر اور باہر ان کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ جب کانگریس کو قطعی اکثریت حاصل ہوئی تو یہ باور کر لیا گیا کہ ڈاکٹر سید محمود کو لیڈر منتخب کر لیا جائے گا اور صوبائی خود مختاری کے تحت وہ بہار کے پہلے وزیر اعلیٰ بن جائیں گے۔ لیکن اس کے برعکس سری کرشنا سنہا اور نارائن سنہا کو، جو مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے، واپس بہار بلا کر وزارت اعلیٰ کے منصب کے لیے ان کی تربیت شروع کر دی گئی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس سلسلے میں وہی کردار ادا کیا جو سردار پٹیل نے بمبئی میں ادا کیا تھا۔ بہار اور بمبئی میں صرف یہ فرق تھا کہ جب سری کرشنا سنہا نے حکومت بنائی تو ڈاکٹر سید محمود کو کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔
ان دو واقعات سے کانگریس کے بارے میں برا تاثر پیدا ہو گیا۔ آج جب میں پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس وقت کانگریس اپنے دعووں اور نصب العین پر پورا نہ اتر سکی۔ مجھے نہایت تاسف کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس وقت کانگریس کی نیشنلزم اس مرحلے پر نہیں پہنچی تھی کہ وہ فرقہ وارانہ امتیازات کو نظر انداز کر کے اکثریت یا اقلیت سے قطع نظر لیڈروں کا انتخاب کرتی۔☆
جب میں یہ سوچتا ہوں کہ مسٹر نریمان اور ڈاکٹر سید محمود کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تو مجھے مسٹر سی آر داس کا خیال آتا ہے جو عدم تعاون کی تحریک سے حد درجہ طاقتور شخصیت بن کر ابھرے تھے۔ مسٹر داس کو ہماری قومی جدوجہد کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کی نظر بہت بلند اور ان کے تخیل میں بڑی وسعت تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ معاملہ فہم تھے اور ہر معاملے میں ان کا نقطہ نظر حقیقت پسندانہ تھا۔ ان میں اپنے نظریات پر

ڈٹے رہنے کا حوصلہ موجود تھا اور اگر وہ کسی معاملے میں یہ سمجھتے کہ ان کا موقف صحیح ہے تو وہ کسی خوف وخطر کے بغیر اپنی بات پر قائم رہتے۔ جب گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی تو مسٹر داس نے شروع میں اس پروگرام کی مخالفت کی۔ ۱۹۲۰ میں کلکتے میں جو خصوصی اجلاس منعقد ہوا تو ان کی مخالفت کی بنا پر تحریک کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔ ایک سال بعد جب ناگپور میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو وہ ہماری صفوں میں شامل ہو گئے اور عدم تعاون کے پروگرام کی منظوری دے دی گئی۔ مسٹر داس کی کلکتہ بار میں شاندار پریکٹس تھی اور ان کا ملک کے کامیاب ترین وکیلوں میں شمار ہوتا تھا۔ انہیں آسائش اور آرام کا جو شوق تھا اس کے لیے بھی وہ مشہور تھے مگر انہوں نے ایک لمحے کے لیے پس وپیش کیے بغیر وکالت کی پریکٹس چھوڑ دی، کھدر کو زیب تن کر لیا اور دل و جان سے کانگریس کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ میں ان سے بہت متاثر تھا اور ہماری قومی بیداری کی تاریخ میں ایک طاقتور ترین شخصیت کی حیثیت سے ان کا حد درجہ احترام کرتا تھا۔

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، مسٹر داس عملی پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے اور سیاسی مسائل کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ پسندیدہ اور قابل عمل پہلو کیا ہے۔ ان کی رائے تھی کہ اگر ہندوستان کو گفت وشنید کے ذریعے آزادی حاصل کرنا ہے تو ہمیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ ہم ایک ایک قدم آگے بڑھائیں۔ ان کا خیال تھا کہ مذاکرات اور سمجھانے کا طریق کار اختیار کیا گیا تو آزادی اچانک گود میں ٹپک نہیں پڑے گی۔ انہوں نے یہ پیش گوئی کی کہ ہمارا پہلا قدم یہ ہوگا کہ ہم صوبائی خودمختاری حاصل کریں گے۔ انہیں یقین تھا کہ محدود اختیارات سے کام لینا بھی ہندوستان کی آزادی کے نصب العین میں معاون ثابت ہوگا اور آزادی کے بعد ہندوستانی عوام بھاری ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار بھی ہوتے جائیں گے۔

مسٹر داس کی دور اندیشی اور فہم وفراست کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی وفات کے تقریباً دس سال بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ کی انہی خطوط پر منظوری دی گئی۔

۱۹۲۱ میں برطانیہ کے اس وقت کے پرنس آف ویلز مونٹیگو چیمز فورڈ اصلاحات کی اسکیم کے افتتاح کے سلسلے میں ہندوستان آئے۔ کانگریس نے یہ فیصلہ کیا کہ شہزادے کے استقبال کے لیے جتنی تقریبات ہوں گی، وہ ان کا بائیکاٹ کرے گی۔ اس سے ہندوستان کی حکومت بڑی مشکل میں پڑ گئی۔ وائسرائے نے برطانوی حکومت کو یقین دلایا تھا کہ ہندوستان میں شہزادے کا پرتپاک خیر مقدم کیا جائے گا۔ جب انہیں کانگریس کے فیصلے کی خبر ہوئی تو انہوں نے بائیکاٹ کو ناکام بنانے کی ہر ممکن تدبیر کی۔ حکومت اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکی اور پرنس آف ویلز جہاں بھی گیا، اس کا سرد مہری کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ کلکتہ، جو اس زمانے میں ہندوستان کا سب سے اہم شہر تھا، شہزادے کے قیام کا آخری مقام تھا۔ دہلی کو دارالسلطنت بنا دیا گیا تھا لیکن

وائسرائے موسم سرما کلکتے میں ہی گزارتا چنانچہ کلکتے کو ملک کے سرمائی دارالحکومت کا درجہ حاصل تھا۔ اس موقعے پر کلکتے میں ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا گیا جس میں پرنس آف ویلز کو وکٹوریہ میموریل ہال کا سنگ بنیاد رکھنا تھا۔ شہزادے کے استقبال کے لیے پرتکلف انتظام کیا گیا اور حکومت نے اس کے کلکتے کے دورے کو کامیاب بنانے کی غرض سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

اس زمانے میں ہم سب علی پور سنٹرل جیل میں نظر بند تھے اور پنڈت مدن موہن مالویہ کانگریس اور حکومت کے درمیان معاہدے کے لیے کوششیں کر رہے تھے۔ انہوں نے وائسرائے سے ملاقات کی اور یہ تاثر لے کر لوٹے کہ اگر ہم نے کلکتے میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ نہ کیا تو حکومت کانگریس کے ساتھ کوئی معاملہ کر لے گی۔ پنڈت مدن مالویہ، مسٹر داس اور میرے ساتھ اس تجویز پر تبادلہ خیال کے لیے علی پور جیل میں آئے۔ اس تجویز کی بنیاد یہ تھی کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا مسئلہ طے کرنے کے لیے ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے۔ ہم نے پنڈت مالویہ کو قطعی جواب نہ دیا کیونکہ ہم اس مسئلے پر آپس میں صلاح مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ مسٹر داس اور میں دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان کی حکومت پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ کی وجہ سے ہمارے ساتھ سمجھوتا کرنے پر مجبور ہوگئی ہے اور ہمیں اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر گول میز کانفرنس کی تجویز منظور کر لینی چاہیے۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس اقدام کے نتیجے میں کامل آزادی تو حاصل نہیں ہوگی لیکن ہم اپنی سیاسی جدوجہد میں بہت آگے بڑھ جائیں گے۔ اس وقت گاندھی جی کے سوا باقی تمام کانگریسی لیڈر جیل میں تھے۔ ہم نے تجویز کیا کہ ہمیں برطانیہ کی پیشکش کو قبول کر لینا چاہیے مگر ہم نے اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے کانگریس کے تمام لیڈروں کو رہا کر دیا جائے۔

دوسرے دن جب پنڈت مالویہ ہم سے دوبارہ ملنے کے لیے آئے تو ہم نے انہیں اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا۔ ہم نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ گاندھی جی سے ملاقات کر کے ان کی رضامندی حاصل کر لیں۔ پنڈت مالویہ نے وائسرائے کو اپنی رپورٹ پیش کر دی اور دو دن کے بعد ہم سے ملاقات کے لیے پھر جیل میں آئے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کی حکومت بات چیت میں حصہ لینے والے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کے لیے تیار ہے۔ ان میں علی برادران اور کانگریس کے کئی دوسرے لیڈر شامل تھے۔ ہم نے ایک بیان تیار کیا جس میں ہمارے خیالات پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیے گئے تھے۔ پنڈت مالویہ یہ دستاویز لے کر گاندھی جی سے ملاقات کرنے بمبئی چلے گئے۔

گاندھی جی نے ہماری تجویز کو منظور نہ کیا جس پر ہمیں حیرت اور افسوس ہوا۔ انہیں اصرار تھا کہ سب سے پہلے تمام سیاسی لیڈروں خاص طور پر علی برادران کو غیر مشروط طور پر رہا کیا جائے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ ہم ان

لیڈروں کی رہائی کے بعد ہی گول میز کانفرنس کی تجویز پر غور کر سکتے ہیں۔ مسٹر داس اور میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ مطالبہ پیش کرنا غلط ہے۔ جب حکومت اس بات پر اتفاق کر چکی تھی کہ کانگریسی لیڈروں کو گول میز کانفرنس سے پہلے رہا کر دیا جائے گا تو رہائی کے مطالبے پر اصرار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پنڈت مالویہ نے پھر گاندھی جی کے پاس جا کر انہیں ہماری رائے سے آگاہ کیا لیکن وہ نہ مانے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وائسرائے نے اپنی تجویز واپس لے لی۔ اس کی پیشکش کا اصل مقصد یہ تھا کہ کلکتے میں پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ سے گریز کیا جائے۔ چونکہ کوئی سمجھوتا طے نہیں پایا تھا اس لیے بائیکاٹ بہت کامیاب رہا البتہ ہم نے سیاسی تصفیے کا سنہری موقع ضائع کر دیا۔ مسٹر داس نے اس پر کھلے بندوں ناپسندیدگی اور مایوسی کا اظہار کیا۔

اس کے بعد گاندھی جی نے بمبئی میں ایک کانفرنس بلائی جس کے چیئرمین سی سنکرن نائر تھے۔ اس کانفرنس میں خود گاندھی جی نے گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کر دی۔ ان کی شرطیں تقریباً وہی تھیں جو پہلے پنڈت مالویہ لے کر آئے تھے لیکن اس دوران پرنس آف ویلز ہندوستان سے واپس جا چکے تھے اور حکومت کو اس تجویز میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ حکومت نے گاندھی جی کی تجویز پر کوئی توجہ نہ دی اور اسے قطعی طور پر مسترد کر دیا۔ اس پر مسٹر داس غضبناک ہو کر کہنے لگے کہ گاندھی جی نے پوری صورت حال کو خراب کر دیا ہے اور سنگین سیاسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ مجھے بھی ان کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا۔

اس کے بعد چوری چورہ کے واقعے کی بنا پر گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک معطل کر دی۔ اس سے سیاسی حلقوں میں شدید ردعمل ہوا اور سارے ملک میں شکست خوردگی کی فضا پیدا ہو گئی۔ حکومت نے اس موقعے سے پورا فائدہ اٹھایا اور گاندھی جی کو گرفتار کر لیا۔ انہیں چھ سال قید کی سزا سنا دی گئی اور عدم تعاون کی تحریک بتدریج دم توڑ گئی۔

مسٹر داس تقریباً روزانہ میرے ساتھ صورت حال پر تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک ختم کر کے ایسی غلطی کی ہے جس سے شدید نقصان ہو گا۔ اس سے سیاسی کارکنوں کے حوصلے اس قدر پست ہو گئے ہیں کہ ان میں دوبارہ جوش و جذبہ پیدا کرنے میں کئی برس لگیں گے۔ اس کے علاوہ مسٹر داس کی یہ بھی رائے تھی کہ گاندھی جی نے مقصد کے حصول کے لیے جو براہ راست طریقہ اختیار کیا ہے وہ ناکام ہو گیا ہے چنانچہ ان کا خیال تھا کہ اب ہمیں عوام میں ہمت اور جوش پیدا کرنے کی غرض سے نئی تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے انتظار کرنے کے حق میں نہیں تھے کہ صورت حال کب بہتر ہوتی ہے۔ وہ ایک متبادل پروگرام پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ صورت حال میں راست اقدام کے بجائے قانون ساز مجلسوں میں سیاسی جنگ لڑنی چاہیے۔ کانگریس نے گاندھی جی کے زیر اثر ۱۹۲۱ کے

انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ مسٹر داس نے اعلان کیا کہ کانگریس کو ۱۹۲۴ میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لے کر قانون ساز مجلسوں پر قبضے کی تیاری کرنی چاہیے اور انہیں سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ مسٹر داس اس بارے میں پرامید تھے کہ کانگریس کے تمام سرگرم لیڈر اُن کے تجزیے اور تشخیص سے اتفاق کریں گے۔ میرا خیال تھا کہ وہ حد سے زیادہ خوش فہمی سے کام لے رہے ہیں البتہ میں اس نکتے پر ان سے متفق تھا کہ انہیں رہائی پانے کے بعد اپنے دوستوں سے صلاح مشورے سے ملک کے لیے ایک نیا پروگرام تیار کرنا چاہیے۔

مسٹر داس اس وقت رہا ہوئے جب گیا کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ استقبالیہ کمیٹی نے انہیں اپنا صدر منتخب کر لیا اور انہیں یہ محسوس ہوا کہ وہ ملک کو اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ کر لیں گے۔ جب حکیم اجمل خان، پنڈت موتی لعل نہرو اور سردار وٹھل بھائی پٹیل نے ان کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا تو ان کی ہمت اور بڑھ گئی۔ مسٹر داس نے اپنے صدارتی خطبے میں تجویز کیا کہ کانگریس کو کونسلوں میں داخل ہونے کا پروگرام منظور کر لینا چاہیے اور قانون ساز مجلسوں میں سیاسی جدوجہد کرنی چاہیے۔ گاندھی جی اس وقت جیل میں تھے۔ کانگریس کے ایک دھڑے نے شری راج گوپال آچاری کی سرکردگی میں مسٹر داس کی مخالفت کی۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ راست اقدام کو ترک کرنے اور مسٹر داس کے پروگرام کو منظور کرنے سے حکومت یہ نتیجہ اخذ کرے گی کہ گاندھی جی کی قیادت سے انحراف کیا گیا ہے۔

میرے خیال میں راج گوپال آچاری کا استدلال صحیح نہیں تھا۔ مسٹر داس حکومت کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ سیاسی جدوجہد کو کسی دوسرے میدان میں جاری رکھا جائے۔ انہوں نے یہ بات پوری وضاحت اور تفصیل کے ساتھ سمجھائی تاہم وہ کانگریس کے عام ارکان کو قائل نہ کر سکے۔ شری راج گوپال آچاری، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دوسرے لوگوں نے ان کی مخالفت کی اور ان کی تجویز کو مسترد کر دیا گیا۔ گیا کانگریس دو دھڑوں میں بٹ گئی اور ڈاکٹر داس نے استعفا دے دیا۔ اس طرح کانگریس کی ساری توانائیاں دو گروپوں کے درمیان تباہ کن چپقلش کی نذر ہو گئیں۔ ایک دھڑا حالات کو جوں کا توں رکھنے اور دوسرا تبدیلی کا علمبردار تھا۔

کوئی چھ ماہ بعد میں بھی جیل سے رہا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ کانگریس سنگین بحران کا شکار ہے اور اس کی پوری طاقت انگریزوں کے خلاف جدوجہد کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف ہلاکت خیز جنگ پر صرف کی جا رہی تھی۔ مسٹر داس، پنڈت موتی لعل اور حکیم اجمل خان تبدیلی کے حامی اور راجا جی، سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد تبدیلی کے مخالف دھڑے کی ترجمانی کر رہے تھے۔ دونوں گروپوں نے میری تائید اور حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے کسی ایک کیمپ میں جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ داخلی اختلافات

خطرناک ہیں اور اگر اس صورت حال پر قابو نہ پایا گیا تو کانگریس ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ چنانچہ میں نے ان دونوں کیمپوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنی تمام تر توجہ سیاسی جدوجہد پر مرکوز کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے خوشی ہے کہ میری یہ کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ دہلی میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس بلایا گیا اور مجھے دونوں گروپوں کی رضامندی سے کانگریس کا صدر منتخب کرلیا گیا۔

میں نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس حقیقت پر زور دیا کہ ہمارا اصل نصب العین ملک کو آزاد کرانا ہے۔ ہم ۱۹۱۹ سے راست اقدام کے پروگرام پر عمل کر رہے تھے اور اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے تھے۔ اب اگر ہم میں سے بعض لوگوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ہمیں قانون ساز مجلسوں کو میدان بنانا چاہیے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے سابقہ فیصلے پر اڑے رہیں۔ جب تک ہمارا مقصد اور نصب العین ایک ہے اس وقت تک ہر گروپ کو یہ حق اور اختیار حاصل ہے کہ وہ جس پروگرام کو مفید اور موثر سمجھتا ہو، اس پر عمل کرے۔

دہلی کانگریس میں یہ فیصلہ ہوا کہ تبدیلی کے حامی اور مخالف دونوں دھڑوں کو اپنے اپنے پروگرام پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، شری راج گوپال آچاری اور ان کے ساتھیوں نے اپنے تعمیری پروگرام پر عملدرآمد کرنے کا فیصلہ کرلیا جبکہ مسٹر سی آر داس، پنڈت موتی لعل اور حکیم اجمل خان نے سوراج پارٹی قائم کرلی اور انتخابات لڑنے کا اعلان کردیا۔ ان کی اس تحریک نے ملک کے طول و عرض میں زبردست جوش و خروش پیدا کردیا اور مرکزی اسمبلی کے علاوہ تمام صوبائی اسمبلیوں میں سوراج پارٹی کے بہت سے امیدوار کامیاب ہوگئے۔

تبدیلی کے مخالف دھڑے کا ایک بڑا اعتراض یہ تھا کہ کونسلوں میں داخلے کے پروگرام سے گاندھی جی کی قیادت کمزور ہو جائے گی لیکن بعد میں رونما ہونے والے واقعات سے یہ ثابت ہوگیا کہ ان کے اندیشے بے بنیاد تھے۔ سوراج پارٹی نے مرکزی قانون ساز اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی جس میں مہاتما گاندھی کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس تحریک سے حکومت پر سخت دباؤ پڑا اور اس کے فوراً بعد گاندھی جی کو رہا کردیا گیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ سوراج پارٹی نے مرکزی اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں بھاری اکثریت حاصل کرلی تھی۔ اس کا سب سے نمایاں کارنامہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے لیے مخصوص نشستیں حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ یہ انتخابات فرقہ وارانہ بنیادوں پر کرائے گئے اور ان میں مسلمان ووٹر صرف مسلم امیدواروں کو منتخب کر سکتے تھے۔ مسلم لیگ اور دوسری فرقہ پرست پارٹیوں نے مسلمانوں کے خدشات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صرف ان امیدواروں کو کھڑا کیا جن کا رجحان فرقہ پرستی کی طرف تھا۔ مسٹر داس بنگال کے مسلمانوں کے اندیشوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے علانیہ انہیں اپنا لیڈر مان لیا۔ انہوں نے بنگال کے

فرقہ وارانہ مسئلے کو جس خوش اسلوبی سے حل کیا وہ ایک یادگار کارنامہ ہے اور آج بھی ایک بے مثال نمونے کے طور پر اس کی پیروی کرنی چاہیے۔

بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن بعض اسباب کی بنا پر وہ تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے پسماندہ تھے اور پبلک زندگی اور سرکاری ملازمتوں میں ان کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ گو آبادی میں ان کا تناسب پچاس فی صد سے بھی زیادہ تھا لیکن سرکاری ملازمتوں میں ان کی تعداد بمشکل تیس فی صد تھی۔ مسٹر داس بڑے حقیقت پسند شخص تھے چنانچہ انہوں نے فوراً یہ بھانپ لیا کہ مسئلہ دراصل معاشی ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جب تک مسلمانوں کو بہتر اقتصادی مستقبل کے بارے میں ضروری یقین دہانی نہیں کرائی جاتی، اس وقت تک وہ دل و جان سے کانگریس میں شامل نہیں ہوں گے لہٰذا انہوں نے ایک اعلان کے ذریعے نہ صرف بنگال بلکہ پورے ہندوستان کو مبہوت کر دیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ کانگریس بنگال میں برسر اقتدار آ کر تمام نئی تقرریوں میں اس وقت تک مسلمانوں کے لیے ساٹھ فی صد اسامیاں مخصوص کر دے گی جب تک سرکاری ملازمتوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے پوری نمائندگی نہیں ہوتی۔ کلکتہ کارپوریشن کے معاملے میں وہ اس سے بھی آگے نکل گئے اور انہوں نے کہا کہ وہ کارپوریشن میں مسلمانوں کے لیے اسی فی صد اسامیاں مخصوص کر دیں گے۔ انہوں نے واضح کیا کہ جب تک پبلک زندگی اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی نہ ملی، بنگال میں صحیح معنوں میں جمہوریت قائم نہیں ہو گی۔ ایک مرتبہ عدم مساوات کے اثرات مٹا دیے گئے تو مسلمان دوسرے طبقوں کا برابری کی بنیاد پر مقابلہ کر سکیں گے جس کے بعد ان کے لیے ملازمتیں اور اسامیاں مخصوص کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

اس جرأت مندانہ اعلان سے بنگال کانگریس کی بنیادیں ہل گئیں۔ بہت سے کانگریسی لیڈروں نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور مسٹر داس کے خلاف مہم شروع کر دی، ان پر ابن الوقت، مصلحت پرست اور مسلمانوں کے طرفدار ہونے کا الزام لگایا گیا لیکن وہ ایک چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔ انہوں نے پورے صوبے کا دورہ کر کے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو اپنا نقطہ نظر سمجھایا۔ ان کی بے مثال جرأت اور نصب العین کے ساتھ خلوص اور لگن کا اس قدر اثر ہوا کہ بنگال کانگریس نے بھی آخر کار ان کے موقف کو تسلیم کر لیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کا قبل از وقت انتقال نہ ہوتا تو وہ ملک میں ایک نئی فضا پیدا کر دیتے۔ یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے بعض پیروکاروں نے ان کے نقطہ نظر پر حملے شروع کر دیے اور ان کے اعلان کو منسوخ کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے مسلمان کانگریس سے الگ ہو گئے اور اس طرح تقسیم کا پہلا بیج بو دیا گیا۔

یہاں پر مجھے ایک حقیقت کی وضاحت کر دینی چاہیے۔ بہار اور بمبئی کی صوبائی کانگریس کمیٹیوں نے

ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر نریمان کو مقامی قیادت سے محروم کر کے سنگین غلطی کی تھی اور ورکنگ کمیٹی اس قدر طاقتور نہیں تھی کہ اس غلطی کا تدارک کرتی۔ اس ایک لغزش کے سوا کانگریس نے اپنے اصولوں کے مطابق عمل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور وزارتیں بننے کے بعد اس نے تمام اقلیتوں کے ساتھ انصاف کو یقینی بنانے کے لیے موثر تدبیریں اختیار کیں۔

کانگریس نے یہ ذمے داریاں سنبھالیں تو وزارتوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور انہیں پالیسی امور میں گائیڈ لائن دینے کے لیے ایک پارلیمانی بورڈ تشکیل دے دیا گیا۔ یہ بورڈ سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مجھ پر مشتمل تھا۔ میں بنگال، بہار، یوپی، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے پارلیمانی امور کا انچارج تھا۔ ہر واقعہ، جس میں کوئی فرقہ وارانہ رنگ یا مسئلہ ہوتا، میرے سامنے پیش کیا جاتا۔ میں اپنے ذاتی علم اور پوری ذمے داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ بے انصافی کے جو الزامات لگائے، وہ غلط اور جھوٹے تھے۔ اگر ان میں حقیقت کا شائبہ بھی ہوتا تو میں اس بے انصافی کا یقیناً تدارک کرتا اور اگر اور کوئی صورت نہ ہوتی تو میں اس قسم کے معاملے پر استعفا بھی دے دیتا۔

کانگریسی وزارتیں دو سال سے کچھ کم مدت تک برسر اقتدار رہیں مگر اس مختصر مدت میں بھی کئی اہم مسئلے اصولی طور پر طے کر لیے گئے۔ کانگریس کی وزارتوں نے جو قانون سازی کی، ان میں زمینداری اور زرعی قرضداری کے خاتمے اور بچوں اور بالغوں کی تعلیم کا وسیع پروگرام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

زمینداری کا خاتمہ اور زرعی قرضداری کی منسوخی ایسے مسئلے نہیں تھے کہ آسانی سے طے ہو جاتے۔ ایسے قوانین بہت سے پرانے مفادات کے لیے بہت بڑا چیلنج تھے چنانچہ یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ مفاد پرست عناصر نے قدم قدم پر کانگریس کے خلاف جنگ لڑی۔ بہار میں زرعی اصلاحات کی پرزور مخالفت کی گئی اور اس تنازع کو طے کرنے کے لیے مجھے ذاتی طور پر مداخلت کرنا پڑی۔ زمینداروں کے ساتھ طویل بحث مباحثے کے بعد ہم ایک ایسا فارمولا طے کرنے میں کامیاب ہو گئے جس سے زمینداروں کے جائز اندیشے دور ہو گئے اور کسانوں کو بھی ان کے حقوق کے بارے میں مکمل ضمانت مل گئی۔

ہم ایسے پیچیدہ اور نازک مسئلوں کو اس لیے طے کر سکے کیونکہ مجھے کانگریس کے کسی مخصوص طبقے کا حامی یا نمائندہ تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ میں پہلے ہی یہ کہہ چکا ہوں کہ ۱۹۲۰ کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں مَیں نے تبدیلی کے حامیوں اور مخالفین کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کس طرح مدد کی تھی۔ یہ تنازع اب ختم ہو چکا تھا۔ ۱۹۳۰ کی دہائی میں کانگریس دو حصوں میں بٹ گئی جن میں سے ایک قدامت پسند اور دوسرا ترقی پسند کہلاتا تھا۔ دائیں بازو کے لوگوں کو مفاد پرستوں کا حامی تصور کیا جاتا جبکہ بائیں بازو کے لوگ اپنے انقلابی

جوش کی بدولت پھل پھول رہے تھے۔ میں نے قدامت پسندوں کے اندیشوں کا پورا لحاظ رکھا لیکن اس کے ساتھ ہی اصلاحات کے معاملے میں میری ہمدردیاں ترقی پسندوں کے ساتھ تھیں۔ اس طرح میں دونوں انتہا پسندانہ نقطہ ہائے نظر کے درمیان ثالثی کا کردار ادا کرتا رہا اور مجھے یہ توقع تھی کہ کانگریس ثابت قدمی کے ساتھ کسی تنازعے کے بغیر اپنے پروگرام پر عمل جاری رکھے گی لیکن ۱۹۳۹ میں بین الاقوامی طاقتوں کی کشمکش کی بنا پر کانگریس کے الیکشن پروگرام کی تدریجی تکمیل کے تمام منصوبے تعطل کا شکار ہو گئے۔

دوسرا باب

یورپ میں جنگ

پچھلے باب میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان کا پس منظر ایک تیرہ و تار فضا تھی اور جنگ کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ اس پورے عرصے میں یورپ میں بین الاقوامی بحران کے اثرات شدت اختیار کرتے جا رہے تھے اور یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جنگ ناگزیر ہو چکی ہے۔ جرمنی نے آسٹریا کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے فوراً بعد سوڈیٹن لینڈ کا مطالبہ کر دیا۔

جب مسٹر چیمبرلین نے میونخ کا تاریخی دورہ کیا تو یہ واضح ہو گیا کہ جنگ سے بچنے کی کوئی صورت نہیں نکلے گی۔ جرمنی اور برطانیہ کے درمیان سمجھوتا ہو گیا اور چیکوسلواکیہ کا ایک حصہ جنگ کے بغیر جرمنی کے قبضے میں آ گیا۔ اس وقت یہ قیاس کیا جانے لگا کہ جنگ کے بادل چھٹ گئے ہیں لیکن بعد میں رونما ہونے والے واقعات سے یہ امیدیں دم توڑ گئیں۔ میونخ معاہدے کے ایک سال کے اندر برطانیہ عظمیٰ جرمنی کے خلاف اعلان جنگ پر مجبور ہو گیا۔

کانگریس یورپ کے واقعات سے خوش نہیں تھی چنانچہ مارچ ۱۹۳۹ میں تری پورہ کے اجلاس میں مندرجہ ذیل قرارداد کی منظوری دی گئی:

> کانگریس اس بات کو ریکارڈ پر لانا چاہتی ہے کہ وہ برطانیہ کی خارجہ پالیسی کو قطعی ناپسند کرتی ہے جس کے نتیجے میں میونخ کے معاہدے کو منسوخ کر دیا گیا ہے، اٹلی کے ساتھ معاہدہ کیا گیا ہے اور ہسپانیہ کے باغیوں کی حکومت کو قانوناً تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یہ پالیسی جمہوریت کے ساتھ قصداً غداری، مسلسل عہد شکنی، اجتماعی سلامتی کے نظام کے خاتمے اور ان حکومتوں کے ساتھ تعاون کے مترادف ہے جو جمہوریت اور آزادی کی کھلی دشمن ہیں۔ اس پالیسی کی بدولت دنیا بین الاقوامی فساد کی حامل ایک ایسی ریاست کی صورت میں سمٹ گئی ہے جس میں بہیمانہ تشدد فتح یاب اور کسی رکاوٹ کے بغیر پھل پھول رہا ہے اور اسی کے ذریعے قوموں کے مستقبل کا فیصلہ ہو رہا ہے، جہاں امن کے نام پر بڑے پیمانے پر ایک ہولناک جنگ کی تیاریاں ہو چکی ہیں، وسطی اور جنوب مغربی یورپ میں بین الاقوامی اخلاقی قدریں اس قدر انحطاط پذیر ہو چکی ہیں کہ نازی حکومت یہودی نسل کے لوگوں کے ساتھ دنیا کے سامنے منظم دہشت گردی کا برتاؤ کر رہی ہے، ہسپانیہ کی باغی فوجیں ہوائی جہازوں سے شہروں، سویلین باشندوں اور بے یار و مددگار پناہ گزینوں پر مسلسل بمباری کر رہی ہیں۔

کانگریس برطانیہ کی اس پالیسی سے مکمل طور پر لاتعلقی کا اظہار کرتی ہے جس کے نتیجے میں جمہوری ملکوں کی تباہی میں فاشسٹ طاقتوں کی مسلسل مدد کی جا رہی ہے۔ کانگریس امپیریلزم اور فاشزم دونوں کے خلاف ہے اور اسے یقین ہے کہ عالمی امن اور ترقی کے لیے ان دونوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ کانگریس کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ ہندوستان ایک خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنی خارجہ پالیسی خود طے کرے اور اس طرح امپیریلزم اور فاشزم سے الگ رہتے ہوئے امن اور آزادی کی راہ پر قدم بڑھائے۔

جیسے جیسے بین الاقوامی افق پر طوفان گھرتے ہوئے نظر آئے، گاندھی جی کے دماغ پر گہری مایوسی طاری ہوتی گئی۔ اس سارے زمانے میں وہ ایک شدید ذہنی بحران کا شکار رہے۔ جب یورپ اور امریکا کی سوسائٹیاں اور مختلف افراد ان سے درخواست کرتے کہ وہ جنگ کی بلا کو، جو سر پر آن کھڑی تھی، ٹالنے کی کوئی تدبیر کریں تو ان کا روحانی کرب اور بھی بڑھ جاتا۔ دنیا بھر کے امن پسند لوگ انہیں اپنا فطری رہنما مانتے تھے اور یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ امن قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

گاندھی جی نے اس مسئلے پر گہرے غور وخوض کے بعد کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کو یہ تجویز پیش کی کہ اس بین الاقوامی بحران میں ہندوستان کو اپنا نقطہ نظر کھل کر بیان کر دینا چاہیے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان کو کسی بھی قیمت پر، خواہ وہ اس کی آزادی ہی کیوں نہ ہو، آنے والی اس جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔

مجھے جنگ میں شرکت کے مسئلے پر گاندھی جی سے اختلاف تھا۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ یورپ دو کیمپوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک کیمپ نازی ازم اور فاشزم کی قوتوں اور دوسرا جمہوری طاقتوں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ ان دونوں کیمپوں کے درمیان محاذ آرائی کی صورت میں ہندوستان کو جمہوری طاقتوں کا ساتھ دینا چاہیے بشرطیکہ وہ آزاد ہو البتہ اگر برطانیہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم نہیں کرتا تو یہ توقع کرنا بیجا ہوگا کہ ہندوستان جمہوریت سے محروم ہو کر دوسری قوموں کی جمہوریت کے لیے لڑے گا۔ ایسی صورت میں ہندوستان کو برطانیہ سے تعاون اور جنگ کی سرگرمیوں میں برطانوی حکومت کی امداد نہیں کرنی چاہیے۔

دوسرے کئی معاملوں کی طرح اس معاملے میں بھی کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ارکان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ان میں سے بعض ارکان کے خیالات دراصل واضح نہیں تھے تاہم پنڈت جواہر لعل یہ محسوس کرتے تھے کہ اگر گاندھی جی کی پالیسی پر عمل کیا گیا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ایک بند گلی میں پہنچ جائیں گے۔ اس وجہ سے وہ شش و پنج میں تھے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

کانگریس اس طرح پس و پیش کر رہی تھی کہ اعلان جنگ کے فوراً بعد ہندوستان میں سنگین بحران پیدا ہو

گیا۔ برطانیہ نے ۳ ستمبر ۱۹۳۹ کو جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا تو اس نے دولت مشترکہ کے تمام ممبر ملکوں سے یہ اپیل کی کہ وہ بھی ایسا ہی کریں۔ سلطنت برطانیہ کی تمام پارلیمانوں کے اجلاس ہوئے جن میں اعلان جنگ کر دیا گیا۔ ہندوستان میں ایسا ہوا کہ وائسرائے نے اپنے طور پر جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور مرکزی قانون ساز مجلس سے رسمی طور پر بھی صلاح مشورہ نہ کیا۔ وائسرائے کے اس عمل سے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت ہو گیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کو اپنا حلقہ بگوش سمجھتی ہے اور یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے کہ ہندوستان کو جنگ کے معاملے میں اپنا طرز عمل خود طے کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

جب ہندوستان کو اس طرح جنگ میں دھکیل دیا گیا تو گاندھی جی کی نا قابل برداشت ذہنی اذیت انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ ہندوستان کی جنگ میں شرکت کو کسی صورت میں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے احساسات کچھ بھی ہوں، واقعہ یہ ہے کہ وائسرائے کے ایک فیصلے کے باعث ہندوستان جنگ میں کود چکا تھا۔

کانگریس نے اپنی رائے کا اظہار ۸ سے ۱۵ ستمبر ۱۹۳۹ کو وردھا میں منعقد ہونے والے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ایک قرارداد میں کیا۔ اس قرارداد سے جنگ اور بین الاقوامی سیاست میں جمہوری ملکوں کے کردار کے بارے میں کانگریس کے نظریات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ میں یہاں اس قرارداد کا متن نقل نہیں کر رہا کیونکہ یہ قرارداد ریفرنس کی تمام کتابوں میں درج ہے۔

میں کانگریس کا صدر بن گیا

یورپ میں جنگ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ کو شروع ہو گئی۔ ایک مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی پولینڈ جرمن ہتھیاروں کے سامنے بے سکت پڑا ہوا تھا۔ پولستانیوں کی مصیبت میں ایک اضافہ یہ ہوا کہ سوویت یونین نے ان کے نصف مشرقی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پولینڈ کی مدافعانہ قوت ختم ہونے کے بعد ایک وقفہ ہوا جس میں یورپ پر بے چینی کی کیفیت چھا گئی۔ فرانس اور جرمنی اپنی قلعہ بند سرحدوں پر آمنے سامنے آ گئے تاہم بڑے پیمانے پر جارحانہ سرگرمیاں معطل کر دی گئیں۔ ہر شخص اس انتظار میں تھا کہ دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے؟ خوف اور اندیشے ابھی تک متشکل نہیں ہوئے تھے بلکہ مبہم اور غیر متعین تھے۔

ہندوستان میں بھی انتظار اور خوف کی ملی جلی کیفیت پائی جاتی تھی۔ بے یقینی اور نا معلوم خطرات میں گھری فضا کے تناظر میں کانگریس کی صدارت کے مسئلے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس سے ایک سال پہلے مجھ پر دباؤ ڈالا گیا کہ میں اس عہدے کو قبول کر لوں مگر بعض اسباب کی بنا پر میں نے معذرت کر لی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس مرتبہ صورت کچھ اور ہے اور ایسے موقعے پر انکار کرنا فرض کی انجام دہی سے گریز کے مترادف ہو گا۔ میں اس جانب پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں کہ جنگ میں ہندوستان کی شرکت کے مسئلے پر گاندھی جی اور میرے درمیان اختلافات پائے جاتے تھے۔ اب جو لڑائی شروع ہو چکی تھی تو میں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کو کسی تذبذب کے بغیر جمہوری طاقتوں کے ساتھ شامل ہو جانا چاہیے۔ مگر سوال یہ تھا کہ ہندوستان، جو خود غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، دوسروں کی آزادی کے لیے کیسے لڑ سکتا تھا؟ اگر برطانوی حکومت فوری طور پر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیتی تو ہر ہندوستانی پر یہ فرض عائد ہو جاتا کہ وہ جمہوریت کے نصب العین کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ جنگ کے بحران میں مجھے جس حیثیت سے بھی کہا جائے، قوم کی خدمت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جب گاندھی جی نے مجھ سے کانگریس کی صدارت کا منصب سنبھالنے کی درخواست کی تو میں خوشی سے تیار ہو گیا۔

دراصل صدر کے انتخاب میں کوئی مقابلہ نہ ہوا اور جو امیدوار میرے خلاف کھڑا ہوا، اسے بھاری ووٹوں سے شکست ہو گئی۔ کانگریس کا اجلاس رام گڑھ میں ہوا جس میں ایک قرارداد میں بڑی حد تک میرے ان خیالات کی عکاسی کی گئی جن کا اظہار میں نے اپنے صدارتی خطبے میں کیا تھا۔ قرارداد کا متن درج ذیل ہے:

اس پُرخطر اور نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے، جو یورپ میں جنگ اور اس کے متعلق برطانوی پالیسی کا نتیجہ ہے، کانگریس کا یہ اجلاس آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کی ان قراردادوں کو منظور اور ان کارروائیوں کی توثیق کرتا ہے جو انہوں نے جنگ کی پیدا کی ہوئی حالت کے سلسلے میں کی ہیں۔ کانگریس کے خیال میں یہ ہندوستانی قوم کی کھلی توہین ہے کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت نے اس کا منشا معلوم کیے بغیر اسے شریک جنگ قرار دے دیا ہے اور وہ اس کے وسائل کو جنگ کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی خوددار اور آزادی پسند قوم ایسے برتاؤ کو گوارا یا برداشت نہیں کرسکتی۔ برطانوی حکومت کی طرف سے حال ہی میں ہندوستان کے بارے میں جو اعلانات کیے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ بنیادی طور پر سامراجی مقاصد کی خاطر اور اپنی سلطنت کو، جو ہندوستان اور دوسرے ایشیائی اور افریقی ملکوں کے وسائل اور عوام کی محنت کے استحصال کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے، محفوظ رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کی غرض سے یہ جنگ لڑ رہا ہے۔ ان حالات میں یہ صاف ظاہر ہے کہ کانگریس براہ راست یا بالواسطہ طور پر ایک ایسی جنگ میں ہرگز فریق نہیں بن سکتی جس کا مقصد اس استحصال کو جاری رکھنا اور اسے استحکام دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس اس کے سخت خلاف ہے کہ ہندوستانی فوجیں برطانیہ عظمیٰ کے لیے جنگ کریں اور جنگ کے مصرف کے لیے آدمیوں اور سامان کو ملک سے باہر بھیجا جائے۔ وہ یہ نہیں مانتی کہ ہندوستان میں فوجیوں کی جو بھرتی کی گئی ہے یا جو روپیہ جمع کیا گیا ہے، وہ ہندوستان کا رضا کارانہ عطیہ ہے۔ کانگریس کے ارکان اور اس کے زیر اثر لوگ افرادی قوت، سرمائے یا سامان سے جنگ کو جاری رکھنے میں مدد نہیں کرسکتے۔

کانگریس اس قرارداد کے ذریعے ایک مرتبہ پھر یہ اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان کے عوام کامل آزادی کے سوا کسی چیز کو ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ سامراجیت کے حلقے کے اندر ہندوستان کی آزادی کا وجود ممکن نہیں ہے اور ڈومینین یا برطانوی سلطنت کے اندر کوئی اور حیثیت ہندوستان کے لیے قطعی نامناسب ہے کیونکہ ایسی حیثیت ایک عظیم قوم کے ہرگز شایان شان نہیں ہے۔ اس طرح ہندوستان کئی طریقوں سے برطانوی پالیسیوں اور اقتصادی ڈھانچے سے وابستہ ہو جائے گا۔ ہندوستانی قوم ایک دستور ساز اسمبلی کے ذریعے، جس کا انتخاب بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر کیا گیا ہو، اپنا دستور خود وضع کرسکتی اور دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات کا تعین کرسکتی ہے۔

کانگریس کی یہ رائے ہے کہ جس طرح وہ پہلے تیار تھی، اسی طرح آئندہ بھی ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کے لیے ہمیشہ تیار ہوگی۔ اس کی رائے یہ ہے کہ اس مسئلے کا مستقل حل صرف وہی دستور ساز اسمبلی کرسکتی ہے جو تمام مسلمہ اقلیتوں کے حقوق کو پوری طرح محفوظ کردے۔ یہ تحفظ جہاں تک ممکن ہو گا مختلف اکثریتی اور اقلیتی گروپوں کے منتخب نمائندوں کے درمیان اتفاق رائے سے ایک معاہدے کی صورت میں کیا جائے گا اور اگر کسی نکتے پر اتفاق رائے نہ ہو سکا تو اس کا متبادل حل تلاش کیا جائے گا جو قطعی ہو گا۔ ہندوستان کے دستور کی بنیاد آزادی، جمہوریت اور قومی اتحاد پر استوار ہو گی۔ کانگریس ہندوستان اور ہندوستانیوں کو تقسیم کرنے کی کسی بھی کوشش کی مخالفت کرے گی۔ کانگریس کا ہمیشہ سے یہ نصب العین رہا ہے کہ ایسا آئین مرتب کیا جائے جس میں ہر گروپ اور فرد کو مکمل آزادی اور ترقی کے یکساں مواقع فراہم کرنے اور سماجی ناانصافیوں اور ناہمواریوں کو دور کر کے منصفانہ سماجی نظام قائم کرنے کی ضمانت دی گئی ہو۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد سے صدارت کا چارج لینے کے بعد میرے ابتدائی کاموں میں سے ایک یہ تھا کہ میں ورکنگ کمیٹی کی تشکیل نو کروں۔ کمیٹی کے درج ذیل دس ارکان مشترک تھے۔

شریمتی سروجنی نائیڈو
سردار ولبھ بھائی پٹیل
سیٹھ جمنالال بجاج (خزانچی)
شری جے بی کرپلانی (جنرل سیکرٹری)
خان عبدالغفار خان
شری بھولا بھائی ڈیسائی
شری شنکر راؤ دیو
ڈاکٹر پرفلا چندر گھوش
ڈاکٹر راجندر پرشاد
ابوالکلام آزاد

ایک نمایاں شخص، جنہیں ڈاکٹر راجندر پرشاد کی کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا تھا، وہ جواہر لعل نہرو تھے۔ میں انہیں واپس بلا لایا اور ان کے علاوہ شری سی راج گوپال آچاری، ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر آصف علی کو بھی کمیٹی میں شامل کر لیا۔

پندرہویں رکن کے نام کا اعلان بعد میں ہونا تھا لیکن کانگریس کے اجلاس کے فوراً بعد ہمیں گرفتار کر لیا گیا اور یہ جگہ طویل عرصے تک خالی رہی۔

کانگریس کی تاریخ میں یہ ایک نہایت نازک وقت تھا۔ دنیا کو ہلا کر رکھ دینے والے واقعات ہمارے اوپر اثر انداز ہو رہے تھے۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن ہمارے اندرونی اختلافات تھے۔ میں کانگریس کا صدر تھا اور میری خواہش تھی کہ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو اسے جمہوری ملکوں کے کیمپ میں لے جاؤں۔ ہندوستان کو جمہوری نصب العین سے گہری ہمدردی تھی لیکن ہندوستان کی غلامی ہماری راہ میں واحد رکاوٹ تھی البتہ گاندھی جی اس خیال کے حامی نہیں تھے۔ ان کے نزدیک اصل مسئلہ ہندوستان کی آزادی کا نہیں بلکہ عدم تشدد پر مبنی امن کا قیام تھا۔ میں نے کھلم کھلا یہ اعلان کر دیا کہ انڈین نیشنل کانگریس عدم تشدد کی حامی تنظیم نہیں بلکہ اس کا نصب العین ہندوستان کو آزاد کرانا ہے۔ میرے نزدیک گاندھی جی نے جو مسئلہ اٹھایا تھا، وہ ایک غیر متعلقہ ایشو تھا۔

گاندھی جی اپنی رائے بدلنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ ہندوستان کو ہر حالت میں جنگ سے الگ رہنا چاہیے۔ انہوں نے وائسرائے سے ملاقات کر کے انہیں اپنے خیالات سے آگاہ کر دیا۔ گاندھی جی

نے برطانوی عوام کے نام ایک کھلے خط میں ان سے اپیل کی کہ وہ ہٹلر سے لڑنے کے بجائے اس کا روحانی طاقت سے مقابلہ کریں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انگریزوں کے دلوں پر گاندھی جی کی اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا کیونکہ اس وقت تک فرانس شکست کھا چکا تھا اور جرمنی کی طاقت اپنے نقطہ عروج پر تھی۔

گاندھی جی کے لیے یہ بڑا مشکل وقت تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جنگ سے دنیا تباہ ہو رہی ہے اور وہ اس بربادی کو روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ وہ اس قدر دل شکستہ ہو چکے تھے کہ انہوں نے بعض موقعوں پر خودکشی کرنے کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر ان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اِن مصیبتوں اور تکلیفوں کا تدارک کریں جو جنگ کی وجہ سے لوگوں کو برداشت کرنا پڑ رہی ہیں تو کم سے کم اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے یہ سب کچھ دیکھنے سے تو انکار کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے مجھ پر بار بار یہ دباؤ ڈالا کہ مَیں ان کے خیالات کی تائید کروں۔ میں نے اس مسئلے پر بہت غور وخوض کیا لیکن اپنے آپ کو ان سے اتفاق کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ میرے لیے عدم تشدد پالیسی کا معاملہ تھا، عقیدے کا نہیں۔ میری رائے یہ تھی کہ اگر کوئی چارہ نہ ہو تو ہندوستان کو تلوار اٹھانے کا حق حاصل ہے البتہ ملکی حالات کے پیش نظر گاندھی جی کا طریق کار درست تھا۔ ہم نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کر کے جدوجہد کرنے کا جو فیصلہ کیا، وہ حالات سے مجبور ہو کر کیا گیا تھا۔ میرے اور کئی دوسرے ہندوستانیوں کے نزدیک یہ کوئی عقیدے کا معاملہ نہیں تھا۔ اگر ہمیں لڑ کر آزادی مل سکتی تو ہم جنگ میں یقیناً حصہ لیتے۔

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اندر بھی اس بنیادی مسئلے پر اختلاف موجود تھا۔ ابتدائی مرحلے میں پنڈت نہرو، سردار پٹیل، شری راج گوپال آچاری اور خان عبدالغفار خان نے میری حمایت کی البتہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، اچاریہ کرپلانی اور شری شنکر راؤ دیودل و جان سے گاندھی کے ساتھ تھے۔ انہیں اس سے اتفاق تھا کہ اگر ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیا گیا کہ آزاد ہندوستان جنگ میں شریک ہو سکتا ہے تو آزادی کے لیے عدم تشدد کی تحریک دم توڑ جائے گی۔ اس کے برعکس میں یہ محسوس کرتا تھا کہ آزادی کے لیے داخلی جدوجہد اور جارحیت کے خلاف جدوجہد میں فرق موجود ہے۔ آزادی کے لیے جدوجہد اور بات تھی اور آزادی حاصل کرنے کے بعد جنگ لڑنا دوسری بات تھی۔ میری ذاتی رائے یہ تھی کہ ان دونوں مسئلوں کو آپس میں گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔

جولائی ۱۹۴۰ میں پونا میں منعقد ہونے والے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں ان معاملوں پر تفصیل سے غور کیا گیا۔ کانگریس کے رام گڑھ اجلاس کے بعد ورکنگ کمیٹی کا یہ پہلا اجلاس تھا۔ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے میں نے اس مسئلے کو اجلاس میں پیش کیا اور کمیٹی نے میرے خیالات کی توثیق کر دی جس کے بعد دو قراردادوں کی منظوری دے دی گئی۔ پہلی قرارداد میں کانگریس کے اس یقین کا اعادہ کیا گیا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے عدم تشدد صحیح پالیسی ہے اور اس پر قائم رہنا چاہیے۔ دوسری قرارداد میں یہ اعلان کیا

گیا کہ نازی ازم اور جمہوریت کے درمیان جنگ میں ہندوستان کو جمہوری کیمپ میں شامل ہونا چاہیے البتہ جب تک ہندوستان خود آزاد نہیں ہوتا، اس وقت تک اسے جمہوری ملکوں کی جنگی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ ان قراردادوں کو، جو میرے مسودے کے مطابق تیار کی گئی تھیں، آخرکار منظور کرلیا گیا۔

جب یہ قرارداد منظور کی گئی کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی بنیاد عدم تشدد پر ہے تو گاندھی جی بہت خوش ہوئے۔ جنگ کے بارے میں میرے رویے کے پیش نظر انہیں یہ اندیشہ تھا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی عدم تشدد کو کانگریس کی پالیسی کے طور پر ترک کردے گی۔ گاندھی جی نے مجھے مبارکباد کا جو ٹیلی گرام بھیجا اس میں انہوں نے کہا کہ انہیں اس بات پر خوشی ہوئی ہے کہ میں نے داخلی جدوجہد کے سلسلے میں عدم تشدد کے نصب العین کی حمایت کی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ملک کی موجودہ فضا میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی میری اس تجویز کو فوری طور پر مان لے گی کہ اگر ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرلیا جائے تو اسے جنگ میں حصہ لینا چاہیے۔ اس حقیقت کے پیش نظر گاندھی جی کو یہ شک تھا کہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو داخلی جدوجہد کے ضمن میں عدم تشدد کی قرارداد منظور کرنے پر آمادہ نہیں کرسکوں گا۔

ورکنگ کمیٹی کے ارکان جنگ کے بارے میں پس و پیش کرنے لگے۔ ان میں سے کوئی بھی رکن یہ بات دل سے نہیں نکال سکتا تھا کہ گاندھی جی اصولی طور پر جنگ میں کسی بھی صورت میں حصہ لینے کے خلاف تھے، نہ ہی وہ اس حقیقت کو بھول سکتے تھے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی نے اپنی موجودہ نمایاں حیثیت ان کی قیادت میں حاصل کی تھی۔ اب وہ پہلی بار گاندھی جی سے اختلاف کرکے انہیں اکیلا چھوڑ رہے تھے۔ گاندھی جی کو اہنسا سے جو پختہ عقیدت تھی، وہ ارکان کی رائے پر اثر انداز ہونے لگی اور پونا کے اجلاس کے ایک ماہ کے اندر سردار پٹیل نے اپنے خیالات تبدیل کرکے گاندھی جی کے موقف کو درست تسلیم کرلیا۔ دوسرے ارکان کے خیالات بھی تبدیل ہونا شروع ہوگئے۔

جولائی ۱۹۴۰ میں ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ورکنگ کمیٹی کے کئی دوسرے ارکان نے مجھے ایک خط لکھا کہ انہیں جنگ کے بارے میں گاندھی جی کے نظریات سے مکمل اتفاق ہے اور ان کی خواہش ہے کہ کانگریس بھی ان نظریات پر کاربند رہے۔ انہوں نے مزید لکھا کہ چونکہ میرے نظریات مختلف ہیں اور پونا کے اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے میری حمایت کی تھی اس لیے انہیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ ورکنگ کمیٹی کی رکنیت برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ ان لوگوں کو اپنے لیڈر کی معاونت کے لیے ورکنگ کمیٹی کا رکن نامزد کیا گیا تھا لیکن چونکہ انہیں ایک بنیادی مسئلے پر اختلاف تھا اس لیے ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ استعفا دے دیں۔ وہ اس معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرچکے تھے لیکن اس خیال سے کہ میں پریشان نہ ہوں، وہ اس وقت تک

ورکنگ کمیٹی کی رکنیت برقرار رکھنے پر آمادہ تھے جب تک ان کے اختلافات کسی عملی شکل میں ظاہر نہیں ہوتے۔ لیکن اگر برطانوی حکومت نے میری شرطوں کو مان لیا اور جنگ میں شرکت کا سوال اہمیت اختیار کر گیا تو اس صورت میں وہ استعفا دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ انہوں نے لکھا کہ اگر مجھے ان کی رائے سے اتفاق ہے تو وہ بدستور ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہیں گے ورنہ اس خط کو ان کا استعفا سمجھا جائے۔

مجھے اس خط سے سخت صدمہ ہوا جس پر جواہر لعل نہرو اور راجا جی کے سوا ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان نے دستخط کیے تھے۔ عبدالغفار خان میرے بے حد مخلص اور پرجوش حامیوں میں سے تھے لیکن اب انہوں نے بھی اپنی رائے تبدیل کر لی تھی۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی طرف سے اس قسم کے خط کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میں نے فوری طور پر اس خط کا جواب لکھا اور کہا کہ میں ان کے نقطہ نظر کو پوری طرح سمجھتا اور ان کے موقف کو درست تسلیم کرتا ہوں۔ برطانوی حکومت کے موجودہ رویے کو دیکھتے ہوئے اس کی امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر لے گی۔ جب تک انگریزوں کا رویہ تبدیل نہ ہوتا، اس وقت تک جنگ میں شرکت کے معاملے کو محض ایک علمی مسئلے کی حیثیت حاصل تھی چنانچہ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کو برقرار رکھیں۔

اگست ۱۹۴۰ میں وائسرائے نے مجھے زیادہ اختیارات کی حامل توسیع شدہ ایگزیکٹو کونسل پر مبنی حکومت میں کانگریس کی شمولیت کے سوال پر تبادلہ خیالات کی دعوت دی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بغیر اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کانگریس کے آزادی کے مطالبے اور وائسرائے کی طرف سے ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کے درمیان کوئی مشترک بنیاد موجود نہیں۔ اس صورت میں وائسرائے کے ساتھ ملاقات بے معنی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے کانگریسی میرے اس فیصلے سے متفق نہیں تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ مجھے یہ دعوت قبول کر کے وائسرائے سے ملاقات کر لینی چاہیے تھی لیکن مجھے اس وقت یہ یقین تھا اور اب بھی ہے کہ میرا فیصلہ درست تھا۔

گاندھی جی نے اس قصے پر جو ردعمل ظاہر کیا، وہ کانگریسیوں کی اکثریت کی رائے سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے مجھے ایک خط لکھ کر میرے فیصلے کی مکمل حمایت کی۔ ان کے خیال میں وائسرائے کے ساتھ ملاقات سے انکار خدا کی رحمت کی علامت تھی۔ خدا کی یہ مرضی نہ تھی کہ ہندوستان اس جنگ میں شریک ہو۔ ان کے خیال میں وائسرائے کے ساتھ ملاقات سے انکار کی یہی وجہ تھی۔ اس طرح یہ معاملہ یہیں پر ختم ہو گیا۔ گاندھی جی کو اندیشہ تھا کہ اگر میں وائسرائے سے ملاقات کرتا تو کانگریس اور حکومت کے درمیان سمجھوتا ہو سکتا تھا اور اس طرح ہندوستان جنگ میں شریک ہو جاتا۔

اس کے فوراً بعد گاندھی جی نے برطانیہ کے نام ایک اور اپیل جاری کی جس میں انہوں نے انگریزوں سے پھر کہا کہ وہ ہتھیاروں کو ترک کر کے روحانی طاقت کے ذریعے ہٹلر کا مقابلہ کریں۔ انہوں نے انگریز قوم

کے نام اس خط پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ لارڈ لنلتھگو کے ساتھ ملاقات کر کے ان پر زور دیا کہ وہ ان کے نقطۂ نظر کو درست تسلیم کر لیں اور برطانوی حکومت کو اس سے مطلع کریں۔

گاندھی جی نے جب لارڈ لنلتھگو کو بتایا کہ انگریزوں کو ہتھیار ایک طرف رکھ کر روحانی قوت کے ذریعے ہٹلر کا مقابلہ کرنا چاہیے تو وہ اس غیر معمولی تجویز پر مبہوت ہو گئے۔ لارڈ لنلتھگو کا معمول تھا کہ وہ گھنٹی بجا کر اپنے اے ڈی سی کو بلاتے اور وہ گاندھی جی کو ان کی کار تک لے جاتا لیکن اس مرتبہ انہیں گاندھی جی کی تجویز پر اس قدر حیرت ہوئی کہ انہوں نے نہ تو گھنٹی بجائی اور نہ ہی انہیں الوداع کہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی خاموش اور بوکھلائے ہوئے وائسرائے کو چھوڑ کر خود راستہ تلاش کرتے ہوئے کار تک پہنچے۔ بعد میں گاندھی جی نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں مجھے یہ واقعہ سنایا۔

کانگریس کے اندر بحث کا سلسلہ جاری رہا۔ جہاں تک گاندھی جی کا تعلق تھا، وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کو کسی صورت میں جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ میں اس حد تک ان سے متفق تھا کہ ہندوستان موجودہ حالات میں جنگ میں حصہ نہیں لے سکتا۔ ہر چند کہ ہمارے بنیادی موقف میں گہرا تضاد موجود تھا اس کے باوجود ہمارے درمیان اس نکتے پر اتفاق رائے پایا جاتا تھا کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کو برطانیہ کی حمایت سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ اس طرح میری پالیسی اور گاندھی جی کے عقیدے میں نظریاتی اختلاف کے باوجود برطانیہ کے رویے نے ہم دونوں کو متحد کر دیا البتہ ہمارے بنیادی نقطۂ نظر میں تضاد بھی برقرار رہا۔

اب سوال یہ تھا کہ اس صورت حال میں کانگریس کو کیا کرنا چاہیے؟ ایک ایسے زمانے میں جب پوری دنیا میں حیرت انگیز واقعات رونما ہو رہے تھے، ایک سیاسی تنظیم کس طرح خاموش بیٹھ سکتی تھی۔ شروع شروع میں گاندھی جی کسی بھی تحریک کے خلاف تھے اس لیے کہ تحریک صرف ہندوستان کی آزادی کے لیے چلائی جا سکتی تھی اور اگر تحریک کے نتیجے میں ہندوستان کو آزادی مل جاتی تو اسے جنگ میں حصہ لینا پڑتا۔ دہلی اور پونا کے جلسوں کے بعد جب برطانیہ نے کانگریس کی طرف سے تعاون کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا تو گاندھی جی محدود پیمانے پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کے امکان پر غور کرنے لگے۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مردوں اور عورتوں کو انفرادی طور پر ہندوستان کو جنگ میں دھکیلنے کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے اور علانیہ یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ وہ جنگ سے متعلق سرگرمیوں کے خلاف ہیں اور اس مقصد کے لیے گرفتاریاں بھی پیش کرنی چاہئیں۔ میری رائے یہ تھی کہ جنگ کے خلاف اس سے بھی وسیع اور زیادہ شدید تحریک شروع ہونی چاہیے البتہ گاندھی جی اس سے متفق نہ ہوئے۔ چونکہ وہ اس سے آگے جانے کو تیار نہیں تھے اس لیے میں آخر کار اس بات پر رضامند ہو گیا کہ کم سے کم انفرادی ستیہ گرہ تحریک تو شروع ہو ہی جانی چاہیے۔

اس تجویز کے مطابق ونوبا بھوے کو پہلا انفرادی ستیا گرہی یا جنگ کے پہلے نہتے مخالف کے طور پر منتخب کیا گیا۔ بھوے کے بعد پنڈت نہرو نے اپنے آپ کو دوسرے رضا کار کے طور پر پیش کیا اور گاندھی جی نے انہیں بھی چن لیا۔ اس کے بعد کئی دوسرے لوگوں نے گرفتاریاں پیش کیں اور جلد ہی انفرادی ستیہ گرہی نے ایک قومی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عدم تشدد کے مسئلے پر گاندھی جی کے ساتھ اختلاف کے باوجود جو پروگرام عمل میں آیا، اس پر ہم دونوں متفق تھے۔

انفرادی ستیہ گرہ میں کبھی کبھی مضحکہ خیز باتیں بھی ہو جاتیں۔ پنجاب کے ایک کارکن نے گاندھی جی یا ورکنگ کمیٹی کی اجازت کے بغیر ستیہ گرہ کی اور گرفتاری کے بعد کانگریس کی واضح ہدایات کے خلاف اپنی صفائی پیش کی۔ جو مجسٹریٹ مقدمے کی سماعت کر رہا تھا اس نے اسے مجرم قرار دے کر ایک آنہ جرمانہ کیا اور اپنی جیب سے ایک آنہ دے کر اسے رہا کر دیا۔ اس واقعے سے پنجاب میں تحریک کے بارے میں اس قدر مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہو گئی کہ معاملات درست کرنے کے لیے مجھے پنجاب جانا پڑا۔ واپسی پر مجھے لاہور میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری میں بھی مزاح کا پہلو پیدا ہو گیا۔ میں صبح سویرے چائے پینے ریفریشمنٹ کار کی طرف جا رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے آداب وتسلیمات کے ساتھ مجھے وارنٹ پیش کر دیا۔ میں نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا: ''آپ نے مجھے یہ خاص امتیاز دے کر میری بڑی عزت افزائی کی ہے۔ آپ نے تو انفرادی ستیہ گرہ کا موقع دینے سے پہلے ہی مجھے حراست میں لے لیا ہے۔''

مجھے دو برس کی سزا دی گئی اور نینی جیل میں بھیج دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر کاٹجو بھی میرے پاس جیل میں آ گئے لیکن ہم نے سزا کی مدت پوری نہ کی اس لیے کہ اس دوران دو ایسے واقعات رونما ہو گئے جنہوں نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور جنگ کی نوعیت کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ پہلا واقعہ تھا جون ۱۹۴۱ میں سوویت روس پر جرمنی کا حملہ اور دوسرا یہ کہ اس کے چھ ماہ کے اندر جاپان نے پرل ہاربر کی امریکی بندرگاہ پر کاری ضرب لگا دی۔

سوویت روس پر جرمنی اور امریکا پر جاپان کے حملے سے جنگ نے صحیح معنوں میں عالمگیر شکل اختیار کر لی۔ سوویت روس پر جرمنی کے حملے سے پہلے صرف مغربی یورپ کے ملکوں کے درمیان لڑائی ہو رہی تھی لیکن جرمنی کے حملے کے بعد جنگ کا دائرہ پھیل گیا اور وہ ملک بھی جنگ کی لپیٹ میں آ گئے جو اَب تک محفوظ تھے۔ امریکا برطانیہ کو اچھی خاصی مدد دے رہا تھا لیکن وہ اب تک جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا۔ پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے بعد امریکا بھی جنگ میں کود پڑا اور لڑائی پوری دنیا میں پھیل گئی۔

ابتدائی مراحل میں جاپان کی حیرت انگیز کامیابیوں کی بدولت لڑائی کا گرد وغبار ہندوستان کے دروازے پر نظر آنے لگا۔ جاپان نے چند ہفتوں کے اندر ملایا اور سنگاپور کو فتح کر لیا۔ اس کے فوراً بعد برما پر، جو ۱۹۳۷

سے پہلے ہندوستان کا حصہ تھا، قبضہ کر لیا گیا۔ ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان پر بھی حملہ کر دیا جائے گا۔ خلیج بنگال میں جاپانی جہاز دیکھے جا چکے تھے اور جاپان کی بحریہ نے تھوڑے دنوں بعد انڈیمان اور نکوبار کے جزیروں پر بھی قبضہ کر لیا۔

جاپان جنگ میں شریک ہوا تو امریکا کو جنگ کی ذمے داری اپنے اوپر لینا پڑی۔ اس سے پہلے امریکا نے انگریزوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ سمجھوتا کر لیں۔ اب امریکا نے برطانیہ پر اور زیادہ دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ ہندوستان کے مسئلے کو طے کرے اور اسے جنگ میں خوشی کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ کرے۔ اس وقت تک یہ بات عام طور پر معلوم نہیں تھی لیکن پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے فوراً بعد امریکی صدر روز ویلٹ نے برطانوی حکومت سے درخواست کی کہ وہ ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ مصالحت کر لے۔ ہندوستان کی حکومت بھی ان درخواستوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی چنانچہ اس نے اپنی پالیسی کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دسمبر ۱۹۴۱ میں وائسرائے نے جواہر لعل اور مجھے رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کا مقصد جنگ کی بدلتی ہوئی صورت حال میں کانگریس کا ردعمل معلوم کرنا تھا۔ حکومت ہمارے ردعمل کو جانچ کر یہ فیصلہ کرنا چاہتی تھی کہ دوسرے لوگ رہا کیے جائیں یا نہیں؟ بہرحال مجھے رہا کرنا تو ناگزیر تھا کیونکہ جب تک مجھے رہائی نہ ملتی اس وقت تک ورکنگ کمیٹی کا اجلاس نہیں ہو سکتا تھا۔

مجھے رہائی کا حکم ملا تو میں شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ دراصل آزاد کیے جانے پر میں اپنی ذلت محسوس کر رہا تھا۔ اس سے پہلے میں جب بھی جیل سے باہر آتا تو میرے دل میں جزوی کامیابی کا احساس ہوتا لیکن اس مرتبہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اگرچہ جنگ شروع ہوئے دو برس سے زیادہ مدت گزر چکی تھی اس کے باوجود ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے کوئی موثر اقدام نہیں کر سکے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم حالات کے مارے لوگ ہیں اور اپنی تقدیر کے مالک نہیں ہیں۔

رہائی پانے کے فوراً بعد میں نے بارودلی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کر لیا۔ گاندھی جی ان دنوں وہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اجلاس وہیں بلایا جائے۔ میں گاندھی جی سے ملنے گیا اور میں نے فوراً یہ محسوس کیا کہ ہم دونوں پہلے سے بھی زیادہ ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے ہمارے درمیان صرف اصول کا اختلاف تھا لیکن اب میں نے دیکھا کہ ہم دونوں حالات کا جائزہ لے کر مختلف نتیجے نکال رہے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کو اب یقین ہے کہ اگر ہندوستان جنگ کی سرگرمیوں میں تعاون پر آمادہ ہو جائے تو برطانوی حکومت آزاد ہندوستان کو تسلیم کرنے پر تیار اور رضامند ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اگرچہ برطانیہ میں قدامت پسندوں کی حکومت ہے اور مسٹر چرچل وزیراعظم ہیں اس کے باوجود

جنگ ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے جس میں برطانیہ کے پاس ہندوستان کے تعاون کی قیمت چکانے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ ہندوستان کی آزاد حیثیت کو تسلیم کر لے۔ میری اپنی رائے اس کے بالکل برعکس تھی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ برطانوی حکومت ہمارے تعاون کی زبردست خواہش مند ہے البتہ وہ اب بھی ہندوستان کو آزاد کرنے پر تیار نہیں ہے۔ میں محسوس کرتا تھا کہ برطانوی حکومت زیادہ سے زیادہ اختیارات کی حامل ایک نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دے دے گی جس میں کانگریس کو خاصی نمائندگی دے دی جائے گی۔ اس مسئلے پر ہمارے درمیان طویل بحثیں ہوتی رہیں، پَر میں گاندھی جی کو قائل نہ کر سکا۔

رہائی کے فوراً بعد میں نے کلکتے میں پریس کانفرنس کی۔ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ آیا کانگریس جنگ کے معاملے میں اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر تیار ہے تو میں نے جواب دیا کہ اس کا انحصار برطانوی حکومت کے رویے پر ہے۔ اگر حکومت نے اپنا رویہ تبدیل کر لیا تو کانگریس بھی ایسا ہی کرے گی۔ میں نے یہ واضح کر دیا کہ جنگ کے بارے میں کانگریس کے رویے کی نوعیت ایسے عقیدے کی نہیں جسے تبدیل نہ کیا جا سکے۔ مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا کہ اگر جاپان ہندوستان پر حملہ کر دے تو ہندوستانیوں کو کیا کرنا چاہیے؟ میں نے ایک لمحہ تامل کیے بغیر کہا کہ اس صورت میں تمام ہندوستانیوں کو وطن کا دفاع کرنے کے لیے تلوار نکال لینی چاہیے۔ میں نے مزید کہا: ”ہم یہ اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ وہ زنجیریں کھول دی جائیں جن میں ہمارے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہوں تو ہم کیسے لڑ سکتے ہیں؟“

لندن کے اخبارات ٹائمز اور ڈیلی نیوز نے میرے انٹرویو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ گاندھی جی اور کانگریس کی قیادت کے درمیان اختلاف رائے موجود ہے۔ گاندھی جی نے جنگ کے بارے میں ایک ایسی رائے قائم کر لی تھی جس میں تبدیلی ناممکن تھی اور جس میں امید یا مذاکرات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے برعکس میرے بیان سے سمجھوتے کی توقع وابستہ کی جا سکتی تھی۔

جب ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا تو گاندھی جی نے برطانوی اخبارات میں شائع ہونے والے تبصروں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا کہ ان پر ان تبصروں کا ایک حد تک اثر پڑا ہے اور ان کے اس خیال کو تقویت ملی ہے کہ اگر کانگریس نے جنگ میں تعاون کی پیشکش کی تو برطانوی حکومت اپنے رویے کو بدلنے پر تیار ہو جائے گی۔ اس مسئلے پر کانگریس کا رویہ کیا ہونا چاہیے، دو دن تک بحث ہوتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ گاندھی جی اپنی رائے پر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ عدم تشدد ایک عقیدے کا مرتبہ رکھتا ہے اور اسے کسی حالت میں ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کو کسی صورت میں جنگ میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں نے اپنے اس سابق نقطہ نظر کا اعادہ کیا کہ کانگریس کو عدم تشدد کے بجائے ہندوستان کی آزادی پر زیادہ زور دینا چاہیے۔

گاندھی جی میں مشکل سے مشکل مسئلوں کا حل تلاش کرنے کی جو صلاحیت موجود تھی اس کا ایک نمایاں ثبوت اس طرح ملا کہ انہوں نے اس بندگلی سے نکلنے کے لیے ایک ایسا فارمولا تجویز کیا جس سے مخالف نقطہ نظر رکھنے والے دونوں فریق مطمئن ہو سکتے تھے۔ ان میں اپنے مخالف کے موقف کو سمجھنے اور اسے صاف صاف لفظوں میں بیان کرنے کی حیرت انگیز استعداد بھی موجود تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میں ہندوستان کی جنگ میں شرکت کے معاملے میں اپنی رائے پر سختی سے قائم ہوں تو انہوں نے مجھ پر دباؤ ڈالنا چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس انہوں نے ورکنگ کمیٹی کے سامنے ایک قرارداد پیش کی جس میں پورے خلوص کے ساتھ میرا نقطہ نظر پیش کیا گیا تھا۔

اس کے فوراً بعد ہندوستان کی سیاسی صورت حال میں ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی۔ سبھاش چندر بوس نے جنگ کے چھڑتے ہی سرگرمی کے ساتھ ایک تحریک شروع کر دی جس کا مقصد یہ تھا کہ جنگی کارروائیوں کی مخالفت کی جائے۔ ان کی سرگرمیوں کے باعث انہیں جیل بھیج دیا گیا البتہ جب انہوں نے فاقہ شروع کیا تو انہیں رہا کر دیا گیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۴۱ کو یہ معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان سے چلے گئے ہیں۔ ایک سال سے زیادہ عرصے تک ان کی کوئی خبر نہ آئی اور کوئی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ ہیں یا نہیں؟ مارچ ۱۹۴۲ میں جب برلن ریڈیو سے ان کی تقریر نشر ہوئی تو ان کے بارے میں تمام شکوک وشبہات دور ہو گئے۔ اب یہ واضح ہو گیا کہ وہ جرمنی پہنچ گئے ہیں جہاں سے وہ انگریزوں کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی دوران ہندوستان پر برطانوی قبضے کے خلاف جاپان کے پروپیگنڈے میں شدت پیدا ہو گئی۔ جرمنی اور جاپان سے ہونے والے پروپیگنڈے کا ہندوستان کے بہت سے لوگوں پر اثر ہوا، بہت سے لوگوں کو جاپانی وعدوں میں کشش محسوس ہوئی اور وہ یہ باور کرنے لگے کہ جاپان ہندوستان کی آزادی اور ایشیا کی یک جہتی کے لیے کوشاں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ جاپان کے حملے نے برطانیہ کو کمزور کر کے ہماری آزادی کی جدوجہد میں مدد دی ہے اس لیے ہمیں اس موقعے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس طرح ملک میں جاپان کے ساتھ ہمدردی بڑھتی گئی۔

گاندھی جی اور میں نے حالات کا جو اندازہ لگایا اس میں اختلاف کا ایک اور نکتہ موجود تھا۔ اس وقت تک گاندھی جی اس خیال کی طرف مائل ہو چکے تھے کہ اتحادی جنگ نہیں جیت سکتے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ جنگ میں انجام کار جرمنی اور جاپان کی فتح ہو گی اور اگر یہ نہ ہوا تو دونوں فریق زچ ہو کر رہ جائیں گے۔

جنگ کے انجام کے بارے میں گاندھی جی نے اپنے اس خیال کو صاف صاف بیان نہ کیا البتہ میں نے ان کے ساتھ ہونے والی بحثوں میں یہ محسوس کیا کہ اتحادیوں کی فتح کے بارے میں ان کے اندیشوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ سبھاش بوس کے ہندوستان سے بچ نکلنے اور جرمنی پہنچنے کا گاندھی جی پر

بہت اثر ہوا ہے۔اس سے پہلے وہ سبھاش بوس کے کئی اقدامات کی مخالفت کر چکے تھے لیکن اب ان کے خیالات تبدیل ہو گئے تھے۔گاندھی جی کے بعض ریمارکس سے مجھے یقین ہو گیا کہ سبھاش بوس جس ہمت اور خوش تدبیری کے ساتھ ہندوستان سے فرار ہوئے، گاندھی جی اسے قابل تعریف سمجھتے تھے۔سبھاش بوس کے لیے ان کے دل میں جو قدر پیدا ہو گئی تھی، اس نے غیر محسوس طریقے پر جنگ کی ساری کیفیت کو ان کی نظروں میں ایک اور رنگ دے دیا۔

یہی تعریف وتحسین بعد میں ایک ایسا عنصر ثابت ہوئی جس کی وجہ سے ہندوستان کے لیے کرپس مشن پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔میں اگلے باب میں کرپس کی لائی ہوئی تجویز اور اسے مسترد کرنے کی وجوہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کروں گا البتہ یہاں پر میں اس خبر کا تذکرہ کروں گا جو کرپس کی ہندوستان آمد سے پہلے شائع ہو گئی تھی۔اس وقت یہ خبر گرم ہو گئی کہ سبھاش بوس ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔اس خبر سے ہندوستان بھر میں سنسنی پھیل گئی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ گاندھی جی کو بھی گہرا صدمہ پہنچا۔انہوں نے سبھاش بوس کی ماں کو ایک تعزیتی پیغام بھیجا جس میں ہندوستان کے لیے سبھاش بوس کی قومی خدمات کا نہایت پرجوش انداز میں تذکرہ کیا گیا۔بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط تھی۔کرپس نے مجھ سے شکایت کی کہ انہیں یہ ہرگز توقع نہ تھی کہ گاندھی جی جیسا شخص سبھاش بوس کے بارے میں اس قسم کے جذبات کا اظہار کرے گا۔گاندھی جی عدم تشدد پر پختہ یقین رکھتے تھے جبکہ سبھاش بوس نے محوری طاقتوں کا کھلم کھلا ساتھ دیا تھا اور وہ اتحادیوں کو میدان جنگ میں شکست دینے کے لیے پرزور پروپیگنڈا کر رہے تھے۔

چینی التفات ......ایک وقفہ

صدر روز ویلٹ نے جنگ میں ہندوستان کی رضا کارانہ شرکت کے بارے میں جس تشویش کا اظہار کیا تھا اس کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ سپہ سالار اعظم چیانگ کائی شیک بھی ایسے ہی خیالات کا بار بار اظہار کر چکے تھے۔ وہ جنگ شروع ہوتے ہی یہ اصرار کرنے لگے کہ برطانیہ کو ہندوستان کے ساتھ سمجھوتا کر لینا چاہیے۔ پرل ہاربر پر جاپان کے حملے کے بعد ان کا اصرار بڑھ گیا، جاپان کی مداخلت میں اضافہ ہو گیا اور ریاستہائے متحدہ امریکا، برطانیہ، سوویت یونین اور فرانس کی طرح چین کا شمار بھی دنیا کی بڑی طاقتوں میں ہونے لگا۔ چیانگ کائی شیک برطانوی حکومت پر برابر یہ دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر لے۔ ان کی رائے تھی کہ جب تک ہندوستان رضا کارانہ طور پر جنگ میں شریک نہیں ہوتا، وہ ایسی امداد نہیں دے گا جسے فراہم کرنے کی وہ قدرت رکھتا ہے۔

جنگ چھڑنے سے تھوڑی دیر پہلے جواہر لعل نہرو جنوبی چین گئے تو چیانگ کائی شیک ان کے میزبان تھے۔ اس طرح ان دونوں کے درمیان قریبی تعلقات قائم ہو گئے اور چیانگ کائی شیک نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کے بارے میں براہ راست معلومات بھی حاصل کر لیں۔ جواہر لعل کے اس دورے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ چیانگ کائی شیک نے اپنا ایک مشن ہندوستان بھیجا اور مجھے انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ایک خط لکھا۔ اس مکتوب میں انہوں نے ہندوستانیوں کی امنگوں اور خواہشات سے مکمل ہمدردی ظاہر کی اور یہ تاثر دیا کہ وہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لیے مصالحت کرانے کو تیار ہیں۔ انہوں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ خود ہندوستان آ کر وائسرائے اور کانگریس کے لیڈروں سے ملاقات کر کے یہ معلوم کریں گے کہ آیا مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟ انہیں امید تھی کہ اس طرح ہندوستان کے قومی لیڈروں کو جنگ کی سرگرمیوں میں شریک کرنے کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

میں دہلی میں آصف علی کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ چیانگ کائی شیک فروری ۱۹۴۲ کے پہلے پندرھواڑے میں ہندوستان آنے والے ہیں۔ چند دنوں کے بعد مجھے مادام چیانگ کائی شیک کا یہ پیغام ملا کہ وہ بھی ساتھ آئیں گی۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد حکومت نے یہ اعلان کر دیا کہ سپہ سالار اعظم اور مادام چیانگ کائی شیک دہلی آ رہے ہیں اور وہ حکومت ہند کے مہمان ہوں گے۔

سپہ سالار اعظم اور مادام چیانگ کائی شیک ۹ فروری ۱۹۴۲ کو دہلی پہنچے۔ ان کی آمد کے دو دن بعد جواہر لعل اور میں نے ان سے ملاقات کی۔ ان کے ساتھ گفتگو کرنے میں ایک دشواری یہ تھی کہ وہ کوئی غیر ملکی زبان نہیں جانتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ترجمان تو تھا لیکن اس کی وجہ سے ہماری گفتگو سست اور قدرے رسمی ہوگئی۔

سپہ سالار اعظم نے تمہید کے طور پر ایک لمبی تقریر کی جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ایک محکوم قوم ان دو میں سے کسی ایک طریقے سے آزادی حاصل کرسکتی ہے۔ یا تو وہ غیر ملکی حکومت کو بزور شمشیر نکال باہر کرے یا پرامن ذرائع استعمال کرکے یہ مقصد حاصل کرلے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تھا کہ آزادی کی منزل تک بتدریج پہنچا جاسکتا ہے۔ ہم سیلف گورنمنٹ کی طرف قدم بہ قدم چل کر ہی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ کسی غیر ملکی یا جابر قومی حکومت کے خلاف جنگ میں صرف یہی دو طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔

سپہ سالار اعظم نے کہا کہ چین اس اصول کے مستند ہونے کی واضح مثال ہے۔ چین میں قومی تحریک کا آغاز ۱۹۱۱ میں ہوا لیکن آزادی حاصل ہونے تک اسے کئی مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ہندوستان کو بھی اسی راستے پر چلنا ہوگا۔ سپہ سالار اعظم کا کہنا تھا کہ اگر آزادی ایک ہلے میں حاصل نہ کی جاسکتی ہو تو ہندوستان کو اسے بتدریج حاصل کرنا چاہیے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کا برطانوی حکومت کے ساتھ مسلسل رابطہ رہا ہے اور وہ برطانوی وزیر اعظم کو تفصیلی پیغامات بھیج چکے ہیں۔ انہیں وزیر اعظم کا ایک جواب بھی ملا ہے اور انہیں یقین ہے کہ اگر ہندوستانیوں نے دانشمندی اور سیاسی تدبر سے کام لیا تو وہ جنگ کی صورت حال سے فائدہ اٹھا کر آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

پھر چیانگ کائی شیک نے مجھ سے پوچھا: ''ہندوستان کا صحیح مقام کہاں ہے؟ کیا ہندوستان نازی جرمنی کے ساتھ ہے یا جمہوری ریاستوں کے ساتھ؟''

میں نے جواب میں کہا مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اگر ہمارے راستے سے رکاوٹیں ہٹا دی جائیں تو میں ہندوستان کو جمہوری کیمپ میں شامل کرنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔

سپہ سالار اعظم نے اس کے بعد جذباتی انداز میں ہم سے ایک سوال پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ عالمگیر جنگ میں اصل مسئلہ آزادی یا بنی نوع انسان کی بڑی تعداد کی غلامی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ کیا کچھ داؤ پر لگا ہے، کیا یہ ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم کسی شرط پر اصرار کیے بغیر برطانیہ اور چین کا ساتھ دیں؟

میں نے جواب دیا کہ ہم جمہوری کیمپ میں شامل ہونے کے لیے بے چین ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم آزاد ہوں اور اپنے اختیار اور مرضی سے جمہوری ملکوں کے ساتھ شریک ہوں۔

سپہ سالار اعظم نے پھر کہا کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، ان کی رائے میں ڈومینین حیثیت اور

کامل آزادی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگر برطانوی حکومت سیلف گورنمنٹ کے ساتھ ڈومینین حیثیت کی پیشکش کرے تو دانشمندی یہ ہو گی کہ ہندوستان اسے قبول کر لے۔ انہوں نے مزید کہا مجھے معلوم ہے کہ جواہر لعل ان کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے اور وہ کامل آزادی چاہتے ہیں تاہم ہندوستان کا خیر خواہ ہونے کی بنا پر وہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہمیں اس قسم کی پیشکش کو مسترد نہیں کرنا چاہیے۔

جواہر لعل نے اردو میں مجھ سے کہا کہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اس سوال کا جواب مجھے دینا چاہیے۔

میں نے سپہ سالار اعظم کو بتایا کہ اگر برطانوی حکومت ہمیں ڈومینین حیثیت کی پیشکش کرے اور اس بات پر اتفاق کرے کہ جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے نمائندے آزادی اور ذمے داری کے احساس کے ساتھ کام کر سکیں گے تو کانگریس یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار نہیں کرے گی۔

اُسی وقت مادام چیانگ کائی شیک بھی وہاں آ گئیں اور ہمیں چائے کی دعوت دی۔ ان کی موجودگی کی وجہ سے گفتگو کرنا آسان ہو گیا کیونکہ انہوں نے امریکا میں تربیت حاصل کی تھی اور وہ بڑی روانی سے انگریزی بولتی تھیں۔

سپہ سالار اعظم نے کہا ظاہر ہے کہ جنگ کا بوجھ برطانوی حکومت کو اٹھانا پڑے گا اس لیے اس سے یہ توقع کرنا مناسب نہیں ہو گا کہ جنگ کے دوران وہ سو فی صد ذمے داریاں ہندوستان کو سونپ دے گی۔

میں نے جواب دیا کہ جنگ کے زمانے کے لیے ایک پلان تیار کیا جا سکتا ہے جو ہندوستانی لیڈروں اور برطانوی حکومت دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔ اصل سوال یہ ہے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کے مسئلے کو کس طرح طے کیا جائے گا؟ اگر برطانوی حکومت نے ہمیں ایک مرتبہ یہ یقین دہانی کرا دی کہ جنگ کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائے گا تو اس کے بعد ہمارے درمیان سمجھوتا ہو جائے گا۔

مادام چیانگ کائی شیک نے مجھ سے پوچھا کہ اگر برطانوی حکومت کو ہماری اس گفتگو سے آگاہ کر دیا جائے تو ہمیں اس پر اعتراض تو نہیں ہو گا؟

میں نے جواب میں کہا کہ کانگریس پبلک کے سامنے اپنا یہ موقف پیش کر چکی ہے اور اگر کسی کو ہمارے خیالات سے مطلع کر دیا جائے تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

سپہ سالار اعظم چیانگ کائی شیک کے دورے کی پوری مدت میں ہندوستانی حکومت ایک عجیب و غریب صورت حال سے دو چار رہی۔ اسے سپہ سالار اعظم اور کانگریسی لیڈروں کے درمیان اس قدر قریبی روابط پسند نہیں تھے کیونکہ ان سے ہندوستان کے اندر اور باہر یہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا کہ سپہ سالار اعظم ہمارے ساتھ ملاقات کے لیے ہندوستان آئے ہیں۔ اس کے برعکس سپہ سالار اعظم نے یہ بات پوری طرح واضح کر دی تھی کہ وہ جنگ

کی صورت حال پر نہ صرف وائسرائے اور کمانڈر انچیف بلکہ کانگریس کے لیڈروں کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے کے لیے ہندوستان آئے ہیں۔ ان حالات میں حکومت انہیں ہمارے ساتھ رابطہ کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔

سپہ سالار اعظم نے تاج محل دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی جس پر حکومت نے ان کے سرکاری دورے کے لیے ایک پروگرام ترتیب دیا اور اپنے منتخب کردہ افراد کو ان کے ہمراہ کر دیا۔ لیکن مادام چیانگ کائی شیک نے کہا کہ جواہر لعل کو ان کے ساتھ آگرہ جانا چاہیے چنانچہ انہیں بھی پارٹی میں شامل کر لیا گیا۔ یہ بات بھی ہندوستان کی حکومت کو ناگوار گزری۔

سپہ سالار اعظم دہلی سے کلکتہ گئے۔ بنگال کی حکومت نے علی پور کے وائسریگل لاج میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ چیانگ کائی شیک نے جواہر لعل کو اس کی اطلاع دی اور کہا مجھے امید ہے کہ آپ سے کلکتے میں پھر ملاقات ہوگی۔ جواہر لعل کلکتے گئے اور وہاں پھر دونوں میں بات چیت ہوئی۔ گاندھی جی اس وقت برلا پارک میں ٹھہرے ہوئے تھے اور سپہ سالار اعظم ان سے ملاقات کے لیے وہاں آئے۔ ان کی ملاقات کوئی دو گھنٹے تک جاری رہی جس میں مادام چیانگ کائی شیک نے ترجمان کے فرائض انجام دیے۔ گاندھی جی نے انہیں بتایا کہ انہوں نے جنوبی افریقا میں کس طرح ستیہ گرہ شروع کی تھی اور کس طرح انہوں نے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے عدم تشدد اور عدم تعاون کے حربے کو بتدریج اپنے مقصد کے مطابق ڈھالا تھا۔

چیانگ کائی شیک جب کلکتہ گئے تو میں وہاں موجود نہیں تھا۔ جواہر لعل نے بعد میں مجھے اس ملاقات کے بارے میں بتایا۔ جواہر لعل اس زمانے میں گاندھی جی کے ساتھ ہر معاملے میں اتفاق نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ گاندھی جی نے سپہ سالار اعظم کے ساتھ جس انداز میں گفتگو کی تھی اس کا ان پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑا تھا البتہ میرے لیے جواہر لعل کی رائے کو قبول کرنا مشکل تھا۔ ممکن ہے کہ چیانگ کائی شیک گاندھی جی کے موقف کے اثرات کو سمجھ نہ پائے ہوں اور گاندھی جی کی دلیلوں سے قائل نہ ہوئے ہوں لیکن مجھے یقین تھا کہ ان پر گاندھی جی کی اس جاذبیت اور کشش کا یقیناً اثر پڑا ہوگا جسے تمام غیر ملکی محسوس کرتے تھے۔

چیانگ کائی شیک نے روانگی سے پہلے برطانیہ عظمٰی سے پُر جوش اپیل کی کہ وہ جس قدر جلد ممکن ہو، ہندوستان کو سیاسی اختیارات دے دے لیکن یہ بات صاف ظاہر تھی کہ وہ وائسرائے یا برطانوی حکومت کو اس بات پر قائل نہ کر سکے کہ ہندوستان کی آزادی کو فوری طور پر تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔

پانچواں باب

کرپس مشن

جنگ کا بحران جوں جوں شدت اختیار کرتا گیا، لوگوں کو یہ امید ہو گئی کہ ہندوستان کے مسئلے کے بارے میں برطانوی حکومت کا رویہ تبدیل ہو جائے گا۔ یہ واقعی ہوا بھی اور اس کا نتیجہ ۱۹۴۲ کے کرپس مشن کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس مشن پر لکھنے سے پہلے ایک پچھلے واقعے کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جب جنگ چھڑنے کے فوراً بعد سر اسٹیفرڈ کرپس نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے میں ان کی کئی بار مجھ سے گفتگو ہوئی اور واقعہ یہ ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے دوران انہوں نے کئی دن وردھا میں گزارے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی جنگ میں شرکت کا سوال ہماری گفتگوؤں کا اہم موضوع بنا رہا۔

اس دورے میں سر اسٹیفرڈ کرپس نے ایک سے زیادہ مرتبہ کہا کہ جنگ کے متعلق گاندھی جی کے خیالات سب کو معلوم ہیں اور انہیں دیکھتے ہوئے برطانوی حکومت کے ساتھ کسی سمجھوتے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ میرے خیالات بھی سب لوگوں کو معلوم تھے اور انہیں گفتگو کی بنیاد بنایا جا سکتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا میں انہیں یہ یقین دہانی کرا سکتا ہوں کہ اگر برطانوی حکومت ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کو تسلیم کر لے تو ہندوستان کے عوام گاندھی جی کے بجائے میری رائے کو قبول کر لیں گے۔ میں نے انہیں بتایا کہ گو ہم سب گاندھی جی کی انتہائی عزت اور قدر کرتے ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر پوری توجہ دیتے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس خاص مسئلے پر کانگریس کے بیشتر ارکان اور ہندوستانی عوام کی اکثریت میری حمایت کرتی ہے اس لیے میں انہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر ہندوستان آزاد ہو گیا تو پورا ملک جنگ میں دل و جان سے برطانیہ کا ساتھ دے گا۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی دریافت کیا کہ کیا ایسی صورت میں ہندوستان کے لوگ جبری بھرتی کے لیے تیار ہوں گے؟ میں نے جواب دیا کہ ہم اس پر خوشی سے راضی ہو جائیں گے اور اس کا خیال رکھیں گے کہ جنگ کے سلسلے میں ہندوستان کی جدوجہد ہمہ گیر ثابت ہو۔

سر اسٹیفرڈ کرپس نے مجھے ایک یادداشت بھیجی جس میں ہماری گفتگوؤں کا خلاصہ اور برطانوی حکومت اور ہندوستانی عوام کے درمیان مفاہمت کی تجویزیں درج تھیں۔ ان کے مطابق برطانوی حکومت فوری طور پر یہ اعلان کرے گی کہ جنگ بند ہوتے ہی ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس اعلان میں یہ شق بھی شامل ہو گی کہ ہندوستان کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہو گا کہ وہ برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہے گا یا

نہیں؟ جنگ کے زمانے میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل نو کی جائے گی، اس کے ارکان کو وزیر کا درجہ حاصل ہوگا اور وائسرائے کی حیثیت ایک آئینی سربراہ کی ہوگی۔ اس طرح حقیقی معنوں میں حکومت کا اقتدار منتقل کر دیا جائے گا البتہ اقتدار کی ازروئے قانون منتقلی کی کارروائی لڑائی ختم ہونے کے بعد ہوگی۔

سر اسٹیفرڈ کرپس نے اپنی تجویز کے بارے میں میری رائے دریافت کی تو میں نے جواب دیا کہ میں اس اہم مسئلے پر محض فرضی تجویز کی روشنی میں کوئی قطعی یقین دہانی نہیں کرا سکتا البتہ میں انہیں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ اگر ایک مرتبہ ہندوستانی قوم کو پوری طرح اطمینان ہوگیا کہ برطانوی حکومت واقعی کچھ کرنا چاہتی ہے تو اختلافات کو دور کرنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالی جا سکتی ہے۔

سر اسٹیفرڈ کرپس ہندوستان سے غیر سرکاری مہمان کی حیثیت سے روس گئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد انہیں روس میں برطانیہ کا سفیر مقرر کر دیا گیا۔ بعض اوقات یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ سوویت یونین کو اتحادیوں کے قریب لانا انہیں کا کام تھا۔ جب جرمنی نے آخر کار روس پر حملہ کر دیا تو ہٹلر اور اسٹالن کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا واقعہ بڑی حد تک ان کی کوششوں کا نتیجہ سمجھا گیا۔ اس سے ان کا بہت شہرہ ہوا اور برطانیہ کی پبلک زندگی میں ان کا مرتبہ بہت بڑھ گیا۔ مجھے اس میں شبہ ہے کہ وہ سوویت پالیسی پر واقعی اثر انداز ہوئے تھے البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی عزت اور شہرت میں بہرحال اضافہ ہوگیا تھا اور جب وہ واپس برطانیہ گئے تو بعض لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ مسٹر چرچل کی جگہ برطانیہ کے وزیر اعظم بن جائیں گے۔

میں پہلے ہی اس جانب اشارہ کر چکا ہوں کہ صدر روز ویلٹ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ ہندوستان کے مسئلے کا تصفیہ کرے۔ پرل ہاربر پر حملے کے بعد امریکا کی رائے عامہ اس بات پر اور زیادہ اصرار کرنے لگی کہ جنگ کی سرگرمیوں میں ہندوستان کا رضا کارانہ تعاون حاصل کیا جائے۔ چرچل تک کو بھی ہندوستان کے التفات کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور انہوں نے ایک نیا قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح کرپس کو نئی پالیسی کا ترجمان منتخب کر لیا گیا۔

سوویت یونین سے واپسی کے بعد کرپس کی شہرت بام عروج پر پہنچ گئی۔ عام رائے یہ تھی کہ انہوں نے ماسکو کے نازک مشن کو نہایت سلیقے اور کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے چنانچہ ہندوستان کا مشن بھی انہیں سونپ دیا گیا۔ وہ کئی برسوں سے ہندوستان کے مسئلے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ مجھے بعض امور کی بنا پر یہ یقین ہے کہ انہوں نے چرچل کے سامنے وہ یادداشت بھی پیش کی تھی جو انہوں نے اپنے ہندوستان کے پچھلے دورے کے موقعے پر وردھا میں تیار کی تھی۔ میرا خیال ہے کہ چرچل نے اس یادداشت میں پیش کی جانے والی تجویزوں کو منظور نہیں کیا تھا البتہ کرپس نے یہ تاثر دیا کہ ان کی اسکیم منظور کر لی گئی ہے۔ چنانچہ وہ بخوشی

ہندوستان آنے پر آمادہ ہو گئے۔ میرے ساتھ ہونے والی پہلی گفتگوؤں کی روشنی میں وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ کانگریس کی طرف سے ان کی تجویزیں قبول کرنے کا قوی امکان ہے۔

بی بی سی سے کرپس مشن کو ہندوستان بھیجنے کا اعلان حیرت انگیز واقعہ تھا۔ اگرچہ لوگ مختلف قیاس آرائیاں کر رہے تھے لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ برطانوی حکومت کا اصل مقصد کیا ہے؟ ہندوستان میں یہ اعلان رات آٹھ بجے سنا گیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اخبارات نے میرا ردعمل دریافت کیا تو میں نے کہا:

میں اس وقت تک کوئی جواب نہیں دے سکتا جب تک مجھے اس پیشکش کی ٹھیک ٹھیک شرطوں کا علم نہیں ہوتا جو سر اسٹیفرڈ کرپس لا رہے ہیں۔ لیکن ایک پرانے دوست کی حیثیت سے میں ان کا خیر مقدم کروں گا اور جہاں تک ممکن ہو سکا، ان کے خیالات سے اتفاق کرنے کی کوشش کروں گا۔

اخبارات کی طرف سے دباؤ کے باوجود میں نے کوئی مزید رائے دے کر خود کو پابند کرنے سے انکار کر دیا۔

میں وردھا میں تھا جب وائسرائے نے مجھے ایک ٹیلی گرام بھیجا کہ برطانیہ کی وار کیبنٹ نے سر اسٹیفرڈ کرپس کو ایک مشن پر ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے اور مجھے دہلی آ کر ہندوستان کے مسئلے کو طے کرنے کی غرض سے ان تجویزوں پر گفتگو کرنی چاہیے جو وہ اپنے ساتھ لا رہے ہیں۔ میں نے یہ دعوت قبول کرتے ہوئے وائسرائے کو آگاہ کر دیا۔

سر اسٹیفرڈ کرپس نے ہندوستان آنے سے پہلے وائسرائے کو لکھا تھا کہ وہ کانگریسی لیڈروں کے علاوہ مسلم لیگ کے رہنماؤں اور والیان ریاست اور ہندو مہاسبھا کے نمائندوں اور سندھ کے اس وقت کے وزیراعلیٰ خان بہادر اللہ بخش کے ساتھ بھی ملاقات کریں گے۔ خان بہادر اللہ بخش کو حال ہی میں دہلی میں منعقد ہونے والے قوم پرست مسلمانوں کے کنونشن کی صدارت کرنے کے بعد اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ میں اس کانفرنس میں شریک نہ ہوا البتہ میں نے پس پردہ اس کے انتظامات میں مدد کی تھی۔ یہ کانفرنس بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور ہندوستان کے ہر حصے کے ۱۴۰۰ مندوب اس میں شرکت کے لیے دہلی آئے۔ یہ اجلاس اس قدر موثر تھا کہ برطانوی اور اینگلو انڈین اخبارات، جو عام طور پر قوم پرست مسلمانوں کی اہمیت کو کم کر کے دکھانے کی کوشش کرتے تھے، اسے نظر انداز نہ کر سکے۔ وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اس کانفرنس کے انعقاد سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسٹیٹسمین اور ٹائمز آف انڈیا تک نے اس کانفرنس پر نمایاں مضمون شائع کیے۔

ایک دلچسپ اور غور طلب بات یہ ہے کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی اس قدر زیادہ جماعتوں کے نمائندوں کے ساتھ صلاح مشورہ کیوں کرنا چاہتی تھی؟ ہر شخص جانتا تھا کہ کانگریس ہندوستانی عوام کی اکثریت

کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کے ایک طبقے میں خاصا اثر و رسوخ حاصل کر چکی تھی لیکن اس کی اصل وجہ حکومت کا تعاون اور حمایت تھی۔ جہاں تک دوسری جماعتوں کا تعلق ہے تو وہ سرے سے حکومت کی تخلیق تھیں۔ اگر برطانوی حکومت کانگریس کے ساتھ تصفیہ کر لیتی تو یہ جماعتیں اس کی مخالفت کی جرأت نہ کر سکتی تھیں۔ ایسی تمام پارٹیوں کو سر اسٹیفرڈ کرپس سے ملاقات کی دعوت دینے کا واحد مقصد ان جماعتوں کو کانگریس کے خلاف استعمال کرنا تھا۔ برطانوی حکومت بیرونی دنیا کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ ہندوستان میں کئی سیاسی جماعتیں موجود ہیں اور یہ کہ کانگریس پورے ملک کی نمائندگی نہیں کرتی۔ انگریز شاید یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اس طرح وہ کانگریس پر کچھ دباؤ ڈال سکیں گے۔ کرپس نے اسی تناظر میں دوسری ہندوستانی جماعتوں کے لیڈروں کے ساتھ ملاقات کے دوران نیشنلسٹ مسلم کنونشن کے صدر کو بھی مذاکرات کی دعوت دے دی۔

میں نے سر اسٹیفرڈ سے اُن کے نئی دہلی پہنچنے کے فوراً بعد ملاقات کی۔ ہماری پہلی ملاقات ۲۹ مارچ ۱۹۴۲ کو سہ پہر تین بجے ہوئی۔ سر اسٹیفرڈ نے ایک بیان تیار کیا تھا جس میں ان کی تجویزیں درج تھیں۔ یہ بیان ضمیمہ ۲ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بیان میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ وہ ان تجویزوں پر مزید گفتگو اور اس سلسلے میں وضاحت طلب نکات کی تشریح کرنے کو تیار ہیں۔ میں نے جب یہ بیان پڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ وائسرائے کی نئی ایگزیکٹو کونسل کے بارے میں ایک تجویز ہے جس کی رو سے تمام موجودہ ارکان استعفا دے دیں گے اور اس کے بعد نیشنل کانگریس اور دوسری نمائندہ تنظیموں سے یہ درخواست کی جائے گی کہ وہ اپنے نامزد نمائندوں کے نام بھیجیں تاکہ ان افراد پر مشتمل نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دی جا سکے۔ یہ کونسل جنگ کے زمانے میں کام کرے گی اور برطانوی حکومت باضابطہ طور پر یہ عہد کرے گی کہ جیسے ہی جنگ بند ہوئی، ہندوستان کی آزادی کے سوال پر کارروائی شروع کر دی جائے گی۔

اس تجویز کا خلاصہ گویا یہ تھا کہ موجودہ ایگزیکٹو کونسل کے بجائے، جس میں انگریز ارکان کی اکثریت تھی، صرف ہندوستانیوں پر مشتمل ایک نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دی جائے گی۔ انگریز افسر سیکرٹریوں کی حیثیت سے کام کریں گے لیکن وہ کونسل کے ممبر نہیں ہوں گے البتہ نظام حکومت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

میں نے سر اسٹیفرڈ سے دریافت کیا کہ کونسل میں وائسرائے کی حیثیت کیا ہوگی؟ سر اسٹیفرڈ نے جواب دیا کہ وائسرائے انگلستان کے بادشاہ کی طرح ایک آئینی سربراہ کی حیثیت سے کام کرے گا۔ میں نے اس خیال سے کہ شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ رہے، اُن سے اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک دستوری سربراہ کی حیثیت سے وائسرائے کونسل کے مشورے کے مطابق عمل کرنے کا پابند ہوگا۔ سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ ان کا منشا یہی ہے۔ میں نے پھر کہا کہ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اختیارات کسے حاصل ہوں

گے، مجوزہ کونسل کو یا وائسرائے کو؟ سر اسٹیفرڈ نے دوبارہ کہا کہ برطانوی کابینہ کی طرح اختیارات کونسل ہی کو حاصل ہوں گے۔ اس کے بعد میں نے پوچھا کہ اس تناظر میں انڈیا آفس کی حیثیت کیا ہوگی؟ سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ یہ ایک تفصیلی معاملہ ہے جس پر انہوں نے ابھی تک غور نہیں کیا لیکن وہ مجھے یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں کانگریس کے خیالات کا پورا لحاظ کیا جائے گا۔ سر اسٹیفرڈ نے کچھ سوچ کر مزید کہا کہ انڈیا آفس بدستور موجود رہے گا اور وزیر ہند بھی کام کرتا رہے گا البتہ اس کی حیثیت کسی دوسری ڈومینین کے وزیر کی سی ہوگی۔

میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ جنگ چھڑنے کے فوراً بعد ہندوستان بار بار یہ پیشکش کرتا رہا ہے کہ اگر اس کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ جنگ میں شرکت کے لیے تیار ہے۔ یہ انگریزوں کا قصور تھا کہ انہوں نے اس پیشکش سے فائدہ نہیں اٹھایا اور وہی اس کے ذمے دار ہیں کہ ہندوستان جنگ میں اور زیادہ حصہ نہیں لے سکا۔ سر اسٹیفرڈ نے بار بار کہا کہ حالات نے جو رخ اختیار کیا اس پر انہیں افسوس ہے لیکن وہ اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ اگر برطانوی کابینہ کی جانب سے کی جانے والی پیشکش کو قبول کر لیا گیا تو آئندہ یہ حالات نہیں ہوں گے۔ اس طرح ہماری پہلی ملاقات ختم ہوئی تو کیفیت حوصلہ افزا تھی۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۲۹ مارچ ۱۹۴۲ کو طلب کیا گیا اور یہ اجلاس ۱۱ اپریل تک جاری رہا۔ ورکنگ کمیٹی کا یہ طویل ترین اجلاس تھا جس میں توقع کے مطابق تمام ارکان نے اپنے اپنے انداز اور نقطہ نظر سے ان تجویزوں پر اظہار خیال کیا۔

گاندھی جی پہلے دن سے ان تجویزوں کو قبول کرنے کے خلاف تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ انہیں ان تجویزوں پر اعتراض تھا بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ سے نفرت کرتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہیں ہر ایسی بات سے خلقی اور اٹل عداوت تھی جو ہندوستان کو جنگ میں الجھا دیتی۔ ایسی ہر تجویز، خواہ وہ ہندوستان کے لیے کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو، ان کے مزاج کے خلاف تھی جس کے نتیجے میں ہندوستان کو جنگ میں شرکت کرنا پڑتی۔ وہ اس پیشکش کے آخری حصے کو بھی پسند نہیں کرتے تھے جس میں کہا گیا تھا کہ جنگ کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کو فرقہ وارانہ مسئلہ طے کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

اس مشن کے دوران جب گاندھی جی پہلی مرتبہ کرپس سے ملے تو کرپس نے انہیں اپنی اس یادداشت کے بارے میں یاد دلایا جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ کرپس نے کہا کہ یہ یادداشت گاندھی جی سمیت کانگریسی لیڈروں کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد تیار کی گئی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جنگ کے دوران ایگزیکٹو کونسل کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں گے اور جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس وقت وہ جو تجویزیں لائے ہیں وہ دراصل وہی ہیں جو یادداشت میں درج تھیں۔

گاندھی جی نے کہا کہ انہیں یادداشت کے بارے میں کچھ یاد نہیں ہے۔ انہیں پچھلے دورے میں کرپس کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے سلسلے میں صرف اتنا یاد ہے کہ ان کے ساتھ ترکاریاں کھانے کے فلسفے پر تبادلہ خیال ہوا تھا۔ کرپس نے جواب دیا کہ انہیں بہت افسوس ہے کہ غذا کے بارے میں ہونے والی باتیں تو گاندھی جی کے ذہن میں محفوظ رہیں لیکن وہ ان تجویزوں کو بھول گئے جو انہوں نے خود گاندھی جی کے ساتھ مشورے کے بعد نہایت احتیاط سے تیار کی تھیں۔

گفتگو کے دوران گاندھی جی اور کرپس ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے رہے مگر اس کے ساتھ کبھی کبھی دوستانہ انداز میں جھڑپ بھی ہو جاتی۔ گاندھی جی نے کہا کہ کرپس کی تجویزیں قطعی اور آخری شکل میں پیش کی گئی ہیں اور ان پر بات چیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ انہوں نے کرپس کو ہنستے ہوئے خبردار کیا کہ میں ان کو بہت ڈھیل دے رہا ہوں مگر انہیں ہوشیار رہنا چاہیے۔ کرپس نے الٹ کر جواب دیا کہ انہیں معلوم ہے کہ میں انہیں اتنی ڈھیل دے رہا ہوں کہ ان کی ہلاکت کا سامان ہو جائے۔

جواہر لعل یورپ اور ایشیا میں رونما ہونے والے واقعات پر سخت پریشان تھے اور انہیں جمہوری ملکوں کے مستقبل کی بہت فکر تھی۔ فطری طور پر ان کی ہمدردیاں جمہوری ملکوں کے ساتھ تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے، ان کی مدد کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا رجحان کرپس کی تجویزوں کو منظور کرنے کی طرف تھا مگر اس وقت ہندوستان میں انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ وہ اپنی بات صاف صاف اور اصرار کے ساتھ نہیں کہہ سکتے تھے البتہ میں ان کے دل کی بات کو، جسے وہ زبان پر نہیں لا سکتے تھے، اچھی طرح سمجھتا تھا اور مجھے ان کے نقطہ نظر سے ہمدردی تھی۔

جہاں تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کا تعلق ہے، ان میں سے بیشتر ارکان جنگ کے بارے میں کوئی پختہ رائے نہیں رکھتے تھے۔ ماسوائے راج گوپال آچاری کے ان سب کی نظریں رہنمائی کے لیے گاندھی جی کی طرف اٹھتی تھیں۔ وہ پوری طرح کرپس کی تجویزوں کو منظور کرنے کے حامی تھے لیکن ان کی رائے کا کچھ زیادہ وزن نہیں تھا۔ یہ افسوس کی بات تھی کہ کانگریس کے حلقوں میں انہیں محض ایک اعتدال پسند شخص تصور کیا جاتا تھا۔

ورکنگ کمیٹی دو دن تک ان تجویزوں پر بحث کرتی رہی لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ اس پر میں نے محسوس کیا کہ مجھے سر اسٹیفرڈ سے کئی نکات کی مزید وضاحت اور ان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ بنیادی سوال ایگزیکٹو کونسل کے اختیارات سے متعلق تھا۔ سر اسٹیفرڈ نے یہ تجویز کیا تھا کہ کونسل کو قائم رکھا جائے البتہ اسے اس طرح سے تشکیل دیا جائے کہ وہ سیاسی جماعتوں کے منتخب کردہ

ہندوستانی ارکان پر مشتمل ہو۔ انہوں نے زبانی طور پر مجھے یقین دلایا تھا کہ وائسرائے کی حیثیت محض ایک آئینی سربراہ کی سی ہوگی۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس نکتے کو صحیح طور پر معاہدے میں شامل کیا جائے چنانچہ میں نے یکم اپریل ۱۹۴۲ کو کرپس کے ساتھ دوبارہ ملاقات کی۔

سر اسٹیفرڈ کے ساتھ یہ ملاقات فیصلہ کن تھی۔ ہم کوئی تین گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ پہلی ملاقات کے بعد سے اس وقت تک سر اسٹیفرڈ کے نقطہ نظر میں بنیادی تبدیلی آگئی ہے۔ اب ان کے جوابات کی کیفیت پہلی ملاقات کے مقابلے میں بالکل مختلف تھی۔ جب میں نے انہیں ایگزیکٹو کونسل کی حیثیت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا مجھے امید ہے کہ کونسل جنگ کے دوران بھی کابینہ کی طرح کام کرے گی۔ میں نے دریافت کیا کہ آیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کونسل تمام مسئلوں کو اکثریتی رائے کے مطابق طے کرے گی اور یہ کہ اس کے فیصلے حتمی ہوں گے؟ اس پر کرپس نے مبہم سا جواب دیا۔ وہ صاف صاف یہ نہیں کہتے تھے کہ آخری فیصلہ وائسرائے کرے گا البتہ وہ جو کچھ کہتے تھے اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ کونسل کو فیصلے کرنے کی مکمل اور غیر محدود آزادی نہیں ہوگی۔ انہوں نے یہ کہہ کر وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ قانون میں تبدیلی کیے بغیر وائسرائے کی موجودہ حیثیت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا لیکن انہوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ قانون کے اعتبار سے صورت حال کچھ بھی ہو، وائسرائے کا طرز عمل ایک دستوری سربراہ کا سا ہوگا۔

میں نے سر اسٹیفرڈ کو یاد دلایا کہ پہلی ملاقات کے وقت اس معاملے میں ان کی رائے زیادہ واضح اور قطعی تھی۔ وہ بار بار مجھ پر زور دیتے اور یقین دلاتے رہے کہ ان کے بنیادی موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور یہ کہ اس وقت وہ جس مفہوم کو بیان کر رہے تھے، وہ موجودہ موقف کے مطابق تھا۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ پچھلی ملاقات میں انہوں نے میرے سوال کے جواب میں واضح طور پر کہا تھا کہ ایگزیکٹو کونسل ٹھیک کابینہ کی طرح کام کرے گی لیکن آج وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ قانونی پوزیشن جوں کی توں رہے گی اور وہ یہ کہہ کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ انہیں امید ہے کہ کونسل ایک کابینہ کی طرح کام کرے گی۔ میں نے پہلی ملاقات میں جو تاثر قائم کیا وہ کچھ اور تھا۔ میں نے انہیں یہ بھی یاد دلایا کہ انڈیا آفس اور ہندوستان کے وزیر خارجہ کے بارے میں ہماری کیا گفتگو ہوئی تھی۔ اس وقت انہوں نے یہ کہا تھا کہ وزیر ہند دولت مشترکہ کے وزیر کی طرح کام کرے گا لیکن اب وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ انڈیا آفس یا وزیر ہند کی حیثیت تبدیل کرنے کے لیے پارلیمنٹ کے ایک نئے قانون کی ضرورت ہوگی۔ کرپس نے کہا کہ ان کے خیال میں انڈیا آفس عملاً نئی بنیاد پر کام کرے گا البتہ وزیر ہند کی حیثیت تبدیل کر کے اسے دولت مشترکہ کے وزیر کا درجہ دینے کے لیے قانون نافذ کرنے کی راہ میں عملی دشواریاں پیش آئیں گی۔

اس کے بعد میں نے جنگ کے خاتمے پر ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرنے کا سوال اٹھایا۔ کرپس نے کہا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کے مسئلے پر ایک نئے زاویے سے غور کیا جائے گا اور اسے اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایک دوست کی حیثیت سے وہ یہ مشورہ دیں گے کہ ہم نئے سوالات کر کے نئی دشواریاں پیدا نہ کریں۔ ہندوستان کو چاہیے کہ وہ ان تجویزوں کو ان کی ظاہری قدر کا لحاظ کر کے قبول کرے اور آگے کی جانب بڑھے۔ انہیں اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ اگر ہندوستان نے جنگ کے دوران برطانیہ سے مکمل تعاون کیا تو جنگ کے بعد اس کی آزادی یقینی ہے۔

ہندوستان کے اندر اور باہر اس بارے میں بہت خیال آرائیاں ہوئی ہیں کہ سر اسٹیفرڈ کرپس نے پہلی اور دوسری ملاقات کے درمیانی عرصے میں اپنا موقف کیوں تبدیل کر لیا تھا؟ اس کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ سر اسٹیفرڈ کو یہ امید تھی کہ وہ اپنی دل نشین باتوں اور خوشگوار انداز سے کانگریس کو بنیادی صورت حال میں کوئی تبدیلی کیے بغیر اپنی تجویزیں قبول کرنے پر آمادہ کر لیں گے۔ انہوں نے شروع میں اچھا تاثر پیدا کرنے کی غرض سے واضح انداز میں یقین دہانی کرا دی لیکن جب ان کی تجویزوں پر تفصیل کے ساتھ جرح کی گئی تو انہوں نے یہ محسوس کیا کہ انہیں محتاط طرز عمل اختیار کرنا چاہیے اور ایسی امیدیں پیدا کرنے سے گریز کرنا چاہیے جنہیں پورا کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ایک اور سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقفے کے دوران ہندوستان کی حکومت کے داخلی حلقوں نے ان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ وائسرائے اور دوسرے متعلقہ حکام انہیں مسلسل اپنے گھیرے میں لیے رکھتے۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کے خیالات کی پرچھائیاں کرپس پر پڑ گئی ہوں۔ تیسرا امکانی سبب یہ ہوسکتا ہے کہ اس عرصے میں دہلی اور لندن کے درمیان پیغامات کا تبادلہ ہو گیا اور برطانوی وار کیبنٹ نے انہیں نئی ہدایات بھیج دیں جس سے سر اسٹیفرڈ یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر وہ بہت آگے نکل گئے تو ساری کارروائی مسترد کر دی جائے گی۔

اصل سبب کیا تھا؟ یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جن عوامل کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک کا صورت حال کو تبدیل کرنے میں کچھ نہ کچھ عمل دخل ہو۔ کرپس اصل میں ایک وکیل تھے اس لیے ان کا میلان اس طرف تھا کہ واقعات کو ایسی امید افزا شکل میں پیش کیا جائے جو حقیقت حال کو دیکھتے ہوئے مبالغہ آمیز ہو۔ وہ معاملات کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھنے اور اپنے مدمقابل پر اثر ڈالنے کے لیے صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے عادی تھے۔ جب ہم نے انہیں ان کے قول کا پابند کرنا چاہا تو وہ مجبوراً پیچھے ہٹنے لگے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ماسکو میں بھی انہوں نے کبھی کبھی ایسی باتیں کیں جن کے وہ مجاز نہیں تھے۔ اس واقعے کی بہتر انداز میں اس طرح توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ وہ انگریز تھے اور انگریز تحریری معاہدوں کے مقابلے

میں عمل اور روایات پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ خلوص دل کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہوں کہ جب ایک مرتبہ ان کی تجویزیں مان لی جائیں گی تو جن دستوری رسموں کی جانب انہوں نے پہلی ملاقات میں اشارہ کیا تھا وہ بھی پایہ تکمیل تک پہنچ جائیں گی۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ اس ضمن میں کوئی رسمی یقین دہانی نہیں کرا سکتے تھے چنانچہ جب ہم نے ان سے باضابطہ یقین دہانی کا مطالبہ کیا تو انہیں اپنے پچھلے موقف سے دستبردار ہونا پڑا۔

سر اسٹیفرڈ کرپس کے ساتھ میری دوسری ملاقات کے نتائج پر غور کے لیے ۲ اپریل کی صبح کانگریس ورکنگ کمیٹی کا دوبارہ اجلاس منعقد ہوا تو مجھے حالات کی ایک نئی تصویر پیش کرنا پڑی۔ میں نے زیر بحث مسائل کا خلاصہ اس طرح پیش کیا:

۱- اب مجھے یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ برطانوی حکومت جنگ کے دوران ہندوستان کو آزادی دینے پر آمادہ نہیں۔ انگریز یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان کو آزادی دینا خطرے سے خالی نہیں اس لیے وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں۔

۲- جنگ کی صورت حال خاص طور پر امریکی دباؤ کی وجہ سے انگریزوں کے رویے میں معمولی تبدیلی رونما ہوئی ہے یہاں تک کہ چرچل کی حکومت اب یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ ہندوستان کو رضاکارانہ بنیاد پر جنگ میں تعاون کا موقع دینا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خالص ہندوستانی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دینے اور اسے زیادہ سے زیادہ اختیارات تفویض کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے تاہم قانونی اعتبار سے کونسل کو کابینہ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی اور وہ صرف کونسل ہی رہے گی۔

۳- یہ ممکن تھا کہ وائسرائے عملاً ایک فراخدلانہ رویہ اختیار کر کے کونسل کے فیصلوں کو تسلیم کر لیتا البتہ کونسل کی حیثیت اس کے ماتحت ادارے کی رہتی اور آخری فیصلہ کرنے کی ذمے داری اسی پر ہوتی نہ کہ کونسل پر۔

۴- اس سے یہ نتیجہ نکلتا تھا کہ ورکنگ کمیٹی نے جو بنیادی سوال اٹھایا تھا کہ آخری فیصلہ کرنے کا اختیار کس کو ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اختیار وائسرائے کے پاس ہوگا۔

۵- جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے، ممکن ہے کہ کرپس کے بیان کے مطابق برطانیہ ہندوستان کے مسئلے پر ایک نئے زاویے سے غور کرے البتہ یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ لڑائی بند ہونے کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔

۶- یہ قوی امکان موجود ہے کہ جنگ کے بعد مسٹر چرچل کی کنزرویٹو حکومت کی جگہ ایک نئی حکومت قائم ہو جائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نئی حکومت ہندوستان کے مسئلے پر افہام و تفہیم کے جذبے کے ساتھ زیادہ ہمدردانہ طریقے سے غور کرے لیکن ظاہر ہے کہ یہ امکانی صورت حال کرپس کی تجویزوں کا حصہ نہیں بن سکتی۔

۷۔اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر کانگریس نے کرپس کی پیشکش کو قبول کرلیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جنگ کے بعد بھی ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں کوئی واضح یقین دہانی نہیں کرائی جائے گی۔

ہم نے کرپس مشن کے موقعے پر بی بی سی پر کیے جانے والے اعلان کی روشنی میں ان نکات پر غور کیا۔ اس وقت یہ صراحت کے ساتھ کہا گیا تھا کہ اب ہندوستان کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ کرپس نے بھی پہلی ملاقات میں اسی انداز میں گفتگو کی تھی لیکن جیسے جیسے گفت وشنید کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا، اعتماد اور امید کی کیفیت ختم ہوتی گئی۔

اس کیفیت اور فضا کے تبدیل ہونے کے کئی اور اسباب بھی تھے۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ سراسٹیفرڈ کرپس نے ہندوستان آنے سے پہلے وائسرائے سے کہا تھا کہ وہ مسٹر اللہ بخش سمیت مختلف سیاسی لیڈروں کو مذاکرات کی دعوت دیں تاہم ہندوستان پہنچنے کے بعد کرپس نے غالباً وائسریگل ہاؤس کے اثر کی وجہ سے اپنا نقطہ نظر تبدیل کرلیا۔ اللہ بخش وائسرائے کی دعوت پر دہلی آئے اور وہ سراسٹیفرڈ کے ساتھ ملاقات کا انتظار کر رہے تھے لیکن ملاقات کا وقت مقرر نہ ہوسکا۔ اس سے بڑی بدنما صورت حال پیدا ہوگئی چنانچہ میں نے کرپس کے ساتھ بات کی اور انہوں نے کہا کہ وہ بہت جلد اللہ بخش کو ملاقات کی دعوت دیں گے۔ اس وعدے کے باوجود اللہ بخش کو کوئی دعوت نہ دی گئی۔ اس پر اللہ بخش غصے میں آگئے ،ورانہوں نے کہا کہ وہ دہلی میں زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ میں نے یہ سن کر سراسٹیفرڈ کے ساتھ صاف صاف بات کی اور ان سے کہا کہ ان کے اس رویے سے نہ صرف اللہ بخش بلکہ مسلمانوں کی اس مضبوط تنظیم کی بھی توہین ہوئی ہے جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر کرپس کو کسی نکتے پر شک وشبہ تھا تو انہیں اللہ بخش کو ہرگز مدعو نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن چونکہ اللہ بخش کو دعوت نامہ جاری کردیا گیا تھا اس لیے ان کے ساتھ مناسب طریقے سے ملاقات کرنی چاہیے تھی۔ میری مداخلت کے نتیجے میں اگلے روز سراسٹیفرڈ اور اللہ بخش کی ملاقات ہوگئی۔ یہ ملاقات صرف ایک گھنٹے تک جاری رہی اور اس میں عمومی معاملوں پر تبادلہ خیال ہوا۔ کرپس نے اصل مسئلے کا ذکر نہ چھیڑا۔

اس واقعے سے مجھے بہت ناگواری ہوئی اور میں نے یہ محسوس کیا کہ مشکل سیاسی مسئلوں کو طے کرنے کا یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں کرپس کا یہ طرز عمل ایک مدبر سیاستدان جیسا نہیں تھا۔ ہندوستان کی حکومت سے صلاح مشورے کے بغیر دعوت نامے جاری نہیں ہونے چاہئیں تھے۔ اگر کرپس کو کسی دشواری کا سامنا تھا تو انہیں چاہیے تھا کہ وہ اللہ بخش کو صاف صاف بتا دیتے اور انہیں خواہ مخواہ دہلی میں انتظار نہ کراتے۔

ایک اور واقعے نے بھی میری طبیعت کو بدمزہ کردیا۔ جیسے ہی برطانوی کابینہ کی تجویزیں پریس کو جاری کی گئیں، ہندستان کے اخبارات میں ان پر شدید نکتہ چینی شروع ہوگئی۔ ان میں وہ اخبارات سب سے آگے تھے

جن میں عام طور پر کانگریس کا نقطہ نظر پیش کیا جاتا تھا۔ دہلی کا اخبار ہندوستان ٹائمز اظہار رائے میں بلند آہنگ تھا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ابھی جاری تھا کہ کرپس نے مجھے ایک خط بھیجا جس میں انہوں نے کہا کہ اگرچہ ہندو پریس نے پیشکش کا خیر مقدم نہیں کیا، اس کے باوجود انہیں امید ہے کہ میں ان کی تجویز پر وسیع تناظر میں غور کروں گا۔ مجھے ہندو اخبارات کا حوالہ بہت بے تکا لگا۔ مجھے یہ گمان بھی ہوا کہ شاید انہوں نے ہندو اخبارات پر اس لیے زور دیا ہے کیونکہ میں مسلمان ہوں۔ اگر انہیں اخبارات میں شائع ہونے والے تبصرے پسند نہیں آئے تھے تو وہ آسانی کے ساتھ ہندوستانی اخبارات یا بعض اخبارات کا حوالہ دے سکتے تھے۔ میں نے جواب میں لکھا کہ مجھے ان کے ہندو پریس کے حوالے سے بڑی حیرت ہوئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی پریس کے مختلف طبقوں میں خطِ امتیاز کھینچنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی صرف ہندوستان کے نقطہ نظر سے تجویزوں پر غور کرے گی اور وہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے رائے عامہ کے تمام طبقوں کے خیالات کا لحاظ رکھے گی۔

۲۹ مارچ سے ۱۱ اپریل تک ورکنگ کمیٹی کے طویل اجلاس کے دوران میں تقریباً سارا دن کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ رہتا۔ ۲ اپریل کے بعد کرپس کے ساتھ ہر شام کو میری ملاقات ہوتی۔ بعض میٹنگوں میں جواہر لعل بھی میرے ہمراہ ہوتے۔ مجھے جیسے ہی کرپس کے مجوزہ دورے کی اطلاع ملی، میں نے ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان کے نام ایک گشتی مراسلہ بھیجا کہ کسی ممبر کو کرپس کے ساتھ علیحدہ ملاقات نہیں کرنی چاہیے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کی ملاقاتوں سے بعض اوقات غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ میں نے خط میں مزید لکھا کہ اگر ورکنگ کمیٹی کا کوئی رکن کسی خاص مسئلے پر گفتگو کرنے یا پرانے تعلقات کی خاطر کرپس کے ساتھ ملاقات کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلے مجھے اپنے ارادے سے آگاہ کر دے۔

کرپس نے مجھ سے شکایت کی کہ اس سے پہلے جب وہ ہندوستان آئے تھے تو انہوں نے ورکنگ کمیٹی کے کئی ارکان کے ساتھ ملاقات کی تھی لیکن اس مرتبہ انہیں معلوم ہوا ہے کہ میں نے ان پر پابندی لگا دی ہے اور کوئی ممبر اُن سے ملاقات کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اگر کسی سماجی تقریب میں بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ کانگریس کے صدر کو اس پر اعتراض ہو سکتا ہے۔

میں نے کرپس کو بتایا کہ جب کوئی ذمے دار تنظیم حکومت کے ساتھ مذاکرات کر رہی ہو تو یہ مذاکرات صرف اس کے مسلمہ نمائندوں کے ذریعے ہونے چاہئیں۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ حکومت کے ساتھ بات چیت کانگریس کا صدر کرے گا اس لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ارکان اپنے طور پر گفتگو کریں البتہ اگر کرپس کسی وجہ سے ورکنگ کمیٹی کے کسی ممبر کے ساتھ ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو میں خوشی سے اس کا انتظام کر دوں گا۔

کرپس نے کہا کہ وہ بھولا بھائی ڈیسائی کے ساتھ خصوصی طور پر ملنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کے پچھلے دورے میں وہ بھولا بھائی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ انہوں نے کھادی کے اس سوٹ کی طرف، جو اُس وقت وہ پہنے ہوئے تھے، اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا: "یہ کپڑے جو میں نے پہن رکھے ہیں، یہ بھی بھولا بھائی ڈیسائی نے مجھے تحفے میں دیے تھے۔"

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں کرپس کی پیشکش پر بحث جاری رہی۔ گاندھی جی اسے منظور کرنے کے مخالف اور جواہر لعل اس کے حامی تھے۔ مجھے ان دونوں کی رائے سے اختلاف تھا۔ گاندھی جی جنگ سے مخالفت کی بنا پر ان تجویزوں کے خلاف جبکہ جواہر لعل جمہوری ریاستوں کے ساتھ وابستگی کی وجہ سے ان کے حامی تھے۔ مارشل چیانگ کائی شیک نے ہندوستانیوں سے جو اپیل کی تھی، جواہر لعل پر اُس کا بھی اثر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کے موقف پر سودے بازی کیے بغیر ان تجویزوں کو قبول کر لینا چاہیے۔

جہاں تک میرا تعلق تھا، میرے پاس ان تجویزوں کو پرکھنے کے لیے صرف یہی ایک کسوٹی تھی کہ آیا برطانوی حکومت کی پیشکش قبول کرنے سے ہندوستان آزاد ہو جائے گا؟ اگر یہ تجویزیں آزادی کا پیش خیمہ ہیں تو ہمیں ذہنی تحفظات کے بغیر ان تجویزوں کو مان لینا ورنہ انہیں مسترد کر دینا چاہیے۔ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ میرے نزدیک واحد معیار تھا۔

مذاکرات کے دوران میں مسلسل یہ کوشش کرتا رہا کہ کرپس کی پیشکش کو ایسی شکل دی جائے جس میں اس دستوری روایت کو یقینی بنایا جا سکے کہ ایگزیکٹو کونسل عملاً ایک کابینہ کی حیثیت سے کام کرتی رہے اور وائسرائے اس کا دستوری سربراہ ہو۔ اگر اس مسئلے کے بارے میں ہمیں اطمینان ہو جائے تو ہمیں یہ پیشکش قبول کر لینی چاہیے اور جنگ کے دوران قانون کے ذریعے اقتدار کی منتقلی پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں، ان مذاکرات نے دو ہفتے تک طول کھینچا۔ دن میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوتا، شام کو میں کرپس کے ساتھ ملاقات کرتا اور اگلی صبح ورکنگ کمیٹی میں اپنی گفتگو کے بارے میں رپورٹ پیش کرتا۔ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے دوران کرپس کئی مرتبہ وائسرائے سے تبادلہ خیال کرتے رہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس عرصے میں کرپس نے چرچل کے ساتھ تین مرتبہ صلاح مشورہ کیا۔ ممکن ہے انہوں نے کابینہ کے دوسرے ارکان کے ساتھ بھی مشورہ کیا ہو۔

کرپس مسلسل یہ اصرار کرتے رہے کہ جنگ کے زمانے میں جنگ کے انتظامی لوازمات کو ہی فیصلہ کن عنصر کی حیثیت دی جائے۔ جنگ اب ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جس میں صرف جغرافیائی صورت حال کی وجہ سے ہندوستان پر بہت بھاری ذمے داری عائد ہوتی تھی اس لیے یہ ضروری تھا کہ جنگ کے معاملے

میں ایگزیکٹو کونسل کی رائے کو وقعت دی جاتی بلکہ برطانوی وار کیبنٹ کو بھی ہندوستان کی ایگزیکٹو کونسل پر اعتماد کرنا چاہیے۔ کرپس کا استدلال یہ تھا کہ اس قسم کی صورت حال میں کونسل کے قانونی اختیارات میں توسیع یا اس بات کو واضح طور پر تحریر میں لانے پر اصرار کرنا ضروری نہیں کہ آخری فیصلہ کرنے کا اختیار کونسل کو ہوگا۔ حالات کا رُخ ایگزیکٹو کونسل میں شامل ہندوستانی لیڈروں پر روز افزوں ذمے داریاں ڈالتا رہے گا۔

ویول اس زمانے میں ہندوستان کے کمانڈر انچیف تھے۔ کرپس کی کئی بار ان سے گفتگو ہوئی اور انہوں نے تجویز پیش کی کہ میں بھی ان سے ملوں۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر میں ویول سے ملوں اور انہوں نے مجھے جنگ کی صورت حال کے بارے میں آگاہ کیا تو اس کا اچھا اثر پڑے گا چنانچہ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ میں ویول سے ملاقات کروں۔ میں ملاقات پر آمادہ ہو گیا اور انہوں نے وقت مقرر کرا دیا۔

کرپس جواہر لعل کو اور مجھے خود ویول کے پاس لے گئے البتہ ہمارا رسمی تعارف کرانے کے بعد وہ چلے گئے اور ہم ویول کے ساتھ ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ اس بات چیت سے ایسا کوئی نتیجہ نہ نکلا جس سے میرے بنیادی سوال کا جواب مل سکتا۔ ویول ایک سپاہی کے بجائے سیاستدان کی طرح باتیں کرتے رہے اور یہ اصرار کرتے رہے کہ جنگ کے زمانے میں فوجی مصلحتوں کو دوسرے تمام معاملوں پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ میں نے اس سے انکار نہ کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ہمیں اس مسئلے سے دلچسپی ہے کہ ہندوستان کی انتظامیہ میں اختیارات کون استعمال کرے گا؟ ویول اس مسئلے پر کوئی روشنی نہ ڈال سکے۔

ہمارے اصرار کے نتیجے میں یہ تجویز کیا گیا کہ ایگزیکٹو کونسل کا ایک ممبر جنگ سے متعلق معاملات نمٹائے گا۔ کرپس نے ہمیں باور کرانے کی کوشش کی کہ اس طرح جنگ کی پالیسی اور انتظام میں ہندوستان کی شرکت یقینی ہو جائے گی البتہ وہ یہ بات واضح نہ کر سکے کہ ہندوستانی ممبر اور کمانڈر انچیف کا تعلق کیا ہوگا؟ انہوں نے ویول کے ساتھ میری ملاقات اسی مسئلے پر تبادلہ خیالات کے لیے کرائی تھی۔ جب میں نے ویول سے پوچھا کہ آیا کونسل کے ہندوستانی ممبر کا منصب ایک ذمے دار رکن کابینہ کا ہوگا تو وہ اس سوال کا براہ راست جواب نہ دے سکے۔ میں نے ان کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندوستانی ممبر پر ذمے داریاں تو عائد ہوں گی مگر اسے اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ وہ فوجی کینٹینوں، محکمہ رسد اور ٹرانسپورٹ کا انچارج ہوگا لیکن جنگ میں حصہ لینے والی افواج کے معاملے میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔

اس وقت مختصر صورت حال یہ تھی کہ کرپس کی پیشکش میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے گا لیکن جنگ کے دوران صرف اس قدر تبدیلی ہوگی کہ ایگزیکٹو کونسل مکمل طور پر ہندوستان کے سیاسی لیڈروں پر مشتمل ہوگی۔ جہاں تک فرقہ وارانہ مسئلے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کرپس

کا کہنا تھا کہ جنگ ختم ہونے پر صوبوں کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا کہ وہ یونین میں شامل ہوں گے یا نہیں؟
میں نے کرپس کے اس بنیادی اُصول پر اعتراض نہیں کیا تھا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے گا لیکن میں یہ محسوس کرتا تھا کہ جب تک جنگ کے دوران ایگزیکٹو کونسل کو اختیارات اور ذمے داریاں عملاً نہیں سونپی جاتیں، اس وقت تک کوئی اہم تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ پہلی ملاقات میں کرپس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ کونسل کابینہ کے طور پر کام کرے گی مگر گفت وشنید کے دوران پتا چل گیا کہ یہ محض شاعرانہ مبالغہ آرائی تھی اور ان کی پیشکش اصل میں کچھ اور تھی۔
صوبوں کو یونین میں شامل نہ ہونے کا اختیار دینا اس سے بھی بڑی رکاوٹ تھی۔ کرپس نے اس معاملے اور فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے جو تجویزیں پیش کی تھیں، گاندھی جی اس سے بہت پریشان تھے۔ کرپس کے ساتھ پہلی ملاقات کے بعد میں جب ان سے ملا تو انہوں نے اس کے خلاف شدید ردعمل ظاہر کیا۔ میں نے فوری طور پر محسوس کیا کہ گاندھی جی کرپس کی پیشکش کو مکمل طور پر ناقابل عمل تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے ہماری دشواریاں بڑھ جائیں گی اور فرقہ وارانہ مسئلے کا حل ناممکن ہو جائے گا۔
میں نے اس خاص نکتے اور اس کے اثرات پر کرپس کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اور کابینہ میں ان کے ساتھی اس معاملے پر کس انداز سے سوچتے ہیں، اسے صاف صاف بیان کیا جائے۔ کرپس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ جب تک فرقہ وارانہ مسئلہ طے نہیں ہوتا، ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے ان دو میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو فوراً حل کیا جائے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس فیصلے کو جنگ کے بعد اقتدار کی ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقلی تک موخر کر دیا جائے۔ کرپس نے کہا کہ ان کی رائے میں اس مسئلے کو اس وقت اٹھانا غلط ہوگا کیونکہ اس سے دشواریاں بڑھ جائیں گی۔ قابل عمل صورت صرف یہی ہے کہ جنگ کے خاتمے کا انتظار کیا جائے البتہ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اگر ہندو اور مسلمان کسی سمجھوتے پر متفق ہو جائیں تو یہ مسئلہ اب بھی طے ہو سکتا ہے۔
میں نے کرپس کو بتایا کہ صوبوں کو یونین سے الگ ہونے کا حق دینا علیحدگی کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہوگا۔ کرپس نے یہ کہہ کر اپنے موقف کا دفاع کرنے کی کوشش کی کہ یہ حق کسی خاص طبقے کو نہیں بلکہ صوبے کو مجموعی طور پر دیا جائے گا۔ ان کا استدلال تھا کہ اگر ایک مرتبہ صوبوں کے یونین سے الگ ہونے کے حق کو تسلیم کر لیا گیا تو کوئی بھی صوبہ اس حق کا مطالبہ نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس اس حق کو تسلیم نہ کرنے کی صورت میں بدگمانیاں اور شکوک وشبہات پیدا ہوں گے۔ صوبے اس وقت اس مسئلے پر معروضی انداز میں غور کریں گے جب وہ یہ محسوس کریں گے کہ انہیں فیصلہ کرنے میں پوری آزادی حاصل ہے۔

ایک دن جب ہم اس مسئلے پر تبادلہ خیال کر رہے تھے تو کرپس نے مجھے شام کو ٹیلی فون کر کے بتایا کہ سرسکندر حیات خان اگلے روز اُن سے ملاقات کرنے آ رہے ہیں۔ کرپس کو امید تھی کہ سرسکندر فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے میں مفید ثابت ہوں گے۔ پنجاب مسلمانوں کی اکثریت کا سب سے بڑا صوبہ تھا اور اگر پنجاب نے ہندوستان میں شامل رہنے کا فیصلہ کر لیا تو مسلم اکثریت رکھنے والے دوسرے صوبے بھی اس کی پیروی کریں گے۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے اس بارے میں شک ہے کہ سرسکندر اس مسئلے کو طے کر سکیں گے لیکن چونکہ وہ دہلی آ رہے ہیں اس لیے مجھے ان سے ملاقات کر کے خوشی ہوگی۔

سرسکندر اگلے روز دہلی پہنچ گئے اور انہوں نے کرپس کے بعد مجھ سے ملاقات کی۔ ان کا خیال تھا کہ کرپس کی پیشکش فرقہ وارانہ مسئلے کا بہترین حل ہے اور انہیں یقین ہے کہ اگر اس مسئلے پر پنجاب اسمبلی میں رائے شماری کرائی گئی تو وہ فرقہ وارانہ خطوط کے بجائے قومی مصلحت کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرے گی۔ میں نے اعتراف کیا کہ اگر اس وقت رائے شماری کرائی گئی تو ممکن ہے ان کی پیش گوئی درست ثابت ہو لیکن جنگ کے خاتمے کے بعد کیا ہوگا، اس کے بارے میں کچھ کہنا ان کے اور میرے بس کی بات نہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ جنگ کے بعد بھی ان کا اسی قدر اثر ورسوخ ہوگا جتنا اس وقت ہے۔

ہندوستانی ریاستوں کے متعلق کرپس کی پیشکش میں کہا گیا تھا کہ ان کے نمائندوں کو اپنی اپنی ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کی پوری آزادی ہوگی البتہ اس میں صوبوں کی طرح انہیں بھی یونین سے الگ رہنے کا اختیار شامل تھا۔ انصاف کی خاطر مجھے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ کرپس نے ریاستوں کے نمائندوں سے گفتگو کرتے وقت صاف اور سیدھی بات کہی۔ انہوں نے کشمیر کے مہاراجا کو بتایا کہ ریاستوں کا مستقبل ہندوستان سے وابستہ ہے۔ کسی ریاست کے حکمران کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اگر اس نے ہندوستان سے الگ رہنے کا فیصلہ کر لیا تو برطانیہ کا بادشاہ ان کی مدد کو پہنچ جائے گا۔ ان حکمرانوں کو مستقبل کے لیے برطانیہ کے بادشاہ کی طرف نہیں، ہندوستان کی حکومت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ کرپس کے ساتھ ملاقات کے بعد ریاستوں کے بیشتر نمائندے شرمندہ اور نادم نظر آ رہے تھے۔

ورکنگ کمیٹی کرپس کی پیش کردہ تجویزوں کے بارے میں ایک قرارداد کی پہلے ہی منظوری دے چکی تھی۔ قرارداد کا مسودہ ۲ اپریل کو ان کے پاس بھیج دیا گیا لیکن جب تک مذاکرات کا سلسلہ منقطع نہ ہوا، اسے اخبارات کو جاری نہ کیا گیا۔ ہندوستان کو اقتدار کی منتقلی کے عمومی سوال کے ساتھ ایک بڑا اختلاف کمانڈر انچیف اور ایگزیکٹو کونسل کے اس ہندوستانی ممبر کے اختیارات کی تشریح کے بارے میں پیدا ہو گیا جو دفاع کا انچارج ہوتا۔ کرپس کی تجویز تھی کہ تعلقات عامہ، فوجی خدمات سے سبکدوشی، جنگ کے بعد تعمیر نو کے کاموں اور مسلح افواج

کے ارکان کو سہولتیں بہم پہنچانے کا فریضہ ایگزیکٹو کونسل کے ہندوستانی رکن کے سپرد کیا جائے۔ کانگریس کے نزدیک یہ اختیارات بالکل ناکافی تھے اور اس نے یہ جوابی تجویز پیش کی کہ جنگ کی تدابیر اور انتظامات سے متعلق کمانڈر انچیف کے اختیارات کے سوا دوسرے تمام امور دفاع کے ذمے دار ممبر کو سونپ دیے جائیں۔ کرپس نے اس کے جواب میں کئی اور تجویزیں پیش کیں لیکن یہ تجویزیں اطمینان بخش ثابت نہ ہوئیں کیونکہ وہ تمام اہم فرائض کمانڈر انچیف کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔

کرپس کے ساتھ میری ایک اور ملاقات ۹ اپریل کی شام کے قریب ہوئی اور میں نے ۱۰ اپریل کی صبح کو گفتگو کا نتیجہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا۔ ہم افسوس کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے کہ برطانوی حکومت کی تجویزیں موجودہ شکل میں قابل قبول نہیں ہیں۔

چنانچہ ۱۰ اپریل ۱۹۴۲ کو میں نے سر اسٹیفرڈ کو لکھا کہ اعلان کے مسودے میں ہندوستان کے مسائل کے بارے میں جو نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے، وہ نہ صرف خود غلط ہے بلکہ اس سے مستقبل میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ انہوں نے ۱۱ اپریل کو میرے خط کا جواب بھیجا جس میں یہ دلیل پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ ان کی تجویزوں میں ہندوستان کے مسئلے کا بہترین حل پیش کیا گیا ہے۔ کرپس نے اصرار کیا کہ انہوں نے کسی بھی مرحلے پر اپنا موقف تبدیل نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے مذاکرات کی ناکامی کا الزام کانگریس پر عائد کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ اپنے خط کو اخبارات میں شائع کرانا چاہتے ہیں۔ میں نے اسی روز ان کے خط کا جواب دیا اور ان کے دعووں پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس جانب اشارہ کیا کہ ہماری خط و کتابت کو پڑھ کر ہر غیر جانبدار مبصر یہ باور کر لے گا کہ ان کا مشن کانگریس کی وجہ سے نہیں، خود ان کی وجہ سے ناکام ہوا ہے۔ میرے دونوں خطوں میں جو اہم باتیں تھیں وہ میں نیچے درج کر رہا ہوں البتہ جن قارئین کو دلچسپی ہو، وہ اس کتاب کے ضمیمہ ۳ میں مکمل خط و کتابت ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

میں نے سر اسٹیفرڈ کو ۱۰ اور ۱۱ اپریل کو جو دو خط لکھے، ان کا مختصر خلاصہ یہ ہے:

☆ اگر برطانوی حکومت ہندوستانیوں میں واقعی نیا جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے تو اگرچہ اس عمل میں تاخیر ہو گئی ہے اور اس نے اس مقصد کے لیے سر اسٹیفرڈ جیسی قدآور شخصیت کو ہندوستان بھیجا ہے لیکن اس کا سب سے سادہ طریقہ یہ تھا کہ ان کے ذریعے اس اعلان کا مسودہ بھیج دیا جاتا کہ برطانیہ ہندوستانیوں کو اقتدار میں شریک کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے برعکس برطانوی حکومت نے اس غرض کے لیے مخصوص تجویزیں تیار کی ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے درمیان مفاہمت کا کام اور مشکل ہو گیا ہے۔

☆ میں نے سر اسٹیفرڈ کو مزید بتایا کہ اعلان کے مسودے میں موجودہ حالات کے مقابلے میں مستقبل پر

زیادہ زور دیا گیا ہے حالانکہ ہندوستان موجودہ نظام میں تبدیلی کا مطالبہ کر رہا تھا ☆ اعلان میں موجودہ حالات کے بارے میں جو تجویزیں شامل ہیں وہ مثبت نہیں منفی ہیں اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ کانگریس ان تجویزوں کو قبول کر لے گی۔ میں نے کہا کہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان کو خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہندوستانی عوام میں جرأت اور یقین کی فضا پیدا کی جاتی لیکن برطانیہ کے رویے کی وجہ سے ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دلوں میں امیدوں کے چراغ بجھ گئے ہیں جو مادر وطن کے لیے اپنی جانیں قربان کر سکتے تھے۔ میں نے واضح کیا کہ اب ہمارے مشترکہ نصب العین کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ہندوستانیوں کے دلوں میں جذبہ حب الوطنی کی شمع دوبارہ روشن کرنے کے لیے ایک نفسیاتی طرز عمل اختیار کریں۔ یہ مقصد محض مستقبل کے سہانے وعدوں کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا ☆ ہمیں لوگوں کو یہ باور کرانا ہوگا کہ آج وہ اپنے وطن میں آزاد ہیں اور انہیں اپنی آزادی اور اپنے ملک کا دفاع کرنا ہوگا۔

☆ میں نے اپنے خط میں یہ بھی وضاحت کی کہ اس وقت ملک کا دفاع دوسرے تمام امور پر سب سے مقدم ہے۔ زمانہ جنگ میں سول انتظامیہ دفاعی ضروریات کو پورا کرنے کی پابند ہے۔ اس کے علاوہ دفاعی مسئلے ہر سول محکمے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دفاع کے معاملے کو محض وائسرائے یا کمانڈر انچیف کے لیے مخصوص کر دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام اختیارات، جن میں وہ اختیارات بھی شامل ہیں جنہیں بظاہر ہندوستانیوں کو منتقل کیا جا رہا ہے، ہندوستان کے سپرد نہیں کیے جائیں گے۔

☆ میں نے ایک اور نکتے پر بھی زور دیا جو یہ تھا کہ کانگریس فرقہ وارانہ مسئلے کو طے کرنے کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہے۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کو سلجھاتے وقت کسی نہ کسی مرحلے پر فرقہ وارانہ مسئلے ضرور کھڑے ہوں گے اور انہیں ہر قیمت پر حل کرنا ہوگا۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ جیسے ہی بڑا سیاسی تنازع طے ہوا تو فرقہ وارانہ اور دوسرے مسئلوں کو اطمینان بخش طریقے سے حل کرنے کی ذمے داری ہم اپنے اوپر لے لیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی سیاسی مسئلہ طے ہوا، ہم فرقہ وارانہ مسئلے کا مناسب حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

میں نے لکھا مجھے افسوس ہے کہ جیسے جیسے ہم نے اہم معاملوں پر گفتگو اور بحث کی، وہ تصویر جو سر اسٹیفرڈ کے ساتھ ابتدائی ملاقاتوں میں میرے ذہن پر نقش ہو گئی تھی، آہستہ آہستہ دھندلی پڑتی گئی۔ جب ۹ اپریل کی رات کو میری ان سے آخری ملاقات ہوئی، اس وقت پورا منظر تبدیل ہو چکا تھا اور تصفیے کی تمام امیدیں ماند پڑ چکی تھیں۔

چونکہ سر اسٹیفرڈ نے لکھا تھا کہ وہ میرے نام بھیجے جانے والے خط کو شائع کرانا چاہتے ہیں اس لیے میں نے اپنے جواب میں لکھا کہ غالباً انہیں بھی میری پوری خط و کتابت اور ورکنگ کمیٹی کی قرارداد شائع کرنے پر کوئی

اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ قرارداد تاریخ کی تمام مستند اور معیاری کتابوں میں درج ہے اس لیے میں اسے یہاں نقل نہیں کروں گا۔ کرپس نے جواب میں لکھا کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے چنانچہ ۱۱ اپریل کو یہ سب اخبارات کو بھیج دیے گئے۔

۱۱ اپریل ۱۹۴۲ کو میں نے ایک پریس کانفرنس بھی بلائی جس میں میں نے اخباری نمائندوں کی بڑی تعداد سے ملاقات کی اور ان وجوہ کے بارے میں تفصیلات بتائیں جن کی بنا پر ہم نے کرپس کی پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔ انہیں یہاں تفصیل کے ساتھ دہرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ قرارداد اور کرپس کے ساتھ ہونے والی خط و کتابت میں بیان کر دی گئی ہیں۔ میں نے اس نکتے پر خصوصی طور پر زور دیا کہ جیسے جیسے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھا، حالات کی جو رنگین اور خوش آئند تصویر سر اسٹیفرڈ نے پہلے کھینچی تھی، وہ بتدریج دھندلی پڑتی گئی۔ ماحول میں تبدیلی کا عکس مجھے لارڈ ویول کے ساتھ ملاقات میں بھی نظر آیا۔ گفتگو کے دوران سر اسٹیفرڈ کرپس نے بار بار ان فنی دشواریوں پر زور دیا جو کونسل کے ہندوستانی ممبر کو دفاع کا محکمہ منتقل کرنے کی راہ میں حائل تھیں۔ ان ہی کی تجویز پر ہم نے جنرل ویول کے ساتھ ملاقات کی تھی کیونکہ وہ اس مسئلے کے فنی پہلوؤں کی بہتر طریقے سے وضاحت کر سکتے تھے لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ اس ملاقات کے دوران، جس میں دوسرے فوجی افسر بھی موجود تھے، کمانڈر انچیف نے فنی دشواریوں کے بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا۔ ساری گفتگو سیاسی خطوط پر ہوئی اور مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ گمان نہ ہوا کہ ہم کسی فوجی ماہر کے ساتھ بات چیت کر رہے ہیں۔ ملاقات کے دوران لارڈ ویول ایک تجربہ کار سیاست دان کی طرح باتیں کر رہے تھے۔

میں نے پریس کانفرنس کے دوران مذاکرات میں مہاتما گاندھی کی شرکت کے بارے میں بعض اخبارات کی قیاس آرائیوں کی وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھا۔ جنگ میں حصہ لینے کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات پوری طرح واضح تھے اور یہ کہنا بالکل غلط تھا کہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں پر کسی طرح سے ان کا اثر پڑا تھا۔

گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ تجویزوں کی خوبیوں اور خامیوں کو دیکھ کر جو چاہے آزادانہ طور پر فیصلے کر سکتی ہے۔ وہ ورکنگ کمیٹی کے ابتدائی جلسوں میں بھی شریک نہیں ہونا چاہتے تھے اور ہمارے اصرار کی وجہ سے چند دن ٹھہرنے پر راضی ہو گئے تھے۔ آخر میں انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اور زیادہ قیام نہیں کر سکتے چنانچہ میری تمام دلیلیں انہیں رائے بدلنے پر آمادہ نہ کر سکیں۔

میں نے اخباری نمائندوں کے سامنے اپنے گزشتہ روز کے بیان کو بھی دہرایا کہ ورکنگ کمیٹی نے تمام فیصلے اتفاق رائے سے کیے ہیں۔

آخر میں مَیں نے کہا کہ ہم اس منزل کو نہیں پا سکے جس کی ہم سب کو شدید آرزو تھی البتہ یہ بات ریکارڈ پر

موجود رہنی چاہیے کہ یہ تمام مذاکرات دوستانہ ماحول میں ہوئے اور ایسے انتہائی اختلافات کے باوجود، جو کبھی کبھی بحث میں گرمی پیدا کر دیتے تھے، سر اسٹیفرڈ اور ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور مذاکرات کے دوران خلوص اور گرمجوشی آخری وقت تک برقرار رہی۔

اس طرح کرپس مشن کے ساتھ کانگریس کی گفت وشنید کا سلسلہ ختم ہو گیا البتہ جواہر لعل اور راج گوپال آچاری کا معاملہ کچھ اور تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے اگلے دور کا ذکر کرنے سے پہلے میں ان واقعات کے بارے میں ان کے ردعمل کا خصوصی طور پر حوالہ دینا چاہتا ہوں۔

کرپس کی واپسی کے تھوڑے دن بعد جواہر لعل نے نیوز کرانیکل کو ایک انٹرویو دیا۔ اس پورے انٹرویو میں ان کا انداز اور رویہ ایسا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس اور برطانیہ کے اختلافات کم سے کم کر کے دکھائے جا رہے ہیں۔ جواہر لعل نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ کانگریس کی طرف سے کرپس کی پیشکش مسترد ہونے کے باوجود ہندوستان انگریزوں کی مدد کرنے کو تیار ہے لیکن برطانوی حکومت نے جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس کی وجہ سے برطانیہ کی مکمل امداد نہیں کی جا سکتی۔

مجھے اس تجویز کی بھی اطلاع ملی کہ جواہر لعل کو آل انڈیا ریڈیو پر تقریر کرنی چاہیے۔ ان کے نقطہ نظر سے مجھے جو واقفیت تھی اس کی بنا پر مجھے اندیشہ ہوا کہ ان کے بیان سے عام لوگوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو جائیں گے۔ جواہر لعل پہلے ہی الٰہ آباد جا چکے تھے اور میں نے بھی کلکتہ کے لیے انتظامات کر لیے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں راستے میں رک کر جواہر لعل سے مزید گفتگو کروں گا چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور جواہر لعل کو صاف صاف بتا دیا کہ اب جبکہ ورکنگ کمیٹی ایک قرارداد کی منظوری دے چکی ہے، انہیں اپنی رائے کا سوچ سمجھ کر اظہار کرنا چاہیے۔ اگر ان کے بیان سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ کانگریس جنگ کی سرگرمیوں کی مخالفت نہیں کرے گی تو کانگریس کی قرارداد کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ کانگریس کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان برطانیہ کی مدد کے لیے تیار ہے لیکن وہ یہ امداد ایک آزاد ملک کی حیثیت سے ہی فراہم کر سکتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ جواہر لعل کا رویہ بھی یہی ہے۔ اگر وہ کوئی ایسی بات کہہ دیتے جس سے یہ تاثر ابھرتا کہ ہندوستان برطانوی رویے سے قطع نظر جنگ میں برطانیہ کی امداد کے لیے تیار ہے تو کانگریس کی قرارداد بے معنی ہو جاتی۔ چنانچہ میں نے جواہر لعل سے کہا کہ وہ ایسا کوئی بیان دینے سے گریز کریں۔ پہلے تو انہوں نے کچھ حجت کی لیکن آخر میری بات مان گئے۔ جب انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ کسی صورت میں کوئی بیان نہیں دیں گے اور ریڈیو پر جو تقریر کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں کریں گے تو مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

میں یہاں پوری طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جواہر لعل کا یہ رویہ اس بنا پر نہیں تھا کہ انہیں ہندوستان کی آزادی کے بارے میں کوئی شک وشبہ تھا بلکہ ان کا رویہ بین الاقوامی صورت حال کے ادراک کا فطری نتیجہ

تھا۔ وہ شروع ہی سے فاشزم کے کٹر مخالف تھے اور چین کے سفر اور چیانگ کائی شیک کے ساتھ تبادلہ خیالات کے بعد فاشزم سے انہیں اور بھی نفرت ہوگئی تھی۔ جاپان کے خلاف چین کی جدوجہد نے انہیں ایسا مرعوب کیا تھا کہ وہ جمہوری ریاستوں کی ہر قیمت پر امداد کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اصل میں انہیں اس بات کا دلی رنج اور صدمہ تھا کہ ہندوستان میدان جنگ میں جمہوری ریاستوں کے شانہ بشانہ نہیں لڑ رہا۔

میں یہاں پر یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جواہر لعل بیشتر ہندوستانیوں کے مقابلے میں بین الاقوامی صورت حال سے زیادہ متاثر ہوتے تھے اور ہر مسئلے کو قومی سے زیادہ بین الاقوامی تناظر میں دیکھنے کے عادی تھے۔ میں بین الاقوامی مسائل کے لیے ان کی تشویش میں ان کے ساتھ شریک تھا لیکن میرے نزدیک ہندوستان کی آزادی سب معاملوں پر مقدم تھی۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ جمہوری ریاستیں کم برائی ہیں البتہ میں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرسکتا تھا کہ جب تک ہندوستان کے معاملے میں جمہوری اصول کا اطلاق نہیں ہوتا، اس وقت تک جمہوریت کے سب دعوے بے بنیاد اور سطحی ہوں گے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد جو کچھ پیش آیا، مجھے وہ سب یاد تھا۔ اس وقت برطانیہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ چھوٹی قوموں کے حقوق کی حفاظت کے لیے جرمن سامراج کے خلاف جنگ لڑ رہا ہے۔ جب امریکا جنگ میں شریک ہوگیا تو صدر ولسن نے اپنے مشہور چودہ نکات کا اعلان کرتے ہوئے تمام قوموں کے حق خود ارادی کی وکالت کی تھی۔ اس کے باوجود ہندوستان کے حقوق کا احترام اور پاسداری نہ کی گئی اور نہ ہی ہندوستان کے معاملے میں چودہ نکات کا کبھی اطلاق کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ جب تک ہندوستان کے معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا جاتا، اس وقت تک جمہوری کیمپ کے بارے میں سب گفتگو بے معنی ہے۔ میں نے ایک ہفتہ بعد کلکتے میں نیوز کرانیکل کو جو انٹرویو دیا، اس میں یہ ساری باتیں پوری صراحت کے ساتھ بیان کردی گئیں۔

اس ساری مدت میں جواہر لعل کی طبیعت پر زبردست بوجھ رہا۔ وہ حال ہی میں چین سے لوٹے تھے جہاں ان پر سپہ سالار اعظم اور مادام چیانگ کائی شیک کا بہت اثر پڑا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جاپان کی کامیابی کے ساتھ مزاحمت کے لیے چین کو ہندوستانی امداد کی اشد ضرورت ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے دوران ایک مرتبہ شام کو جواہر لعل میرے پاس آئے۔ ان کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ وہ برطانیہ کے موقف میں تبدیلی سے قطع نظر کرپس کی پیشکش کو قبول کرنے کے حامی ہیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ کرپس کی جانب سے مثبت یقین دہانی کے پیش نظر ہمیں یہ پیشکش قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔ جواہر لعل نے یہ بات صاف لفظوں میں نہ کہی لیکن ان کی تمام تر دلیلوں کا رخ اسی طرف تھا۔

اس گفتگو سے میری طبیعت سخت پریشان ہوگئی اور مجھے صبح دو بجے تک نیند نہ آئی۔ جیسے ہی میری آنکھ کھلی، میں شریمتی رامیشوری نہرو کے مکان پر چلا گیا جہاں جواہر لعل ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم نے ایک گھنٹے سے

زیادہ دیر تک مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات کیا۔ میں نے جواہر لعل کو بتایا کہ ان کے خیالات کا میلان ہمارے بہترین مفادات کے منافی ہے۔ اگر ہندوستان کو حقیقی اقتدار منتقل نہ کیا گیا اور صرف نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دے دی گئی تو ہم کرپس سے صرف ایک وعدہ حاصل کر سکیں گے جس کا ایفا جنگ کے بعد ہوگا۔ موجودہ حالات میں ایسے وعدے کی کوئی وقعت نہیں۔ کسے معلوم ہے کہ جنگ کا انجام کیا ہوگا؟ ہم ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہونے کو تیار ہیں لیکن کرپس کی پیشکش میں اس نکتے کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ میں شرکت کرنے کا فیصلہ ہمارا نہیں، وائسرائے کا تھا۔ کرپس ہمیں خود فیصلہ کرنے کا موقع دیے بغیر وائسرائے کا فیصلہ قبول کرنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ اس کے باوجود اگر ہم اب بھی اس پیشکش کو منظور کر لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اب تک جو بھی فیصلے کیے، وہ سب غلط تھے۔

میں نے یہ دلیل بھی پیش کی کہ جنگ کے بعد دنیا یقیناً تبدیل ہو جائے گی اور عالمی سیاسی صورت حال سے واقف کوئی بھی شخص ہرگز اس شک وشبے کا اظہار نہیں کر سکتا کہ جنگ کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ اس طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ کرپس کی پیشکش میں ہمیں کچھ نہیں دیا گیا۔ ہم نے ان کی پیشکش کو قبول کر لیا تو ہمیں مستقبل میں پچھتانا پڑے گا۔ اگر انگریز اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے تو ہمارے پاس آزادی کی جدوجہد کو نئے سرے سے شروع کرنے کا کوئی جواز نہیں ہوگا۔ جنگ نے ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے کا موقع دیا ہے اور ہمیں خالی ایک وعدے پر بھروسا کر کے اسے ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیے۔

دنیا اور ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس سے جواہر لعل بہت افسردہ خاطر تھے اور یہ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی پختہ رائے قائم نہیں کر سکے ہیں۔ اندرونی کشمکش کی وجہ سے وہ خود کو بے بس محسوس کرتے تھے۔ میری باتیں سن کر وہ کچھ دیر تک خاموش رہے، پھر کہنے لگے: ''میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں چاہتا کہ اپنے ذاتی رجحانات کے مطابق فیصلہ کروں۔ اس نکتے کے بارے میں آپ کے دل میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ میرا فیصلہ وہی ہوگا جو میرے ساتھی کریں گے''۔

جواہر لعل کی طبیعت ایسی ہے کہ جب وہ کسی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں تو سوتے میں بھی باتیں کرتے رہتے ہیں اور جن تفکرات میں ان کا دن گزرتا ہے، وہ رات کو خواب کا روپ دھار لیتے ہیں۔ جب میں باہر نکلا تو شریمتی رامیشور نہرو نے مجھے بتایا کہ جواہر لعل پچھلی دو راتوں سے سوتے میں باتیں کر رہے ہیں۔ بعض اوقات وہ بحث کرتے، کبھی بڑبڑاتے اور کبھی زور زور سے باتیں کرتے ہیں۔ وہ کبھی کرپس کا نام لیتے ہیں، کبھی گاندھی جی کا اور کبھی میرا۔ جواہر لعل جس ذہنی دباؤ کا شکار تھے، یہ اس کا ایک اور ثبوت تھا۔

شری راج گوپال آچاری دوسرے شخص تھے جن پر کرپس سے گفت وشنید کا بہت گہرا اثر پڑا۔ وہ کچھ عرصے سے ملک میں بگڑتی ہوئی فرقہ وارانہ صورت حال سے سخت پریشان تھے۔ ان کی رائے تھی کہ ہندوستان

کی آزادی میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے۔ حالات کے بارے میں میرا تجزیہ یہ تھا کہ انگریز جنگ کے زمانے میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے اور فرقہ وارانہ اختلافات سے انہیں اقتدار اپنے پاس رکھنے کا بہانہ مل گیا ہے۔ راج گوپال آچاری کو اس رائے سے اتفاق نہیں تھا چنانچہ انہوں نے کرپس کی پیشکش مسترد ہونے کے فوراً بعد یہ علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر کانگریس مسلم لیگ کے مطالبات مان لے تو ہندوستان کی آزادی کے حصول کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ انہوں نے ان خیالات کا نہ صرف برملا اظہار کیا بلکہ مدراس کی کانگریس قانون ساز پارٹی میں ایک قرارداد بھی پیش کر دی جو کانگریس کے موقف سے انحراف کے مترادف تھی۔ اس قرارداد کی منظوری سے ارکان کانگریس میں زبردست غم و غصہ پیدا ہو گیا اور انہوں نے مجھے کئی احتجاجی مراسلے بھیجے۔

راج گوپال آچاری نے قرارداد پیش کرنے سے پہلے نہ تو میرے ساتھ مشورہ کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے نہ ہی کسی اور ساتھی سے۔ قرارداد کے بارے میں اخبارات میں پڑھ کر میں سخت پریشان ہوا۔ اگر ورکنگ کمیٹی میں میرا قریبی ساتھی کانگریس کے فیصلوں کے خلاف تقریریں کرتا پھرے گا تو اس سے نہ صرف پارٹی کا ڈسپلن کمزور ہوگا بلکہ عوام کے دل و دماغ میں بھی انتشار پیدا ہوگا جس سے سامراجی طاقت کی گرفت مزید مضبوط ہو جائے گی۔ چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ اس معاملے کو ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

میں نے راج گوپال آچاری کو بتایا کہ مدراس کی کانگریس قانون ساز پارٹی نے جو قراردادیں منظور کی ہیں، وہ کانگریس کی اعلان کردہ پالیسی کے خلاف ہیں۔ ورکنگ کمیٹی کے ایک ذمے دار رکن کی حیثیت سے انہیں ایسی کسی قرارداد سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اگر وہ اس معاملے میں کوئی قطعی رائے رکھتے تھے تو اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے پہلے ورکنگ کمیٹی میں اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورہ کر لیتے، ورکنگ کمیٹی ان سے اتفاق نہ کرتی تو انہیں اختیار تھا کہ وہ استعفا دے کر اپنے خیالات کا پرچار کرتے۔

راج گوپال آچاری نے تسلیم کیا کہ مدراس قانون ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے سامنے قرارداد پیش کرنے سے پہلے انہیں ورکنگ کمیٹی میں اس معاملے پر گفتگو کر لینی چاہیے تھی لیکن چونکہ ان دو قراردادوں میں ان کی پختہ رائے کی عکاسی ہوتی تھی، اس لیے وہ انہیں واپس لینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں انہوں نے پارٹی کے صدر کے ساتھ مشورہ کیے بغیر ایک نہایت اختلافی مسئلے پر اپنی رائے پبلک میں ظاہر کرنے پر معذرت کی اور ورکنگ کمیٹی کی رکنیت سے استعفا دے دیا۔

چھٹا باب

بے چینی کا دور

اس مشن کی ناکامی نے ملک بھر میں عام مایوسی اور غصے کی فضا پیدا کر دی اور بہت سے ہندوستانی یہ محسوس کرنے لگے کہ چرچل کی وزارت نے صرف امریکی اور چینی دباؤ کی وجہ سے سر اسٹیفرڈ کو ہندوستان بھیجا تھا اور یہ کہ مسٹر چرچل ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ مختلف پارٹیوں کے ساتھ جو لمبی چوڑی گفتگوئیں ہوئیں، ان کا مقصد باہر کی دنیا پر یہ ثابت کرنا تھا کہ کانگریس صحیح معنوں میں ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتی اور ہندوستانیوں کے اختلافات ہی اس کا اصل سبب ہیں کہ انگریز ہندوستانیوں کے ہاتھ میں اقتدار نہیں دے رہے۔ چونکہ اس معاملے پر کانگریسیوں میں بھی غلط فہمیاں اور شکوک وشبہات پائے جاتے تھے اس لیے میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اجلاس ۲۹ اپریل سے ۲ مئی ۱۹۴۲ تک الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔ اس سے پہلے ۲۷ اپریل سے یکم مئی تک ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی کارروائی کو شروع کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس سے ڈیڑھ ماہ پہلے جب ہم وردھا میں ملے تھے، اس وقت یہ معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کی خاطر ایک نیا رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ اعلان کیا گیا کہ برطانوی کابینہ کے ایک رکن سر اسٹیفرڈ کرپس ہندوستان کے مسئلے کو طے کرنے کے لیے نئی تجویزیں لے کر جائیں گے۔ ورکنگ کمیٹی نے وردھا میں یہ فیصلہ کیا کہ پارٹی کے صدر کی حیثیت سے مجھے کانگریس کی جانب سے سر اسٹیفرڈ کے ساتھ ملاقات کرنی چاہیے۔ میں نے سر اسٹیفرڈ سے کئی ملاقاتیں کیں اور انہیں بتایا کہ وہ جو مسودہ اعلان لائے تھے، وہ مایوس کن ہے۔ اس میں خاص اس وقت کے لیے کچھ پیش نہیں کیا گیا اور ہر بات ایک غیر یقینی مستقبل پر چھوڑ دی گئی ہے۔ زمانہ حال کے بارے میں پیش کی جانے والی تجویزیں نہ صرف مبہم ہیں بلکہ ان کے ذریعے عوام کو کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں ملتا۔ دفاع کو کلی طور پر انگلستان کی ہز میجسٹی کی حکومت کے ہاتھ میں رکھا گیا تھا۔ اس محکمے کو انگلستان کے ہاتھ میں مخصوص کرنے سے اقتدار کو برطانیہ سے ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل کرنے کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے، جنگ کے زمانے میں دفاع کا محکمہ سول انتظامیہ کے ہر شعبے پر حاوی ہوتا ہے اور اگر دفاع کا شعبہ انگلستان کے لیے محفوظ کر دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اس کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔

میں نے کمیٹی کو بتایا کہ سر اسٹیفرڈ نے ابتدائی مذاکرات میں ہمیں یقین دلایا تھا کہ مسودہ اعلان میں قومی

حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی جائے گی اور اس حکومت میں وائسرائے کی وہی حیثیت ہو گی جو کابینہ میں دستوری بادشاہ کو حاصل ہوتی ہے تاہم کرپس بعد میں اپنے اس موقف سے منحرف ہو گئے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کرپس کی پیشکش میں فرقہ وارانہ اور ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے مسئلوں کو حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان مسئلوں کو خود ہندوستانیوں پر چھوڑ دیا جاتا لیکن کرپس کی تجویزوں میں ان مسئلوں کا قابل اعتراض حل پیش کیا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ تصویر ماند پڑنے لگی جو مذاکرات کے شروع میں کرپس نے پیش کی تھی۔ جو کچھ بچ گیا وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس پر نظر ڈالی جائے۔

میں نے کمیٹی کو یہ بھی بتایا کہ جب سے جنگ چھڑی ہے، برطانیہ کا رویہ تعاون پر مبنی نہیں رہا۔ اس کے برعکس کانگریس تصفیے کے لیے جہاں تک ممکن ہوا، آگے چلی گئی لیکن یہ ظاہر تھا کہ برطانوی حکومت کانگریس پر بھروسا نہیں کرتی، حکومت دفاع کے محکمے کو ہندوستانیوں کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھی۔ ورکنگ کمیٹی کا موقف یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو جنگ میں سرگرمی کے ساتھ شرکت کا موقع ملنا چاہیے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ورکنگ کمیٹی کے بعض ارکان عدم تشدد کے اصول پر مہاتما گاندھی کی حمایت کرتے ہیں البتہ مجھے یہ کہنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ دو ہفتے تک دہلی میں جاری رہنے والے طویل مذاکرات کے دوران ان ارکان نے اپنے نقطہ نظر پر اصرار نہ کیا اور انہوں نے ہر تجویز کا ملکی دفاع کے زاویے سے جائزہ لیا۔ انہوں نے پوری طرح واضح کر دیا کہ وہ عدم تشدد کے اصول پر پختہ یقین رکھتے ہوئے مذاکرات کے نتیجے میں قائم ہونے والی قومی حکومت کی ہر ممکن معاونت کریں گے۔

میں نے اپنے ساتھیوں کے جذبہ حب الوطنی اور وفاداری کو علانیہ سراہا اور کمیٹی کو بتایا کہ ہمارے تمام فیصلے اتفاق رائے سے ہوئے تھے۔ میں نے اس جانب بھی اشارہ کیا کہ ہمارے ذہن میں یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ ہمیں فرقہ وارانہ اور دوسرے مسائل کو کن خطوط پر طے کرنا ہے البتہ ہم نے اپنے اس رویے کو کرپس کی پیشکش پر اثر انداز نہ ہونے دیا۔ ہم نے اس پیشکش کو جانچنے کے لیے صرف ایک ہی معیار رکھا تھا کہ اس کی بدولت اقتدار انگریزوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو گا یا نہیں؟ مجھے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اگر سیاسی اقتدار کی منتقلی کا مسئلہ پہلے طے ہو جائے تو ہم فرقہ وارانہ مسئلے کا اطمینان بخش حل بھی تلاش کر لیں گے۔

اس کے بعد میں نے بعض لوگوں کی اس رائے کا ذکر کیا کہ گو کرپس مشن سے برطانیہ اور ہندوستان کا مسئلہ طے نہیں ہو سکا، اس کے باوجود جنگ کے بارے میں عوام کا رویہ تبدیل ہو گیا ہے۔ میں نے کہا یہ نقطہ نظر بالکل غلط اور گمراہ کن ہے۔ مشن کا کچھ نتیجہ نکلا تو یہ کہ برطانیہ اور ہندوستان کے درمیان مفاہمت کے امکانات بہت کم ہو گئے اور یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مشن نے امیدیں دلائیں اور پھر ان پر پانی پھیر دیا۔ اس نے اس یقین کو پختہ کر دیا ہے کہ غلام ہندوستان کا جنگ سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ صرف ایک آزاد ہندوستان ہی

اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ سر اسٹیفرڈ کرپس اب یہ کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے برطانوی حکومت کو نہیں، ہندوستانی عوام کے لیڈروں کو پہل کرنا ہوگی لیکن میں نے یہ اعلان کر دیا کہ کانگریس مفاہمت کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی، کر چکی ہے اور اب وہ اس معاملے میں مزید کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔

اس کے بعد میں نے جاپان کے حملے کے فوری خطرے کا حوالہ دیا اور ان لوگوں پر شدید نکتہ چینی کی جو یہ سمجھتے یا کہتے تھے کہ جاپان ہندوستان کو آزاد کر دے گا۔ میں نے کہا ہماری قومی خودداری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے آقا تبدیل کرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔ ہم برطانیہ سے اختلافات کے باوجود جاپانی جارحیت کی مزاحمت کریں گے۔ جاپان کا ہرگز خیر مقدم نہیں کیا جائے گا، نہ ایک قدم اس کی طرف بڑھ کر اور نہ ساکت رہ کر۔ اگر ہم آزاد ہوتے تو ہر حملہ آور کا ہتھیاروں سے مقابلہ کرتے لیکن اس وقت اس طرح کا مقابلہ کرنا ہمارے بس میں نہیں، اس کے باوجود عدم تشدد کا ہتھیار ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم پچھلے بائیس برسوں سے یہ ہتھیار استعمال کر رہے ہیں اور کوئی طاقت ہم سے یہ ہتھیار نہیں چھین سکتی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کے موقف اور کرپس مشن کے بارے میں اس کی قرارداد کی توثیق کر دی۔ اس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ورکنگ کمیٹی ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے ایسے مزید اقدامات کرنے کی مجاز ہے۔ میں الٰہ آباد سے واپس کلکتہ آیا تو مجھے ہر طرف بگڑتی ہوئی صورت حال کو دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی۔ بیشتر لوگوں کا خیال تھا کہ انگریز شکست کھا جائیں گے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کئی لوگ جاپانیوں کی فتح کا خیر مقدم کریں گے۔ انگریزوں سے ان کی نفرت اور تلخی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ یہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ جاپان کے ہندوستان کو فتح کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔

کرپس کے جانے کے بعد مجھے گاندھی جی کے رویے میں بھی نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔ میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ وہ جنگ کے دوران کوئی تحریک شروع کرنے کے کس قدر خلاف تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہندوستان کو عدم تشدد کے اصول پر کاربند رہنا اور کسی حالت میں اس سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ میری کوششوں کے باوجود وہ کوئی عوامی تحریک شروع کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس قسم کی تحریک کے نتیجے میں تشدد کے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں انہیں بڑی مشکل سے انفرادی ستیہ گری یا سول نافرمانی پر رضامند کر سکا تھا۔ اس پر بھی انہوں نے اتنی شرطیں لگائیں کہ یہ تحریک ایک اخلاقی اور سیاسی وظیفہ بن کر رہ گئی۔

گاندھی جی کا ذہن اب کامل سکوت کی انتہا سے منظم عوامی تحریک کی دوسری انتہا کی طرف جا رہا تھا۔ غالباً یہ عمل پہلے سے شروع ہو چکا تھا البتہ اس کے نتائج کرپس کے جانے کے بعد نظر آئے۔ میں جون ۱۹۴۲ میں

ان سے ملنے کے لیے وردھا گیا اور کوئی پانچ دن تک ان کے ہاں ٹھہرا۔ ان کے ساتھ گفتگو کے دوران میں نے یہ اندازہ لگایا کہ جنگ چھڑنے کے بعد انہوں نے جو موقف اختیار کیا تھا، اب وہ اس سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔

میں نے بھانپ لیا کہ حکومت کو یہ اندیشہ ہے کہ جاپان ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔ حکومت کا خیال تھا کہ اگر جاپان نے پورے ملک پر حملہ نہ کیا تو بھی وہ کم سے کم بنگال پر قبضہ کرنے کی ضرور کوشش کرے گا۔ حکومت نے اس سلسلے میں بعض احتیاطی تدابیر بھی اختیار کر لی تھیں۔ انگریزوں نے مختلف مقامات پر مزاحمت کا پلان تیار کر لیا بلکہ پسپائی کی صورت میں پیچھے ہٹنے کے لیے عبوری احکامات تک تیار کر لیے گئے تھے۔ حکومت نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اگر جاپان نے حملہ کیا تو سب کچھ جلا کر راکھ کر دینے کی پالیسی پر عمل کیا جائے گا۔ انہوں نے اہم پلوں کو گرا دینے اور فیکٹریوں اور صنعتی تنصیبات کو تباہ کرنے کی غرض سے اقدامات کو بھی آخری شکل دے دی تھی تاکہ جاپانی ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ جمشید پور کی آئرن اینڈ اسٹیل فیکٹری کو تباہ کرنے کا جو منصوبہ تیار کیا گیا، لوگوں کو کسی نہ کسی طرح اس کی خبر ہوگئی جس کی وجہ سے پورے علاقے میں شدید پریشانی اور بے چینی پھیل گئی۔

میں نے گاندھی جی کو ان تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ اگر جاپانیوں نے ایک مرتبہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھ دیے تو میرے نزدیک ان کے خلاف ہر قسم کا ہتھیار استعمال کرنا ہمارا مقدس فریضہ ہوگا۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ ایک پرانے آقا کے بجائے نئے آقا کا مسلط ہو جانا ناقابل برداشت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی نئے اور جاندار فاتح نے پرانی حکومت کی جگہ لے لی جو رفتہ رفتہ مضمحل ہو رہی تھی اور جس کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی تو اس صورت میں ہمارے قومی مفادات کو بہت زیادہ نقصان پہنچے گا۔ مجھے یقین تھا کہ جاپانیوں جیسی نئی سامراجی طاقت کو نکال باہر کرنا ہمارے لیے کہیں زیادہ مشکل ہوگا۔

میں نے ہندوستان پر جاپانیوں کے امکانی حملے کی پیش بندی کے لیے کچھ تدبیریں اختیار کر لی تھیں۔ میں نے کانگریس سے کہا کہ وہ پروپیگنڈے کے ذریعے پبلک میں جاپانیوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کرے۔ میں نے کلکتے کو کئی وارڈز میں تقسیم کر کے وہاں رضا کاروں کے جتھے بھرتی اور منظم کیے جنھوں نے جاپانیوں کا مقابلہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ ان رضا کاروں کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پیش قدمی کی صورت میں جاپانی فوج کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹ کھڑی کر دیں۔ میری اسکیم یہ تھی کہ جیسے ہی جاپانی فوج بنگال پہنچے اور برطانوی فوج بہار کی طرف پیچھے ہٹنا شروع کر دے، کانگریس آگے بڑھ کر ملک کا کنٹرول سنبھال لے گی اور اس سے پہلے کہ جاپانی اپنے قدم جما سکیں، ہم اپنے رضا کاروں کے ذریعے درمیانی مدت میں اپنی حکومت قائم کر لیں گے۔ نئے دشمن کا مقابلہ کرنے اور اپنی آزادی حاصل کرنے کی یہی ایک صورت تھی۔ مئی اور جون ۱۹۴۲ میں میرا بیشتر وقت اس نئی پالیسی پر غور کرنے اور اسے عملی شکل دینے میں صرف ہوا۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ گاندھی جی کو مجھ سے اتفاق نہیں ہے۔ انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ اگر کبھی جاپانی فوجیں ہندوستان میں آئیں تو وہ ہماری نہیں، برطانیہ کے دشمن کی حیثیت سے یہاں آئیں گی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انگریز یہاں سے چلے گئے تو جاپانی ہندوستان پر حملہ نہیں کریں گے۔ مجھے ان کے اس تجزیے سے اتفاق نہیں تھا اور طویل بحث مباحثے کے باوجود ہمارے درمیان اتفاق رائے پیدا نہ ہو سکا چنانچہ اس اختلاف کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

جولائی کے پہلے ہفتے میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس وردھا میں منعقد ہوا۔ میں ۵ جولائی کو وردھا پہنچا جہاں گاندھی جی نے پہلی مرتبہ ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے بارے میں مجھ سے گفتگو کی۔ میں اس نئے خیال کو آسانی سے اپنے تصورات میں سمو نہ سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم ایک غیر معمولی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ ہماری ہمدردیاں اتحادی طاقتوں کے ساتھ تھیں لیکن برطانوی حکومت نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ اس کے ساتھ ہمارا اتحاد عمل ناممکن ہو گیا۔ ہم صرف ایک آزاد قوم کی حیثیت سے انگریزوں کی طرفداری کر سکتے تھے لیکن انگریز ہمیں اپنی لشکرگاہ کے ملازموں کا درجہ دینا چاہتے تھے۔ دوسری طرف جاپانیوں نے برما پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ آسام کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمیں ایسے کسی بھی قول و فعل سے گریز کرنا چاہیے جس سے جاپانیوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا واقعات رونما ہوتے ہیں اور لڑائی کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ گاندھی جی اس سے متفق نہیں تھے۔ وہ معصر تھے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ کانگریس کو یہ مطالبہ کر دینا چاہیے کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں۔ اگر انگریز راضی ہو گئے تو ہم جاپانیوں سے کہہ سکیں گے کہ وہ اور آگے نہ بڑھیں۔ اس کے باوجود اگر انہوں نے پیش قدمی کی تو اسے برطانیہ پر نہیں، ہندوستان پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس قسم کی صورت حال پیدا ہوئی تو ہمیں پوری قوت کے ساتھ جاپانیوں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

میں پہلے ہی یہ بتا چکا ہوں کہ جب جنگ شروع ہوئی تو میں برطانیہ کی منظم مخالفت کرنے کے حق میں تھا مگر اس وقت گاندھی جی نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ اب جو انہوں نے اپنی رائے تبدیل کر لی تو میری پوزیشن عجیب سی ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت جب دشمن ہندوستان کی سرحد پر تھا، برطانیہ منظم مخالفت کی کسی تحریک کو ہرگز پنپنے نہیں دے گا۔ گاندھی جی کو نہ معلوم کیوں یقین تھا کہ انگریز اس تحریک کے خلاف کوئی اقدام نہیں کریں گے اور اسے اپنے خاص ڈھنگ سے آگے بڑھانے کی اجازت دے دیں گے۔ جب میں نے اصرار کیا کہ وہ وضاحت کے ساتھ بتائیں کہ مزاحمت کا پروگرام کیا ہو گا تو پتا چلا کہ ان کے ذہن میں کوئی خاص پروگرام نہیں ہے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے صرف یہ ایک بات بتائی کہ پچھلے موقعوں کے برعکس اس مرتبہ لوگ رضا کارانہ طور پر گرفتاریاں پیش نہیں کریں گے۔ انہیں گرفتار کرنے والوں کا مقابلہ کرنا چاہیے اور صرف جسمانی طور پر مجبور ہونے کی صورت میں ہی سرکار کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔

مجھے جاپانیوں کے وعدوں پر بھروسا نہیں تھا اور میری رائے تھی کہ ہم ان کے قول پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ مجھے یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا کہ جاپانی انگریزوں کو ملک چھوڑ کر جاتے ہوئے دیکھ کر اپنی فاتحانہ پیش قدمی روک دیں گے۔ مجھے ڈر تھا کہ انگریزوں کی ہندوستان سے واپسی سے جاپانیوں کے حوصلے بڑھیں گے، کیا وہ برطانیہ کی دست برداری کو ہندوستان پر قبضہ کرنے کا بہترین موقع نہیں سمجھیں گے؟ میں ان سوالوں کا کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتا تھا اس لیے مجھے گاندھی جی کی پالیسی اختیار کرنے میں تامل تھا۔

ورکنگ کمیٹی میں جب اس معاملے پر بحث شروع ہوئی تو میں نے ان نکات پر تفصیل کے ساتھ اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ کمیٹی کے ممبروں میں صرف جواہر لعل نے کسی حد تک میری حمایت کی۔ دوسرے ارکان پوری طرح قائل نہ ہونے کے باوجود گاندھی جی کے خلاف رائے دینے کو تیار نہیں تھے۔ جواہر لعل کے سوا، جو اکثر مجھ سے اتفاق کرتے تھے، دوسرے تمام ارکان گاندھی جی کی پیروی کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔ جنگ کے بارے میں سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور آچاریہ کرپلانی کے خیالات پوری طرح واضح نہیں تھے۔ وہ شاذ و نادر ہی ان معاملوں کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے اور اپنی رائے اور فیصلے کو ہمیشہ گاندھی جی کے تابع رکھتے۔ ان حالات میں ان لوگوں کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا اس لیے کہ سب کچھ کہنے سننے کے بعد وہ بس یہی جواب دیتے تھے کہ ہمیں گاندھی جی پر بھروسا کرنا چاہیے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر ہم نے گاندھی جی پر سب کچھ ڈال دیا تو وہ کوئی نہ کوئی راہ نکال لیں گے۔ اس کے ثبوت میں وہ ۱۹۳۰ کی نمک ستیہ گرہ تحریک کی مثال پیش کرتے تھے۔ جب یہ تحریک شروع کی گئی تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ خود حکومت اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھی اور اس کا علانیہ مذاق اڑایا جاتا تھا۔ لیکن آخر میں نمک ستیہ گرہ تحریک بہت کامیاب ثابت ہوئی اور انگریز ہماری شرطیں ماننے پر مجبور ہو گئے۔ سردار پٹیل اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ اس مرتبہ بھی گاندھی جی کو ویسے ہی کامیابی ہوگی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ایسے استدلال سے ہرگز مطمئن نہیں ہوتا تھا۔

گاندھی جی کا غالباً یہ خیال تھا کہ چونکہ جنگ ہندوستان کی سرحد پر پہنچ گئی ہے اس لیے انگریز تحریک شروع ہوتے ہی کانگریس کے ساتھ سمجھوتا کر لیں گے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو بھی انگریز ایسی حالت میں، جب جاپانی ہندوستان کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے، کوئی سخت اقدام نہیں کریں گے۔ ان کی رائے تھی کہ اس طرح کانگریس کو ایک موثر تحریک شروع کرنے کا موقع مل جائے گا۔ میں نے حالات کو دیکھ کر بالکل مختلف نتیجہ نکالا۔ مجھے یقین تھا کہ جنگ کے اس نازک مرحلے میں حکومت کسی عوامی تحریک کو برداشت نہیں کرے گی۔ انگریزوں کے لیے یہ زندگی اور موت کا معاملہ تھا اس لیے وہ فوری اور موثر کارروائی کریں گے۔ میں واضح طور پر یہ دیکھ رہا تھا کہ جیسے ہی ہم نے تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا، حکومت تمام کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کر لے گی اور کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ آگے کیا ہوگا؟

مجھے پختہ یقین تھا کہ موجودہ حالات میں عدم تشدد پر مبنی کوئی تحریک نہ تو شروع کی جا سکتی ہے اور نہ ہی جاری رہ سکتی ہے۔ کوئی بھی تحریک صرف اسی صورت میں تشدد سے پاک رہ سکتی تھی کہ اس کے لیڈر موجود ہوں اور قدم قدم پر اس کی رہنمائی کریں اور میں جانتا تھا کہ جیسے ہی تحریک شروع ہونے کا گمان ہوا، اس کے لیڈروں کو فوراً گرفتار کر لیا جائے گا البتہ اگر کانگریس نے عدم تشدد کی پالیسی سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا تو اس صورت میں تحریک کی کامیابی کی گنجائش موجود تھی کیونکہ ایسے لوگ بھی، جن کی قیادت کرنے والا کوئی نہ ہو، مواصلات کا نظام درہم برہم کر سکتے ہیں، اسٹوروں اور ڈپوؤں کو آگ لگا سکتے ہیں اور سیکڑوں طریقوں سے جنگی کارروائیوں کو سبوتاژ کر سکتے ہیں۔ میں یہ بھی مانتا تھا کہ اس طرح کی عام شورش سب کاموں کو روک دے گی اور انگریز ہم سے معاملہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ ایک پرخطر راستہ تھا لیکن میرا خیال تھا کہ یہ راستہ اختیار کرنے سے پہلے ہمیں پوری ہوشمندی سے کام لینا ہوگا۔ دوسری طرف مجھے اس کا ذرہ بھر امکان نظر نہیں آتا تھا کہ عدم تشدد کی جو تحریک گاندھی جی کے ذہن میں تھی، جنگ کی حالت میں وہ کیسے شروع کی جا سکے گی یا جاری رہ سکے گی۔

ہماری بحثیں ۵ جولائی کو شروع ہوئیں اور کئی دن تک جاری رہیں۔ میں نے پہلے بھی بعض موقعوں پر کئی معاملوں میں گاندھی جی سے اختلاف کیا تھا مگر ایسا کامل اختلاف پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ معاملہ اس وقت انتہا کو پہنچ گیا جب انہوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں یہ کہا گیا کہ ہمارے خیالات ایک دوسرے سے اس قدر دور ہو گئے ہیں کہ ہم اکٹھے کام نہیں کر سکتے۔ اگر کانگریس یہ چاہتی ہے کہ گاندھی جی تحریک کی قیادت کریں تو اس صورت میں مجھے صدارت سے استعفا دے کر ورکنگ کمیٹی سے بھی الگ ہو جانا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ جواہر لعل کو بھی یہی کرنا چاہیے۔ میں نے فوراً جواہر لعل کو بلایا اور انہیں گاندھی جی کا یہ خط دکھایا۔ سردار پٹیل بھی اتفاق سے آ گئے اور انہیں گاندھی جی کا خط پڑھ کر صدمہ ہوا۔ وہ فوری طور پر گاندھی جی کے پاس گئے اور اس کارروائی پر ان سے شدید احتجاج کیا۔ پٹیل نے کہا کہ اگر میں نے صدارت سے استعفا دے دیا اور جواہر لعل اور میں نے ورکنگ کمیٹی کو چھوڑ دیا تو ملک پر اس کے تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے۔ اس سے نہ صرف عوام میں انتشار پیدا ہوگا بلکہ کانگریس کی بنیادیں بھی ہل جائیں گی۔

گاندھی جی نے مجھے یہ خط ۷ جولائی کو صبح سویرے بھیجا تھا۔ بارہ بجے کے قریب انہوں نے مجھے بلایا اور ایک لمبی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انہوں نے صبح کو مجھے جلدی میں خط لکھا تھا، اب انہوں نے اس معاملے پر مزید غور و خوض کیا ہے اور وہ یہ خط واپس لینا چاہتے ہیں۔ آخر مجھے ان کی بات ماننا ہی پڑی۔ سہ پہر تین بجے جب ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا تو پہلی بات جو گاندھی جی نے کہی وہ یہ تھی کہ گنہگار نادم ہو کر مولانا کے پاس واپس آ گیا ہے۔

ہم مجوزہ تحریک کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے لگے۔ گاندھی جی نے واضح طور پر کہا کہ کانگریس کی دوسری تحریکوں کی طرح یہ تحریک بھی عدم تشدد پر مبنی ہوگی البتہ تشدد کے سوا ہر طریق کار جائز ہو گا۔ بحث کے دوران جواہر لعل نے کہا کہ گاندھی جی کے ذہن میں جو کچھ ہے وہ دراصل ایک کھلی بغاوت ہے چاہے اس بغاوت میں تشدد نہ ہو۔ گاندھی جی کو یہ اصطلاح پسند آئی اور انہوں نے کھلے ہوئے بے تشدد انقلاب کا کئی مرتبہ ذکر کیا۔ ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ کو ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس کا مطلب یہ تھا کہ گو اس وقت گاندھی یہ محسوس نہیں کرتے تھے لیکن برطانیہ کے ساتھ مذاکرات کے امکانات عملاً ختم ہو چکے تھے۔ میں اس قرارداد کو یہاں درج کرنا ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ اب یہ قرارداد ہندوستان کی تاریخ کا حصہ بن چکی ہے اور اسے ''ہندوستان چھوڑ دو قرارداد'' کا اولیں مسودہ قرار دیا جا چکا ہے۔

ساتواں باب

ہندوستان چھوڑ دو

ورکنگ کمیٹی کی قرارداد شائع ہوئی تو پورے ملک میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے اس قرارداد کے نتائج پر غور نہ کیا بلکہ وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ کانگریس بالآخر برطانیہ کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے عوامی تحریک شروع کر رہی ہے چنانچہ عوام اور حکومت دونوں ہی بہت جلد اس قرارداد کو ہندوستان چھوڑ دو قرارداد کے نام سے موسوم کرنے لگے۔ ورکنگ کمیٹی کے بعض ارکان کی طرح عوام بھی گاندھی جی سے کامل عقیدت رکھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ انہوں نے کوئی ایسی تجویز سوچی ہے جو حکومت کو مفلوج کر دے گی اور اس طرح وہ مصالحت پر مجبور ہو جائے گی۔ میں یہاں یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ بہت سے لوگ یہ سوچتے تھے کہ گاندھی جی ہندوستان کو جادو کے ذریعے یا انسانی فہم و طاقت سے ماورا طریقوں سے آزادی دلوا دیں گے اس لیے وہ ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ اس کے لیے وہ کوئی ذاتی کوشش کریں۔

ورکنگ کمیٹی نے قرارداد منظور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ وہ حکومت کے ردعمل کا انتظار کرے گی۔ اگر حکومت نے مطالبے کو تسلیم کر لیا یا کم سے کم صلح جوئی کا رویہ اختیار کیا تو مزید گفتگو کے لیے گنجائش رہے گی۔ اس کے برعکس اگر حکومت نے مطالبے کو مسترد کر دیا تو اس صورت میں گاندھی جی کی قیادت میں ایک تحریک شروع کی جائے گی۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ حکومت دباؤ میں آ کر مذاکرات نہیں کرے گی۔ بعد میں رونما ہونے والے واقعات نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی۔

وردھا میں غیر ملکی اخبارات کے نمائندوں کا ہجوم ہو گیا کیونکہ وہ بے چینی کے ساتھ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ورکنگ کمیٹی کیا فیصلہ کرتی ہے؟ ۱۵ جولائی کو گاندھی جی نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر تحریک چلائی گئی تو یہ برطانوی حکومت کے خلاف ایک بے تشدد بغاوت ہو گی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں پوری صورت حال سے ناخوش تھا۔ میں نے اس قرارداد کی مخالفت نہ کی جس میں راست اقدام کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا بلکہ میں اس کے نتائج کے بارے میں بھی زیادہ پر امید نہیں تھا۔

قرارداد منظور ہونے کے بعد مہادیو ڈیسائی نے مس سلیڈ (ہندوستان میں وہ عرف عام میں میرا بہن کہلاتی تھیں) سے کہا کہ انہیں وائسرائے سے ملاقات کر کے قرارداد کی منشا کی وضاحت کرنی چاہیے۔ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ وائسرائے کو مجوزہ تحریک کی نوعیت اور اس کے طریق کار کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ مس سلیڈ

وائسرائے سے ملاقات کے لیے وردھا سے روانہ ہوگئیں اور ملاقات کی درخواست کی۔ وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری نے جواب دیا کہ چونکہ گاندھی جی نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ بغاوت کے بارے میں سوچ رہے ہیں اس لیے وائسرائے ان سے ملاقات کرنے کو تیار نہیں۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ حکومت جنگ کے زمانے میں تشدد یا عدم تشدد پر مبنی کسی بھی بغاوت کو ہرگز برداشت نہیں کرے گی نیز حکومت اس قسم کی باتیں کرنے والی کسی تنظیم کے نمائندے سے ملاقات یا گفتگو کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

اس انکار کے بعد میرا ابہن وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری سے ملیں اور ان کے ساتھ طویل گفتگو کی۔ اس وقت میں دہلی میں تھا اور انہوں نے مجھے اس گفتگو کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد وہ واپس وردھا چلی گئیں اور گاندھی جی سے اس ملاقات کا حال بیان کیا۔ اس کے فوراً بعد مہادیو ڈیسائی نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ گاندھی جی کے ارادوں کے بارے میں غالباً کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ انہوں نے کہا یہ صحیح نہیں ہے کہ گاندھی جی نے مجوزہ تحریک کو برطانیہ کے خلاف کھلی بے تشدد بغاوت قرار نہیں دیا۔

مجھے کہنا پڑتا ہے کہ مہادیو ڈیسائی کے اس بیان پر مجھے کسی قدر حیرت ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ بے تشدد بغاوت کی اصطلاح جواہر لعل نے ایجاد کی تھی اور پھر گاندھی کئی موقعوں پر یہ اصطلاح استعمال کرتے رہے۔ ممکن ہے کہ ان کے ذہن میں اس کا کوئی مخصوص مفہوم ہو لیکن عام پبلک نے ان کے اس بیان کا مطلب یہ سمجھا کہ کانگریس نے برطانوی حکومت کو اقتدار سے دستبردار ہونے پر مجبور کرنے کے لیے بجز تشدد آمیز شورش کے باقی تمام ذرائع استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں نے پہلے سے ممکنہ برطانوی ردعمل کا اندازہ کرلیا تھا اور جب وائسرائے نے گاندھی جی یا ان کے نمائندے کے ساتھ ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تو مجھے اس پر کوئی تعجب نہ ہوا۔

ان واقعات کے پس منظر میں مستقبل کی صورت حال پر غور اور ورکنگ کمیٹی کی تجویز کی توثیق کرنے کے لیے میں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس سے حکومت کو پوری صورت حال کا جائزہ لینے کا وقت مل جائے گا چنانچہ ۷ اگست ۱۹۴۲ کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بلالیا گیا۔

۱۴ جولائی سے ۵ اگست تک میرا تمام تر وقت ملک کے مختلف حصوں کے کانگریسی لیڈروں سے ملاقاتیں کرنے میں صرف ہوا۔ میں انہیں ذہن نشین کرانا چاہتا تھا کہ اگر حکومت نے ہمارا مطالبہ مان لیا یا کم سے کم ہمیں کام کرنے کی اجازت دے دی تو تحریک چلانے کے سلسلے میں گاندھی جی کی پالیسی پر سختی سے عمل کیا جائے گا البتہ حکومت نے کوئی انتہائی اقدام اٹھایا تو اس صورت میں عوام کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ حکومت کے تشدد کا مقابلہ

کرنے کے لیے جو بھی طریقہ کار مناسب سمجھیں، اختیار کریں۔ اس وقت صورت حال کا جو نقشہ میرے سامنے تھا اس کے مطابق بنگال، بہار، یو پی، سی پی، بمبئی اور دہلی پوری طرح تیار تھے اور ان صوبوں میں زوردار تحریک چلنے کے روشن امکانات موجود تھے۔ جہاں تک دوسرے صوبوں کا تعلق تھا، میں نے وہاں مناسب فضا پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی البتہ مجھے اعتراف ہے کہ وہاں کی صحیح صورت حال میرے سامنے واضح شکل میں نہیں تھی۔

وائسرائے نے میرا بہن کے ساتھ ملاقات سے انکار کر دیا تو گاندھی جی نے یہ محسوس کیا کہ حکومت آسانی سے جھکنے والی نہیں ہے۔ اس سے ان کے اعتماد کو سخت دھچکا لگا البتہ انہیں اب بھی یقین تھا کہ حکومت کوئی سخت اقدام نہیں اٹھائے گی۔ ان کا خیال تھا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد انہیں پروگرام تیار کرنے کے لیے خاصا وقت مل جائے گا اور وہ بتدریج تحریک کی رفتار کو تیز کر سکیں گے۔ میں ان کی اس خوش فہمی کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔ ۲۸ جولائی کو میں نے انہیں ایک تفصیلی خط لکھا جس میں میں نے کہا کہ حکومت پوری طرح تیار ہے اور وہ بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد فوری کارروائی کرے گی۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ مجھے نتیجہ نکالنے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے، وہ خود بھی صورت حال کا جائزہ لے رہے ہیں اور انہیں اب بھی یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکل آئے گی۔

۳ اگست کو میں کلکتے سے بمبئی روانہ ہو گیا۔ مجھے پورا یقین تو نہ تھا البتہ میرا دل یہ کہتا تھا کہ میں ایک طویل عرصے کے لیے کلکتے سے جدا ہو رہا ہوں۔ مجھے یہ اطلاعات بھی ملی تھیں کہ حکومت نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دے دی ہے اور وہ قرارداد کی منظوری کے فوراً بعد تمام لیڈروں کو گرفتار کر لے گی۔

ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۵ اگست کو منعقد ہوا جس میں ۷ اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کے لیے قرارداد کا مسودہ تیار کیا گیا۔ میں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کمیٹی کے پچھلے اجلاس کے بعد رونما ہونے والے واقعات کا مختصر خاکہ پیش کیا۔ میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان اسباب کی بھی وضاحت کی جنہوں نے ورکنگ کمیٹی کو اپنا رویہ تبدیل کرنے اور ہندوستان کو آزادی دلانے کے لیے قوم کو تحریک شروع کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ میں نے واضح کیا کہ اس وقت، جب ہماری قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے، ہماری قوم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتی۔ ہندوستان جمہوری ملکوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا تھا لیکن برطانوی حکومت نے باعزت تعاون کی راہیں بند کر کے اسے ناممکن بنا دیا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ جاپانی حملہ آور دروازے پر آ گیا ہے اس لیے قوم اپنے اندر حملہ آور کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ برطانیہ اگر چاہے تو وہ سنگاپور، ملایا اور برما کی طرح ہندوستان کو بھی خالی کر سکتا ہے لیکن ہندوستانی ملک کو نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ یہ ان کا اپنا وطن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنے اندر اتنی طاقت پیدا کرنی چاہیے کہ وہ برطانوی زنجیروں کو توڑ سکیں اور کسی بھی نئے حملہ آور کا منہ توڑ جواب دے سکیں۔

ماسوائے مٹھی بھر کمیونسٹوں کے، جنہوں نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تمام ارکان نے ورکنگ کمیٹی کے مسودہ قرارداد کا خیر مقدم کیا۔ گاندھی جی نے بھی اجلاس سے خطاب کیا اور دو روز کی بحث اور غور و خوض کے بعد ۸ اگست کی شام کو تاریخی ہندوستان چھوڑ دو قرارداد کی منظوری دے دی گئی۔

میں بمبئی جاتا تو عام طور پر آنجہانی بھولا بھائی ڈیسائی کے ہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ اس مرتبہ بھی میں وہیں ٹھہرا۔ اس وقت وہ علیل تھے اور کچھ عرصے سے ان کی طبیعت ناساز تھی اس لیے جب میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد واپس آیا اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ میرا انتظار کر رہے ہیں تو مجھے قدرے تعجب ہوا۔ رات خاصی گزر چکی تھی اور میں بہت تھکا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی سو گئے ہوں گے۔ میں نے اس قدر دیر تک جاگنے پر ان کی سرزنش کی لیکن انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے ایک عزیز محمد طاہر، جن کا بمبئی میں کاروبار تھا، مجھ سے ملنے آئے تھے اور بہت دیر تک میرا انتظار کرتے رہے ہیں۔ جب میں وہاں نہ پہنچا تو وہ بھولا بھائی ڈیسائی کے پاس میرے لیے ایک پیغام چھوڑ کر چلے گئے۔ محمد طاہر کے بمبئی پولیس میں ایک دوست تھے۔ ان سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ کانگریس کے تمام لیڈروں کو اگلی صبح گرفتار کر لیا جائے گا۔ طاہر کے دوست نے انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا مگر اطلاع یہ ہے کہ ہم سب کو ہندوستان کے باہر غالباً جنوبی افریقا بھیج دیا جائے گا۔

میں نے کلکتے سے روانگی سے پہلے بھی اس قسم کی افواہیں سنی تھیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ افواہیں بے بنیاد نہیں ہیں۔ جب حکومت نے ہم سب کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا تو اسے یہ خیال بھی آیا کہ ہمیں ہندوستان میں رکھنا مصلحت کے خلاف ہے چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اس سلسلے میں جنوبی افریقا کی حکومت سے رابطے بھی کر لیے گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عین وقت پر کوئی رکاوٹ پیش آ گئی جس کی وجہ سے بعد میں حکومت کو یہ فیصلہ بدلنا پڑا۔ ہمیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ حکومت نے یہ طے کیا ہے کہ گاندھی جی کو پونا میں نظر بند کیا جائے گا اور ہم لوگوں کو قلعہ احمد نگر جیل میں قید کر دیا جائے گا۔

بھولا بھائی اس خبر سے سخت پریشان تھے اور اسی وجہ سے وہ اب تک میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں بہت ہی تھکا ہوا تھا اور اس قسم کی افواہیں سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے بھولا بھائی کو بتایا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو میرے پاس آزادی کے صرف چند گھنٹے باقی ہیں اس لیے بہتر ہے کہ میں کھانا کھا کر جلد سو رہوں تاکہ صبح کو پیش آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہوں۔ بہتر یہی ہے کہ میں افواہوں کے بارے میں قیاس آرائیوں کے بجائے آزادی کے چند گھنٹے اپنی مرضی سے گزاروں۔ بھولا بھائی نے اس سے اتفاق کیا اور میں جلد ہی بستر پر لیٹ گیا۔

میں ہمیشہ سے صبح سویرے اٹھنے کا عادی ہوں۔ آج صبح بھی میں چار بجے اٹھ گیا مگر میں اب بھی بہت

تھکا ہوا تھا اور سر بھاری بھاری سا تھا۔ میں نے اسپرین کی دو گولیاں کھائیں، چائے کی ایک پیالی پی اور کام کرنے بیٹھ گیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ منظور شدہ قرارداد کی ایک نقل خط کے ساتھ صدر روز ویلٹ کو بھیجی جائے گی۔ ہم نے سوچا کہ صدر روز ویلٹ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے میں جس قدر دلچسپی لے رہے ہیں، اس کے پیش نظر کم سے کم اتنا تو ہونا ہی چاہیے۔ میں نے صدر روز ویلٹ کے نام خط لکھنا شروع کیا لیکن اسے مکمل نہ کر سکا۔ شاید تھکن کی وجہ سے یا اسپرین کے باعث مجھے نیند آنے لگی اور میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔

میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ سویا ہوں گا کہ میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میرے پاؤں چھوئے ہیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو بھولا بھائی کا بیٹا دھیرو بھائی ڈیسائی ہاتھ میں ایک کاغذ لیے کھڑا تھا، میں سمجھ گیا کہ وہ کیا ہے۔ دھیرو بھائی نے مجھے بتایا کہ بمبئی پولیس کا ڈپٹی کمشنر میری گرفتاری کا وارنٹ لایا ہے اور برآمدے میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں نے دھیرو بھائی سے کہا کہ وہ ڈپٹی کمشنر سے کہہ دیں کہ مجھے تیار ہونے میں تھوڑا سا وقت لگے گا۔

میں نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کیے۔ میں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خان کو، جو اس وقت تک اٹھ کر میرے پاس آ چکے تھے، ضروری ہدایات بھی دے دیں، اس کے بعد میں برآمدے میں آ گیا۔ بھولا بھائی اور ان کی بہو ڈپٹی کمشنر کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے مسکرا کر بھولا بھائی سے کہا کہ ان کے دوست پچھلی شام کو جو خبر لائے تھے، وہ درست ثابت ہوئی ہے۔ پھر میں نے ڈپٹی کمشنر سے مخاطب ہو کر کہا: ''میں تیار ہوں۔'' یہ صبح کے پانچ بجے کا عمل تھا۔

میں ڈپٹی کمشنر کی کار میں بیٹھ گیا۔ ایک دوسری کار میں میرا سامان رکھ دیا گیا اور وہ ہمارے پیچھے چل پڑی۔ ہم سیدھے وکٹوریہ ٹرمینس پہنچ گئے۔ یہ لوکل ٹرینوں کا وقت تھا لیکن ریلوے اسٹیشن مکمل طور پر خالی تھا۔ شاید تمام گاڑیاں اور مسافر تھوڑی دیر کے لیے روک دیے گئے تھے۔ میں جیسے ہی کار سے اترا، میری اشوک مہتا پر نظر پڑ گئی۔ انہیں بھی گرفتار کر کے وکٹوریہ ٹرمینس پر لایا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ حکومت نے نہ صرف ورکنگ کمیٹی کے ممبروں بلکہ بمبئی کے مقامی کانگریسی لیڈروں کو بھی حراست میں لے لیا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پورے ہندوستان میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہوگا۔ پلیٹ فارم پر ایک ٹرین ہمارے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس وقت ایک انجن ڈائننگ کار کو گاڑی کے ساتھ لگا رہا تھا۔ یہ کوریڈور والی گاڑی تھی جو عام طور پر بمبئی اور پونا کے درمیان چلتی تھی۔ مجھے ایک کمپارٹمنٹ میں پہنچا دیا گیا جہاں میں کھڑکی کے پاس نشست پر بیٹھ گیا۔

اس کے فوراً بعد ہی جواہر لعل، آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود وہاں پہنچ گئے۔ جواہر لعل نے مجھے بتایا کہ گاندھی جی کو بھی اسٹیشن لایا گیا ہے اور وہ ایک دوسرے ڈبے میں بیٹھ گئے ہیں۔ ایک یورپی فوجی افسر نے

ہمارے پاس آ کر پوچھا کہ آیا ہم چائے پینا چاہتے ہیں؟ میں پہلے ہی ایک کپ پی چکا تھا لیکن دوبارہ منگوالی۔

اس موقع پر ایک اور فوجی افسر آیا اور اس نے ہم لوگوں کی گنتی شروع کر دی۔ وہ کسی وجہ سے چکرایا ہوا تھا کیونکہ اس نے ہم لوگوں کو کئی بار گنا۔ جب وہ ہمارے کمپارٹمنٹ میں آیا تو اس نے بلند آواز میں کہا: ''تیس''۔ جب اس نے دو تین مرتبہ یہی کیا تو میں نے اتنی ہی بلند آواز میں کہا: ''بتیس''۔ اس سے وہ مزید پریشان ہو گیا اور اس نے ایک مرتبہ پھر گنتی شروع کر دی۔ اس کے فوراً بعد گارڈ نے سیٹی بجا دی اور گاڑی چل پڑی۔ میں نے مسز آصف علی کو پلیٹ فارم پر کھڑے دیکھا۔ وہ اپنے شوہر کو رخصت کرنے آئی تھیں۔ جب گاڑی چلنے لگی تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا: ''میری فکر نہ کیجئے گا، میں اپنے لیے کوئی کام نکال لوں گی اور بیکار نہیں بیٹھوں گی''۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ کر دکھایا۔

میں ابھی بتا چکا ہوں کہ ہماری گاڑی میں کوریڈور تھا۔ اب مسز نائیڈو ہمارے ڈبے میں آ کر کہنے لگیں کہ گاندھی جی ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم کوریڈور سے ہوتے ہوئے ان کے ڈبے میں چلے گئے جو ذرا فاصلے پر تھا۔ گاندھی جی بہت افسردہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے انہیں کبھی اس قدر اداس اور رنجیدہ نہیں دیکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ انہیں اس قدر اچانک گرفتاری کا اندازہ نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت کوئی سخت کارروائی نہیں کرے گی۔ گو میں انہیں بار بار انتباہ کر چکا تھا کہ وہ بہت زیادہ خوش فہمی سے کام لے رہے ہیں مگر ظاہر ہے کہ انہیں اپنی رائے پر زیادہ اعتماد تھا۔ اب چونکہ ان کے تمام اندازے غلط ثابت ہو چکے تھے اس لیے وہ یہ طے نہیں کر پا رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے؟

ہم نے ابھی ایک یا دو منٹ تک بات کی تھی کہ گاندھی جی کہنے لگے: ''آپ اپنے ٹھکانے پر پہنچتے ہی حکومت کو بتا دیں کہ آپ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے آپ کو اپنے پرائیویٹ سیکرٹری اور دوسری سہولتوں کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ جب آپ پچھلی مرتبہ گرفتار کیے گئے تھے اور جیل میں بند تھے تو حکومت نے آپ کو یہ سہولتیں مہیا کی تھیں۔ آپ کو اس قسم کی سہولتوں کا دوبارہ مطالبہ کرنا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو اسے ایک مسئلہ بنا لینا چاہیے۔''

میں گاندھی جی سے اتفاق نہ کر سکا۔ میں نے انہیں بتایا کہ اب صورت حال بالکل مختلف ہے۔ ہم نے کھلی آنکھوں سے یہ راستہ اختیار کیا ہے اس لیے اب ہمیں نتائج کا بھی سامنا کرنا چاہیے۔ یہ بات تو میری سمجھ میں آ سکتی تھی کہ میں کانگریس کی طرف سے اٹھائے گئے کسی مسئلے پر لڑوں مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں اتنے معمولی مسئلے پر کہ مجھے بعض ذاتی سہولتیں مہیا کی جائیں، لڑنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ میں اس مطالبے کو حق بجانب نہیں سمجھتا تھا کہ مجھے کانگریس کے کاموں کو انجام دینے کے لیے پرائیویٹ سیکرٹری رکھنے کی اجازت ملے۔ موجودہ حالات میں یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس کے لیے لڑائی کی جائے۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بمبئی کا پولیس کمشنر، جو ہمارے ساتھ ہی ٹرین میں سفر کر رہا تھا، اندر آ گیا۔ اس نے ہمیں اپنے کمپارٹمنٹ میں جانے کے لیے کہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ صرف مسز نائیڈو ہی گاندھی جی کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ اس کے بعد جواہر لعل اور میں اپنے ڈبے میں واپس آ گئے۔ اب ٹرین تیزی کے ساتھ کلیان کی طرف جا رہی تھی لیکن وہ کلیان میں نہ ٹھہری اور پونا کا راستہ اختیار کر لیا۔ میں نے سوچا کہ غالباً ہمیں پونا میں نظر بند کر دیا جائے گا۔ جب گاڑی وہاں رکی تو مجھے یقین ہو گیا کہ میرا خیال صحیح ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گرفتاری کی خبر کسی نہ کسی طرح پونا پہنچ گئی تھی۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف پولیس تھی اور پبلک میں سے کسی کو وہاں آنے کی اجازت نہیں تھی البتہ پل کے اوپر بڑا اژدھام تھا۔ جیسے ہی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی، لوگوں نے ''مہاتما گاندھی کی جے'' کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ اس پر پولیس نے لوگوں پر لاٹھی چارج شروع کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا اسے حکومت کی طرف سے یہ احکامات موصول ہوئے ہیں کہ کسی قسم کا مظاہرہ کرنے یا نعرے لگانے کی اجازت نہ دی جائے۔

جواہر لعل بھی کھڑکی کے قریب بیٹھے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے دیکھا کہ پولیس لاٹھی چارج کر رہی ہے، وہ ڈبے سے باہر کود پڑے اور چلاتے ہوئے آگے بڑھ کر کہنے لگے: ''تمہیں لاٹھی چارج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' پولیس کمشنر ان کے پیچھے لپکا اور انہیں ان کے ڈبے میں لانے کی کوشش کی۔ جواہر لعل نے اس کا کہا نہیں سنا اور غصے میں باتیں کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ورکنگ کمیٹی کے ایک اور ممبر شنکر راؤ دیو بھی پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ چار پولیس والوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور انہیں گاڑی میں واپس جانے کے لیے کہا۔ جب انہوں نے جانے سے انکار کیا تو پولیس اہلکار انہیں زبردستی اٹھا کر ڈبے میں لے آئے۔ میں نے جواہر لعل سے کہا کہ وہ اندر آ جائیں۔ جواہر لعل غصے میں بپھرے ہوئے تھے لیکن انہوں نے میرا کہنا مان لیا۔ پولیس کمشنر میرے پاس آیا اور اس نے دو تین مرتبہ مجھ سے کہا: ''جناب والا! مجھے سخت افسوس ہے مگر مجھے یہی حکم دیا گیا ہے اور میں انہیں بجا لانے پر مجبور ہوں''۔

میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ مسز نائیڈو اور گاندھی جی کو گاڑی سے اتار لیا گیا ہے۔ بمبئی کا ایک اور شخص بھی گاڑی سے اترا اور اس نے پلیٹ فارم پر جانے کی کوشش کی لیکن پولیس نے اسے روک لیا۔ پھر بھی وہ اس وقت تک باز نہ آیا جب تک پولیس نے اسے پکڑ کر زبردستی نہیں روک لیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ گاندھی جی کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ موجودہ تحریک کے دوران کوئی شخص رضاکارانہ طور پر گرفتاری نہیں دے گا بلکہ جب اس پر سختی اور زبردستی کی جائے، اس وقت وہ جیل جانے پر آمادہ ہو گا۔

جب گاندھی جی اتر گئے تو ٹرین دوبارہ روانہ ہوگئی۔ اب میں نے محسوس کیا کہ ہمیں احمد نگر لے جایا جا رہا ہے۔ ہم دن کے ڈیڑھ بجے اسٹیشن پر پہنچے۔ سوائے چند پولیس افسروں اور ایک فوجی افسر کے پلیٹ فارم پر کوئی نہیں تھا۔ ہم سے اترنے کے لیے کہا گیا اور ہمیں کاروں میں سوار کر دیا گیا جو ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ کاریں فوراً روانہ ہوگئیں اور سیدھی قلعے کے اندر جا کر پھاٹک پر رک گئیں۔ وہاں فوج کا ایک افسر کھڑا تھا۔ پولیس کمشنر نے ایک فہرست نکال کر اسے دے دی۔ فوجی افسر باری باری ہمارا نام پکارتا اور ہمیں قلعے میں داخل کرتا گیا۔ دراصل اس طرح پولیس کمشنر ہمیں فوجی حکام کے حوالے کر رہا تھا۔ اب ہم فوج کی تحویل میں آ چکے تھے۔

آٹھواں باب

قلعہ احمد نگر جیل

ورکنگ کمیٹی کے نو ارکان کو میرے ساتھ قلعہ احمد نگر جیل میں لایا گیا جن کے نام یہ تھے: جواہر لعل، سردار پٹیل، آصف علی، شنکر راؤ دیو، گووند بلبھ پنت، ڈاکٹر پٹا بھی، سیتا رمیا، ڈاکٹر سید محمود، آچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر پروفلا گھوش۔ راجن بابو بھی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے لیکن چونکہ وہ بمبئی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوئے تھے اس لیے انہیں پٹنہ میں گرفتار کر کے وہیں نظر بند کر دیا گیا۔

ہمیں قلعے کے اندر ایک ایسی عمارت میں لے جایا گیا جو فوجی بیرک معلوم ہوتی تھی۔ اس عمارت کا صحن کوئی دو سو فٹ لمبا تھا جس کے چاروں طرف کمرے تھے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اطالوی قیدیوں کو یہاں رکھا جاتا تھا۔ پونا کے ایک جیلر نے، جسے تبدیل کر کے یہاں تعینات کیا گیا تھا، ہمارے سامان کی جانچ پڑتال کی۔ میرے پاس ایک چھوٹا سا ریڈیو تھا جسے میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ میرا دوسرا سامان اندر بھیج دیا گیا لیکن ریڈیو کو قبضے میں لے لیا گیا اور رہا ہونے تک میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ہمیں لوہے کی طشتریوں میں رات کا کھانا دے دیا گیا۔ ہمیں یہ بات پسند نہ آئی اور میں نے جیلر کو بتا دیا کہ ہم چینی کی پلیٹوں میں کھانے کے عادی ہیں۔ جیلر نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ آج تو ڈنر سیٹ کا انتظام نہیں ہو سکے گا البتہ کل ضرور ڈنر سیٹ حاصل کر لیا جائے گا۔ پونا کے ایک سزا یافتہ قیدی کو کھانا پکانے کے لیے لایا گیا تھا لیکن وہ ہماری پسند کے مطابق کھانا تیار نہ کر سکا۔ اسے جلد ہی تبدیل کر کے ایک بہتر باورچی تعینات کر دیا گیا۔

ہماری نظر بندی کے مقام کو راز میں رکھا گیا تھا۔ مجھے یہ بات حماقت آمیز معلوم ہوئی کیونکہ حقائق کو زیادہ دیر تک چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔ بہ ہر حال مجھے حکومت کے اس اقدام پر زیادہ تعجب نہ ہوا۔ غالباً ایسے موقعوں پر سب حکومتیں ہی ایسے احمقانہ اقدامات کرتی ہیں۔ دو یا تین دن کے بعد بمبئی کے جیل خانوں کا انسپکٹر جنرل ہمارے ساتھ ملاقات کے لیے قلعے میں آیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ سرکاری احکامات کے مطابق ہم اپنے عزیزوں تک کو خط نہیں لکھ سکتے اور نہ ہی ان کا کوئی خط ہمیں موصول ہو سکتا ہے۔ ہمیں کوئی اخبار بھی مہیا نہیں کیا جائے گا۔ اس نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ یہ احکامات بہت سخت ہیں اور اسے ان کی تعمیل کرنا ہو گی البتہ اس نے واضح کیا کہ اس کے سوا ہماری کسی اور ضرورت کو وہ خوشی سے پورا کرے گا۔

۳ اگست کو جب میں کلکتے سے بمبئی روانہ ہوا تو میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے دوران بھی انفلوئنزا میں مبتلا رہا اور حکومت کو اس کا اچھی طرح علم تھا۔ انسپکٹر جنرل ایک ڈاکٹر تھا اور میرا معائنہ کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس پر راضی نہ ہوا۔

ہم پوری دنیا سے مکمل طور پر کٹ چکے تھے اور ہمیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ قلعے کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، ہمارے کمرے ایک صحن کے چاروں طرف واقع تھے۔ میں ایک طرف کے پہلے کمرے میں تھا۔ اگلے کمرے میں جواہر لعل تھے اور تیسرے کمرے میں آصف علی اور ڈاکٹر سید محمود۔ اس لائن کا آخری کمرہ ہمارا ڈرائنگ روم تھا۔ ہم صبح آٹھ بجے ناشتے پر ملتے اور پھر گیارہ بجے دوپہر کے کھانے پر۔ اس کے بعد سب لوگ میرے کمرے میں جمع ہو جاتے اور ہم دو گھنٹے تک مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کرتے۔ پھر ہم کچھ دیر تک آرام کرتے اور سہ پہر چار بجے چائے پر دوبارہ اکٹھے ہو جاتے۔ چائے کے بعد ہم صحن میں کچھ ورزش کرتے۔ ہمیں آٹھ بجے رات کا کھانا دے دیا جاتا اور ہماری بحث و گفتگو دس بجے تک جاری رہتی۔ اس کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔

جب ہمیں قلعے میں لایا گیا تو وہاں سبزے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جواہر لعل نے تجویز پیش کی کہ اس جگہ ہمیں پھول لگانے چاہئیں کیونکہ اس طرح ہم مشغول رہ سکیں گے اور یہ جگہ بھی خوبصورت ہو جائے گی۔ ہم نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور پھولوں کے بیجوں کے لیے پونا لکھ دیا۔ اس کے بعد ہم لوگ کیاریاں تیار کرنے میں جت گئے۔ جواہر لعل ہم سب سے آگے تھے۔ ہم نے کوئی تیس یا چالیس قسم کے بیج بوئے۔ ہم کیاریوں میں پانی دیتے، ان کی صفائی کرتے اور بڑے ذوق اور محویت کے ساتھ کلیوں کو پودوں سے نکلتے دیکھتے رہے۔ جب پھول کھلنے لگے تو صحن حسن اور رعنائی کا منظر پیش کرنے لگا۔

ہمیں جیل میں آئے پانچ دن ہوئے تھے کہ ایک افسر وہاں آ گیا جس کے متعلق ہمیں معلوم ہوا کہ اسے ہماری دیکھ بھال کے لیے سپرنٹنڈنٹ جیل تعینات کیا گیا ہے۔ وہ شہر میں رہتا تھا اور روزانہ صبح آٹھ بجے قلعے میں آتا اور شام کو چلا جاتا۔ ہمیں اس کا نام معلوم نہیں تھا اس لیے ہم نے سوچا کہ ہمیں اس کا کوئی نام رکھنا چاہیے۔ مجھے یاد تھا کہ جب چاند بی بی کو اسی جیل میں نظر بند کیا گیا تو چیتا خان نامی حبشی ان کا جیلر تھا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں اپنے سپرنٹنڈنٹ کا بھی یہی نام رکھنا چاہیے۔ میرے ساتھیوں نے فوراً مجھ سے اتفاق کیا اور یہ نام جلد ہی اس قدر مقبول ہو گیا کہ ہر شخص اسے چیتا خان کہنے لگا۔ تین چار دن کے بعد جیلر نے جب ہمیں بتایا کہ چیتا خان صبح سویرے وہاں سے چلا گیا ہے تو مجھے یہ خبر سن کر بہت تعجب ہوا۔

جسے میں چیتا خان کہتا تھا وہ جاپانیوں کے حملے اور جزائر انڈیمان پر قبضے کے وقت پورٹ بلیئر میں تھا۔

۲۵ اگست کو میں نے وائسرائے کو ایک خط لکھا۔ میں نے کہا مجھے یہ شکایت نہیں ہے کہ حکومت نے مجھے اور میرے رفقا کو گرفتار کرنا ضروری سمجھا البتہ ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے، مجھے اس کی شکایت ہے۔ سزا یافتہ مجرموں تک کو قریبی عزیزوں سے خط و کتابت کرنے کی اجازت ہوتی ہے لیکن ہمیں اس سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔ میں نے مزید لکھا کہ میں دو ہفتے انتظار کروں گا اور اگر حکومت کی جانب سے مجھے کوئی اطمینان بخش جواب موصول نہ ہوا تو میرے ساتھی اور میں یہ فیصلہ کریں گے کہ اس کے بعد ہمیں کیا کارروائی کرنی چاہیے۔

۱۰ ستمبر کو چیتا خان نے آ کر اطلاع دی کہ حکومت نے ہمیں ہفتے میں ایک مرتبہ اپنے عزیزوں کو خط لکھنے کی اجازت دے دی ہے اور ہمیں روزانہ ایک اخبار بھی مل جایا کرے گا چنانچہ ٹائمز آف انڈیا کی ایک کاپی میری میز پر رکھ دی گئی اور اس کے بعد یہ اخبار باقاعدگی کے ساتھ ہمیں ملتا رہا۔ اس رات میں نے طویل عرصے کے بعد اخبار پڑھا۔ ایک ماہ سے زیادہ مدت تک ہمیں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اب ہمیں اپنی گرفتاری کے بعد ملک میں رونما ہونے والے واقعات اور جنگ میں پیشرفت کے بارے میں حالات معلوم ہوئے۔

اگلے دن میں نے چیتا خان سے کہا کہ وہ اخبار کے پچھلے شمارے مجھے بھیج دے۔ اب چونکہ حکومت نے ہمیں باقاعدگی کے ساتھ اخبار مہیا کرنے پر اتفاق کر لیا تھا اس لیے میری تجویز پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چیتا خان نے مجھ سے اتفاق کیا اور دو یا تین دن کے بعد ٹائمز آف انڈیا کی مکمل فائل مجھے بھجوا دی گئی۔

خبریں پڑھنے سے صورت حال کے بارے میں میرے اس قیاس کی تصدیق ہو گئی کہ ہماری گرفتاری کے بعد ملک میں تشدد آمیز گڑبڑ اور شورش پھیل جائے گی۔ بنگال، بہار، یو پی اور بمبئی کے صوبے حکومت کے خلاف جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ مواصلات کا نظام درہم برہم اور کارخانے بند کر دیے گئے تھے۔ پولیس اسٹیشنوں پر حملے کیے گئے اور انہیں نذر آتش کر دیا گیا۔ کئی ریلوے اسٹیشنوں پر بھی حملے کیے گئے اور بعض مقامات پر انہیں تباہ کر دیا گیا۔ بڑی تعداد میں فوج کی لاریاں بھی جلا دی گئیں۔ فیکٹریاں بند ہونے کی وجہ سے جنگی سامان کی پیداوار معطل یا کم ہو گئی تھی۔ غرض پورا ملک حکومت کے ظلم اور تشدد کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اور تحریک عدم تشدد پر مبنی مزاحمت کی پابند نہیں رہی تھی۔ یہ سب کچھ میرے اندازے اور قیاس کے مطابق ہوا تھا اور ایک حد تک یہ وہی کام تھے جن کے بارے میں میں کارکنوں کو ہدایت دے چکا تھا اور ان کے ساتھ گفتگو کر چکا تھا۔

۱۹۴۲ کے باقی مہینوں میں کوئی اہم واقعہ پیش نہ آیا۔

۱۹۴۳ کے اوائل میں فضا پھر تبدیل ہونے لگی۔ فروری میں ہم نے اخباروں میں پڑھا کہ گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا ہے کہ وہ تزکیہ نفس کے لیے برت رکھیں گے۔ مجھے یقین تھا کہ گاندھی جی کے اس اقدام کے دو بڑے سبب ہیں۔ اس سے پہلے میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ گاندھی جی کو یہ توقع نہیں تھی کہ حکومت کانگریس کے

لیڈروں کو اس طرح اچانک گرفتار کر لے گی۔ انہیں امید تھی کہ انہیں عدم تشدد کے طریقوں اور پرانے مخصوص خیالات کے مطابق تحریک کو آگے بڑھانے کی مہلت مل جائے گی۔ ان کی یہ دونوں امیدیں نقش بر آب ثابت ہوئی تھیں۔ ملک میں جو کچھ ہوا تھا، اس کی ذمے داری انہوں نے خود اپنے اوپر لے لی تھی اور اب وہ اپنے معمول کے مطابق اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے برت رکھنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ میں کسی مفروضے کی بنا پر اس برت کو ایک بامعنی فعل قرار نہیں دے سکتا تھا۔

حکومت نے ان کے اس اقدام کو بالکل مختلف نقطہ نظر سے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس عمر اور صحت کی موجودہ حالت میں وہ اکیس دن کا برت برداشت نہیں کر سکیں گے۔ ان کے نزدیک اس طرح برت رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ حکومت کا خیال تھا کہ گاندھی جی کا مقصد بھی یہی ہے اور وہ حکومت کو اپنی موت کا ذمے دار بنانا چاہتے ہیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ حکومت نے اس مفروضے کی بنیاد پر تمام ضروری انتظامات کر لیے تھے۔ حکومت کو گاندھی جی کے جانبر نہ ہونے کا اس قدر یقین تھا کہ اس نے لاش کو جلانے کے لیے صندل کی لکڑی کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ اس کا ردعمل تھا کہ اگر گاندھی جی اپنی موت کی ذمے داری حکومت پر ڈالنا چاہتے ہیں تو وہ یہ ذمے داری ہرگز قبول نہیں کرے گی۔ ان کی آخری رسوم آغا خان پیلس میں ادا کی جائیں گی جہاں وہ نظر بند تھے اور ان کی راکھ ان کے بیٹوں کو بھیج دی جائے گی۔

ڈاکٹر بی سی رائے نے حکومت کو لکھا کہ وہ گاندھی جی کے برت کے زمانے میں ان کے طبی مشیر کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ برت کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا جب معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کے اندازے صحیح ثابت ہوں گے۔ گاندھی جی کے معالج بھی مایوس ہو گئے لیکن گاندھی جی نے حکومت اور اپنے معالجوں کے تمام اندازوں کو غلط ثابت کر دیا۔ انہوں نے قوت برداشت کی جو غیر معمولی صلاحیت دوسرے موقعوں پر دکھائی تھی، اس سے اس مرتبہ پھر کرشمہ دکھایا۔ وہ اس قدر سخت جان تھے کہ موت پر غالب آ گئے اور پورے اکیس دن کے بعد برت کھولا۔

گاندھی جی کے برت سے جو کھلبلی مچی تھی، اس کے بعد ہم دوبارہ اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگ گئے۔ برت کے زمانے میں اسیری کی بے بسی ہمیں بہت گراں گزری۔ بے کسی کا یہ احساس دوسرے سال مجھے کچھ زیادہ شدت کے ساتھ ہوا۔ میری بیوی کئی سال سے بیمار تھیں۔ ۱۹۴۱ میں جب میں نینی جیل میں تھا، ان کی حالت اس قدر نازک ہو گئی کہ مجھے ان سے ملاقات کے لیے رہا کر دیا گیا۔ میں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا اور انہوں نے آب و ہوا تبدیل کرنے کے لیے کہا۔ وہ رانچی چلی گئیں اور جولائی ۱۹۴۲ تک وہیں قیام پذیر رہیں۔ اس وقت ان کی صحت قدرے بہتر ہو گئی لیکن اگست کے پہلے ہفتے میں جب میں بمبئی روانہ ہوا تو ان کی صحت پھر تشویشناک ہو گئی۔

۹ اگست کو میری اور میرے تمام رفقائے کار کی گرفتاری کی خبر سن کر انہیں یقیناً بہت صدمہ پہنچا ہوگا اور ان کی صحت کو، جو پہلے سے نازک تھی، ایک اور دھچکا لگا۔ قید کے زمانے میں ان کی گرتی ہوئی صحت کی خبروں نے مجھے بہت ہی پریشان رکھا۔ ۱۹۴۴ کے شروع میں مجھے گھر سے اطلاع ملی کہ وہ پھر سخت علیل ہوگئی ہیں۔ اس کے بعد مزید وحشت ناک خبریں ملیں۔ ان کے ڈاکٹر مایوس ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے طور پر حکومت کو یہ لکھا کہ مجھے ان سے ملنے کا ایک موقع دیا جائے کیونکہ ان کے بچنے کی بہت ہی کم امید ہے۔ حکومت نے ڈاکٹروں کے اس خط کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ میں نے بھی وائسرائے کو لکھا لیکن ہماری یہ خط و کتابت بے نتیجہ رہی۔ اپریل میں ایک دن دوپہر کے قوت چھتیا خان میرے پاس آیا۔ یہ بہت ہی غیر معمولی بات تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے ایک ٹیلی گرام مجھے دے دیا۔ یہ تخفی تحریر میں تھا مگر انگریزی میں اس کی ایک نقل بھی ساتھ تھی۔ تار کلکتے سے بھیجا گیا تھا اور اس میں لکھا تھا کہ میری اہلیہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں نے وائسرائے کو لکھا کہ حکومت بڑی آسانی کے ساتھ مجھے عارضی طور پر کلکتے منتقل کر سکتی تھی تاکہ میں اپنی بیوی کو وفات سے پہلے دیکھ لیتا۔ اس خط کا مجھے کوئی جواب نہ ملا۔

تین مہینے بعد قسمت نے مجھے ایک اور صدمہ پہنچایا۔ میری بہن آبرو بیگم، جو بھوپال میں رہتی تھیں، بیمار ہو گئیں اور تقریباً دو ہفتے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ بھی دنیا سے رخصت ہوگئی ہیں۔

اسی زمانے میں ہم نے اخباروں میں اچانک یہ خبر پڑھی کہ گاندھی جی کو رہا کر دیا گیا ہے۔ میرا گمان ہے کہ خود گاندھی جی بھی اپنی رہائی کے اسباب نہ سمجھ سکے۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ ان کی رہائی برطانوی پالیسی میں تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ اس مرتبہ بھی وہ غلطی پر تھے۔ برت کی وجہ سے ان کی صحت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ اس وقت سے انہیں صحت کے حوالے سے برابر کوئی نہ کوئی شکایت رہی۔ پونا کے سول سرجن نے ان کا طبی معائنہ کرنے کے بعد یہ رپورٹ دی کہ غالباً وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ برت کو برداشت کرنے کی قوت ان میں نہیں تھی اور سول سرجن کا خیال تھا کہ اب وہ چند دن کے مہمان ہیں۔ وائسرائے کو جب یہ رپورٹ ملی تو اس نے گاندھی جی کو رہا کرنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ حکومت کو ان کی موت کا ذمے دار نہ ٹھہرایا جا سکے۔ اس کے علاوہ سیاسی صورت حال اس قدر تبدیل ہو چکی تھی کہ برطانوی حکومت کو اب ان سے کوئی اندیشہ نہیں رہا تھا۔ جنگ کا بحران ختم ہو چکا تھا اور اتحادی طاقتوں کی فتح کے لیے صرف تھوڑا سا وقت درکار تھا۔ حکومت نے یہ بھی سوچا کہ ایسی حالت میں، جبکہ کانگریس کے تمام لیڈر جیل میں ہیں، گاندھی جی تنہا شاید ہی کچھ کر سکیں۔ اس کے برعکس ان کی موجودگی تشدد کے ذرائع استعمال کرنے کی کوشش کرنے والے عناصر کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھی۔

رہائی کے بعد کچھ عرصے تک گاندھی جی اتنے بیمار رہے کہ کوئی موثر قدم نہ اٹھا سکے۔ وہ چند ماہ تک زیر علاج رہے لیکن جیسے ہی ان کی حالت قدرے سنبھلی، انہوں نے کئی سیاسی کارروائیاں شروع کر دیں۔ ان میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گاندھی جی نے مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کے لیے نئی کوششوں کا آغاز کر دیا اور مسٹر جناح سے ملاقات کا انتظام کیا۔ ان کی دوسری تحریک یہ تھی کہ حکومت کے ساتھ نئے سرے سے بات چیت کا اہتمام کیا جائے۔ انہوں نے اپنے پچھلے اعلانات کے برعکس یہ بیان جاری کر دیا کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے تو وہ اپنی رضا و رغبت سے برطانیہ کا ساتھ دے گا اور جنگ کی کوششوں میں اس کی مکمل حمایت کرے گا۔ جب میں نے ان کا یہ بیان پڑھا تو حیران رہ گیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ان دونوں اقدامات کا انجام ناکامی ہوگا۔

میرا خیال ہے کہ اس موقع پر مسٹر جناح سے گاندھی جی کا ملنا ایک فاش سیاسی غلطی تھی۔ اس کی وجہ سے مسٹر جناح کو ایک نئی اور پہلے سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی جس سے انہوں نے بعد میں پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دراصل گاندھی جی نے شروع سے ہی مسٹر جناح کے بارے میں عجیب وغریب طرز عمل اختیار کر لیا تھا۔ ۱۹۲۰ کے عشرے میں کانگریس سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد مسٹر جناح کی سیاسی اہمیت بہت کم ہو گئی تھی۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں دوبارہ اہمیت حاصل کرنے کا بڑا سبب گاندھی جی کی غلطیاں اور فروگذاشتیں تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر گاندھی جی کا طرز عمل وہ نہ ہوتا جو انہوں نے اختیار کیا تو مسٹر جناح شاید ہی کسی اعلیٰ سیاسی رتبے پر پہنچ پاتے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی تعداد کو مسٹر جناح اور ان کی پالیسی پر اعتماد نہیں تھا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ گاندھی جی مسلسل ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور ان کی منت سماجت کر رہے ہیں تو ان میں سے بہت سے مسلمان مسٹر جناح کی پھر عزت کرنے لگے۔ انہوں نے یہ بھی سمجھا کہ فرقہ وارانہ سمجھوتے میں مفید شرائط حاصل کرنے کے لیے مسٹر جناح غالباً سب سے بہتر شخص ہیں۔

یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ گاندھی جی پہلے شخص تھے جنہوں نے مسٹر جناح کے لقب قائداعظم یا عظیم لیڈر کو رواج دیا۔ گاندھی جی کے آشرم میں ایک سادہ لوح مگر نیک خاتون تھیں جن کا نام امت السلام تھا۔ انہوں نے اردو کے بعض اخبارات میں مسٹر جناح کے نام کے ساتھ قائداعظم لکھا ہوا دیکھا۔ گاندھی جی جب مسٹر جناح کو ملاقات کے لیے خط لکھ رہے تھے تو اس خاتون نے گاندھی جی سے کہا کہ اردو اخبارات مسٹر جناح کو قائداعظم کہتے ہیں اس لیے آپ بھی انہیں اسی نام سے خطاب کریں۔ چنانچہ گاندھی جی نے یہ سوچے بغیر کہ اس کے اثرات کیا ہوں گے، مسٹر جناح کو قائداعظم لکھ دیا۔ یہ خط جلد ہی اخبارات میں شائع ہو گیا۔ جب ہندوستانی مسلمانوں نے دیکھا کہ گاندھی جی بھی مسٹر جناح کو قائداعظم کہتے ہیں تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ

حقیقت میں یہی مرتبہ رکھتے ہوں گے۔ جولائی ۱۹۴۴ میں جب میں نے یہ خبر پڑھی کہ گاندھی جی مسٹر جناح کے ساتھ خط و کتابت کر رہے ہیں اور ان سے ملنے کے لیے بمبئی جا رہے ہیں تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گاندھی جی بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔ ان کا یہ اقدام کسی مسئلے کو حل کرنے کے بجائے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کو اور بگاڑ دے گا۔ بعد میں رونما ہونے والے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ میرے خدشات درست تھے۔ مسٹر جناح نے صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی پوزیشن کو مضبوط کر لیا البتہ انہوں نے اپنے قول و فعل سے ہندوستان کی آزادی کے نصب العین میں کسی قسم کی کوئی مدد نہ کی۔

گاندھی جی نے حکومت کے ساتھ گفت و شنید کے سلسلے میں جو دوسرا قدم اٹھایا، وہ بھی بے وقت تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جنگ چھڑنے پر میں نے کانگریس کو اس پر آمادہ کرنے کی انتہائی کوشش کی تھی کہ وہ جنگ کے بارے میں حقیقت پسندانہ اور مثبت طرز عمل اختیار کرے۔ اس وقت گاندھی جی کا موقف یہ تھا کہ اگرچہ ہندوستان کی سیاسی آزادی بہت اہم ہے مگر عدم تشدد کے اصول پر کاربند رہنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اصل میں وہ کئی بار علانیہ یہ کہہ چکے تھے کہ اگر ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تشدد ہے تو کم از کم وہ خود اسے اختیار کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اب وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے تو کانگریس کو برطانیہ سے تعاون کرنا چاہیے۔ اس سے ان کے پچھلے خیالات کی مکمل تنسیخ ہوگئی اور اس کی وجہ سے ہندوستان کے عوام الجھن کا شکار ہوگئے۔ دوسری طرف برطانیہ میں جو تاثر قائم ہوا وہ بھی ناخوشگوار تھا۔ بہت سے انگریزوں کا خیال تھا کہ گاندھی جی نے اس وقت برطانیہ کی امداد سے گریز کیا جب جنگ کا انجام مشکوک تھا۔ حکومت نے ان کی طرف سے معاونت کی موجودہ پیشکش کا مطلب یہی لیا کہ وہ اس وقت جب اتحادیوں کی فتح یقینی ہوگئی ہے، برطانیہ کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت نے گاندھی جی کی پیشکش کو وہ اہمیت نہ دی جس کی وہ توقع رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اب انگریزوں کو جنگ کے ابتدائی زمانے کی طرح ہندوستان کی امداد کی اتنی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ اس وجہ سے بھی انہوں نے گاندھی جی کی تحریک سے بے اعتنائی برتی۔

اب جبکہ میں ۱۹۵۷ میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں اور اس تناظر میں پیچھے کی طرف مڑ کر ان واقعات پر نظر ڈالتا ہوں تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تشدد اور عدم تشدد کے سوال پر گاندھی جی کے بعض قریب ترین پیروؤں کے رویے میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ کانگریس نے جب یہ قرارداد منظور کی کہ اگر برطانیہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دے تو وہ جنگ کی کوششوں میں برطانیہ کی امداد کرے گی تو اس پر سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، آچاریہ کرپلانی اور ڈاکٹر پروفلا گھوش نے احتجاج کے طور پر ورکنگ کمیٹی سے استعفادے دیا تھا۔

انہوں نے کھلے بندوں یہ اعلان کیا تھا کہ ان کے نزدیک عدم تشدد ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ ہندوستان کی آزادی کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ لیکن ۱۹۴۷ میں جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو ان میں سے ایک بھی شخص نے یہ نہیں کہا کہ ہندوستان کی فوج کو خدمت سے سبکدوش کر دیا جائے۔ اس کے برعکس انہوں نے یہ اصرار کیا کہ ہندوستانی فوج کو تقسیم کیا جائے اور اسے فوری طور پر ہندوستانی حکومت کے کنٹرول میں دیا جائے۔ یہ مطالبہ اس وقت کے کمانڈر انچیف کی تجویز کے برخلاف تھا۔ کمانڈر انچیف کی تجویز یہ تھی کہ فوج اور اس کی کمان تین سال کے لیے مشترک رہے لیکن عدم تشدد کے ان نام نہاد علمبرداروں نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ اگر عدم تشدد واقعی ان کا عقیدہ تھا تو ان لوگوں نے ایسی حکومت میں ذمے داریاں کیونکر قبول کر لیں جو فوج پر ہر سال ایک ارب روپے سے زیادہ رقم خرچ کرتی تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض لوگ تو مسلح افواج کے اخراجات ختم کرنے کے بجائے ان میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔

مجھے ہمیشہ سے یہ احساس رہا ہے کہ ان ساتھیوں اور دوستوں نے بیشتر سیاسی مسائل پر کبھی خود غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ وہ تو بس گاندھی جی کی اندھی تقلید کرتے تھے۔ جب بھی کوئی مسئلہ اٹھتا تو وہ دیکھتے رہتے کہ گاندھی جی اس پر کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ میں گاندھی جی کا احترام اور تحسین وتوصیف کرنے میں ان میں سے کسی سے پیچھے نہیں تھا البتہ میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ پوزیشن قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ ہمیں آنکھ بند کر کے ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان دوستوں نے ۱۹۴۰ میں جس ایشو پر ورکنگ کمیٹی سے استعفا دے دیا تھا آج وہ ان کی نظروں میں بالکل اوجھل ہو گیا ہے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ فوج اور دفاع کے عظیم انتظامات کے بغیر ہندوستان کی حکومت چلا سکتے ہیں اور نہ ہی وہ جنگ کو خارج از امکان تصور کرتے ہیں۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں صرف جواہر لعل میرے خیالات سے مکمل اتفاق کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ تاریخی اسباب اور منطقی نتائج نے جواہر لعل اور میرے موقف کی پوری پوری تصدیق کر دی ہے۔

جون ۱۹۴۴ میں ہم نے "ڈی ڈے" کے بارے میں خبریں پڑھیں۔ یہ جنگ کا فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ اتحادیوں کی فتح یقینی اور نظروں کے سامنے تھی۔ دنیا نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ زمانہ جنگ میں جو سب سے بڑی شخصیت ابھر کر سامنے آئی ہے، وہ صدر روز ویلٹ کی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ مستقبل کی جو تصویر ان کے ذہن میں تھی، وہ آہستہ آہستہ حقیقت کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اتحادی طاقتیں افریقا اور ایشیا دونوں براعظموں میں فتح یاب ہونے کے بعد اب ہٹلر کے یورپی قلعے کی جانب پیش قدمی کر رہی تھیں۔ مجھے اس پر ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ میری بہت پہلے سے یہ رائے تھی کہ جرمنی نے پہلی جنگ عظیم کی طرح اس مرتبہ بھی بیک وقت دو محاذوں پر لڑنے کی غلطی کی ہے۔ دراصل ہٹلر نے جس دن سوویت یونین پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اسی دن اپنی تباہی

اور بربادی کے بیج بو دیے تھے۔ اب ہٹلر یا اس کی قوم کے لیے تباہی سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

اسی زمانے میں قلعہ احمد نگر میں ایک غیر متوقع واقعہ پیش آ گیا۔ چھیتا خان نے ایک دن یہ اطلاع دی کہ اسے ڈاکٹر سید محمود کی رہائی کے احکامات موصول ہوئے ہیں۔ اس پر ہم سب کو حیرت ہوئی کیونکہ ہمیں سمجھ نہ آئی کہ تنہا انہیں کیوں رہائی کا مستحق سمجھا گیا ہے؟

چند مہینے ہوئے احمد نگر میں ہیضے کی وبا پھیلنے کا خطرہ تھا۔ چھیتا خان نے ہم سب کو حفاظتی ٹیکے لگوانے کا مشورہ دیا۔ ہم میں سے پانچ ...... جواہر لعل، پٹابھی سیتا رمیا، آصف علی، ڈاکٹر سید محمود اور میں نے چھیتا خان کے مشورے پر عمل کیا لیکن چار دوسروں سردار پٹیل، آچاریہ کرپلانی، شنکر راؤ دیو اور ڈاکٹر پروفلا گھوش نے ٹیکے لگوانے کو اپنے ضمیر کے خلاف ٹھہرا کر انکار کر دیا۔ ردعمل کے طور پر مجھے ہلکا بخار ہو گیا لیکن ایسا لگتا ہے کہ ڈاکٹر محمود کو ٹیکہ لگوانے سے الرجی ہو گئی اور انہیں پندرہ دن تک مسلسل تیز بخار رہا۔ ہم سب ان کے بارے میں حد درجہ متفکر تھے اور جواہر لعل اپنی روایتی دوستی کی بنا پر ان کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ آخر بخار تو اتر گیا لیکن ان کے مسوڑھوں سے خون آنے لگا۔ وہ چھیتا خان کے زیر علاج تھے اور جب ان کی رہائی کا حکم آیا تو وہ قریب قریب اچھے ہو چکے تھے اس لیے ان کی بیماری ان کی رہائی کے لیے معقول وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ غالباً اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کی پالیسی تبدیل ہو گئی ہے۔ اب انہوں نے نرم رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور ڈاکٹر محمود کو خرابی صحت کی بنا پر رہا کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید محمود رہا ہو کر پونا پہنچے تو اخبارات نے ان کا انٹرویو لیا۔ انہوں نے یہ عندیہ دیا کہ انہیں واضح طور پر معلوم نہیں کہ انہیں کیوں رہا کیا گیا ہے۔ یہ ایک غیر متوقع اقدام تھا چنانچہ حکومت نے ان کے اس بیان کی تردید کرنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ خط اخبارات کو جاری کر دیا جو ڈاکٹر سید محمود نے احمد نگر سے وائسرائے کو لکھا تھا۔ حکومت نے کہا کہ ڈاکٹر محمود کو اسی خط کی بنیاد پر رہا کیا گیا ہے۔

ہم نے احمد نگر جیل میں یہ خط پڑھا تو ہمیں سخت غصہ آیا اور ہم نے محسوس کیا کہ اس طرح ہماری تذلیل ہوئی ہے۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر محمود ہمیں یہ بتائے بغیر کہ وہ حکومت کے ساتھ خط و کتابت کر رہے ہیں، اس قسم کا مکتوب لکھ دیں گے۔ یہ درست ہے کہ وہ جیل میں ہم لوگوں کے ساتھ بعض انگریزی محاوروں اور مقولوں کے بارے میں صلاح مشورہ کرتے رہے تھے لیکن جواہر لعل اور میں نے سمجھا کہ وہ کوئی کتاب لکھنا چاہتے ہیں اور ان محاوروں کے صحیح استعمال کو یقینی بنانا چاہتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آئی تھی کہ وہ وائسرائے کو معذرت کا خط بھی لکھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محمود نے اپنے خط میں کہا کہ جس وقت ہندوستان چھوڑ دو قرارداد کی منظوری دی گئی، اس وقت

انہوں نے ورکنگ کمیٹی یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت نہیں کی تھی۔ مجھے اس بیان پر بڑی حیرت ہوئی کیونکہ وہ ان موقعوں پر موجود تھے اور انہوں نے قرارداد پر بحث میں حصہ لیا تھا۔

جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، ہم سب کو اس واقعے پر بڑی ذلت محسوس ہوئی۔ وائسرائے کو خط لکھنا ایک عجیب بات تھی اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ تھی کہ انہوں نے پونا میں پریس کو انٹرویو دیتے ہوئے اس خط کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ غالباً ان کا خیال یہ تھا کہ وائسرائے کو لکھا جانے والا مکتوب کبھی منظر عام پر نہیں آئے گا۔ جب حکومت نے یہ خط جاری کر دیا تو وہ بہت پریشان ہوئے اور گاندھی جی سے ملنے چلے گئے۔ اس ملاقات کے بعد انہوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں یہ کہا گیا کہ گو انہوں نے یہ خط لکھا تھا لیکن اسے طویل عرصے تک وائسرائے کو نہیں بھیجا تھا۔ وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ وائسرائے کو یہ خط بھیجا جائے یا نہیں؟ اسی تذبذب کے عالم میں انہوں نے قرآن پاک سے رہنمائی حاصل کرنے کی غرض سے مختلف مقامات سے قرآن مجید کے تین صفحات کھولے اور یہ آیت ہر دفعہ ان کی آنکھوں کے سامنے آگئی جس میں کہا گیا ہے کہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق کام کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر محمود نے کہا کہ انہیں قرآن حکیم کی طرف سے اشارہ مل چکا تھا اس لیے انہوں نے یہ خط وائسرائے کو بھیج دیا۔ مجھے ان کے طرز عمل سے زیادہ ان کی وضاحت پر حیرت ہوئی۔ انہوں نے اپنی جان بچانے کے لیے ساری ذمے داری خدا پر ڈال دی تھی!

گاندھی جی اس قسم کے تمام معاملوں میں فیاضی طبع کا مظاہرہ کرتے۔ جب سید محمود نے ان سے ملاقات کی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا تو گاندھی جی کے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔ انہوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ اگرچہ ڈاکٹر محمود کی طرف سے جیل کے ساتھیوں کو بتائے بغیر وائسرائے کو خط لکھنا درست نہیں تھا، اس کے باوجود ہندوستان کے عوام کو ان کی ندامت اور پشیمانی کے پیش نظر اس معاملے کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

ہر چند کہ ہمیں یقین کے ساتھ معلوم نہیں تھا مگر ہمیں محسوس ہوا کہ ہماری اسیری کا زمانہ ختم ہونے والا ہے۔ ۱۹۴۴ کے نصف آخر میں ہندوستان کی حکومت اس نتیجے پر پہنچی کہ اب ہمیں قلعہ احمد نگر میں نظر بند رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ ہمیں وہاں رکھنے کی کئی وجوہ تھیں۔ حکومت کا خیال تھا کہ ہماری نظر بندی کا معاملہ خفیہ رہے گا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر ہمیں سول جیل میں رکھا گیا تو ممکن ہے کہ ہم باہر کی دنیا سے رابطہ قائم کر لیں۔ ہمیں فوج کی نگرانی میں نظر بند کرنے سے یہ رابطے ممکن نہیں ہوں گے۔ احمد نگر کیمپ جیل میں صرف یورپی فوجی موجود تھے اور وہ ہمیں یقینی طور پر بیرونی دنیا سے رابطہ پیدا نہ کرنے دیتے۔ باہر کی دنیا سے جسمانی رابطے کے تمام امکانات بھی معدوم ہو چکے تھے۔ جس بیرک میں ہمیں رکھا گیا اس میں روشندان تھے جن سے

قلعے کا احاطہ نظر آتا تھا لیکن ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے انہیں مکمل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔ ان پر جو پلاسٹر کیا گیا، وہ اس قدر تازہ تھا کہ ہمارے پہنچنے تک سوکھا بھی نہیں تھا۔ قلعہ احمد نگر میں نظر بندی کے ساڑھے تین برس میں ہم نے شاید ہی کبھی باہر کے کسی ہندوستانی کو دیکھا ہو۔ ایک یا دو مرتبہ اس عمارت کی معمولی مرمت کی ضرورت پیش آئی مگر اس کے لیے بھی کسی ہندوستانی مزدور سے کام نہ لیا گیا۔ اس طرح دنیا سے ہمارا رابطہ مکمل طور پر منقطع کر دیا گیا تھا۔

حکومت بیرونی دنیا سے ہمارا رابطہ ختم کرنے میں تو کامیاب رہی لیکن اس کا پہلا مقصد پورا نہ ہو سکا۔ پبلک کو ہمارے پہنچنے کے ایک ہفتے کے اندر معلوم ہو گیا کہ ہم سب کو احمد نگر کی جیل میں رکھا گیا ہے۔ اب اس معاملے کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ برطانیہ کی فتح اب نظروں کے سامنے تھی اس لیے ہندوستان کی حکومت نے سوچا کہ اب ہمیں فوجی قید میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا ہمیں کسی خطرے کے بغیر اپنے اپنے صوبوں کی سول جیلوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔

سردار پٹیل اور شنکر راؤ دیو کو سب سے پہلے منتقل کیا گیا اور وہ پونا جیل میں چلے گئے۔ آصف علی کو بٹالہ بھیج دیا گیا جہاں عام طور پر دہلی کے سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے۔ جواہر لعل کو پہلے الہ آباد کے قریب نینی اور پھر المورڑا بھیج دیا گیا۔ جواہر لعل نے روانگی کے وقت کہا کہ غالباً ہماری رہائی کے دن بھی قریب آ گئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں رہائی کے فوراً بعد ورکنگ کمیٹی یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس نہ بلاؤں۔ انہوں نے کہا کہ وہ آرام اور تفریح کے لیے کچھ وقت چاہتے ہیں اور اس کتاب کو، جو وہ ہندوستان پر لکھ رہے تھے، مکمل کرنا چاہتے ہیں۔

میں نے جواہر لعل کو بتایا کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ مجھے بھی آرام اور صحت یابی کے لیے تھوڑا سا وقت درکار ہے۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہمیں ایسے حالات میں رہا کیا جائے گا جن میں فوری اور ہیجانی سیاسی اقدامات ضروری ہوں گے اور ہماری زندگی کا جو بچا کھچا حصہ ہے، اس میں شاید آرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

جب میری منتقلی کا وقت آیا تو چھتا خان نے کہا کہ چونکہ میری صحت ٹھیک نہیں اس لیے کلکتے کی مرطوب آب و ہوا میرے لیے مناسب نہیں ہوگی۔ اس نے اشارتاً کہا کہ مجھے بنگال کے کسی خشک مقام پر بھیجا جائے گا۔ ایک دن سہ پہر کو اس نے مجھ سے تیار ہونے کو کہا۔ جب میرا سامان اس کی کار میں رکھ دیا گیا تو وہ مجھے احمد نگر اسٹیشن کے بجائے کئی میل دور واقع ایک دیہاتی اسٹیشن پر لے گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر میں احمد نگر سے روانہ ہوتا تو سب کو فوراً خبر ہو جاتی۔ حکومت نہیں چاہتی تھی کہ میری نقل و حرکت کے بارے میں کسی قسم کی تشہیر ہو۔

احمد نگر کے قید خانے میں میرا بیشتر وقت ذہنی اعتبار سے بہت گراں گزرا۔ اس کا میری صحت پر بہت

بُرا اثر پڑا۔ گرفتاری کے وقت میرا وزن ۱۷۰ پاؤنڈ تھا لیکن جب مجھے احمد نگر سے منتقل کیا گیا تو میرا وزن کم ہو کر ۱۳۰ پاؤنڈ رہ گیا تھا۔ میری بھوک ختم ہو چکی تھی اور میں بمشکل کچھ کھا سکتا تھا۔

بنگال سے سی آئی ڈی کا ایک انسپکٹر چار کانسٹیبلوں کے ہمراہ میرے ساتھ جانے کے لیے آ گیا۔ جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو چھتا خان نے مجھے ان کے حوالے کر دیا۔ ہم احمد نگر سے کلیانی کے راستے آسنسول پہنچے۔ یہاں مجھے ایک ریٹائرنگ روم میں لے جایا گیا جہاں میرے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے تھے۔ حکومت کی طرف سے پورے معاملے کو اخفائے راز میں رکھنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود اخبار والوں کو کسی نہ کسی طریقے سے پتا چل ہی گیا اور مجھے آسنسول میں کلکتے کے بعض اخباری رپورٹر اور الٰہ آباد کے میاں محمد فاروق نظر آ گئے۔ مقامی لوگوں کا ایک مجمع بھی وہاں اکٹھا ہو گیا تھا۔

آسنسول کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اسٹیشن پر میرا استقبال کیا اور مجھ سے ذاتی طور پر درخواست کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں پبلک سے ملاقات کرنا چاہوں تو وہ مجھے اس سے روک نہیں سکتا لیکن میں نے ایسا کیا تو حکومت اس سے سخت باز پرس کرے گی اس لیے اگر میں اوپر کی منزل پر ایک کمرے میں چلا جاؤں اور پبلک سے نہ ملوں تو وہ بہت شکر گزار ہو گا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ میں اسے کسی قسم کا نقصان پہنچانا یا حکومت کی نظر میں معتوب کرنا نہیں چاہتا چنانچہ میں اس کے ساتھ اوپر کے کمرے میں چلا گیا۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس نواب آف ڈھاکا کا رشتے دار تھا۔ اس نے اور اس کی بیوی نے میری خاطر مدارات کی اور اس کی بیوی نے اصرار کے ساتھ میرے آٹوگراف لیے۔ دونوں نے مجھے آرام پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے بنکورا بھیجا جا رہا ہے۔ ٹرین شام چار بجے اسٹیشن پر پہنچی اور اس کے فوراً بعد مجھے اپنے کمپارٹمنٹ میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت تک پلیٹ فارم پر آدمیوں کا ہجوم ہو گیا تھا۔ مقامی لوگوں کے علاوہ کلکتہ، الٰہ آباد اور لکھنؤ سے کئی لوگ وہاں پہنچ گئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور اس کے انسپکٹر کو بہت فکر تھی کہ میں لوگوں سے نہ ملوں۔ دھوپ بہت تیز تھی اور یہ لوگ میرے لیے ایک چھتری لے آئے جسے انسپکٹر نے پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اس خیال سے کہ مجمع مجھے دیکھ نہ لے، چھتری کو اس قدر نیچے کر دیا کہ وہ تقریباً میرے سر کو چھونے لگی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ میرا چہرہ نہ دیکھ پائیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ مجھے ڈبے میں پہنچا دے گا اور لوگوں کو خبر بھی نہیں ہو گی۔

مجھے لوگوں سے ملنے کی کوئی خاص خواہش نہیں تھی مگر جب میں نے دیکھا کہ کلکتہ، الٰہ آباد اور لکھنؤ سے لوگ محض مجھے دیکھنے کے لیے آئے ہیں تو میں نے سوچا کہ یہ بھی بہت ہی نامناسب بات ہو گی کہ یہ لوگ میری ایک

جھلک بھی نہ دیکھ سکیں چنانچہ میں نے پولیس انسپکٹر سے چھتری لے کر اسے بند کر دیا۔ اب لوگ میری طرف دوڑ پڑے لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ ظاہر ہے کہ ہر ایک سے فرداً فرداً ملنا میرے لیے ناممکن تھا اس لیے میں نے اجتماعی طور پر سب سے خطاب کیا اور ہنس کر کہا: ''سپرنٹنڈنٹ پولیس اور انسپکٹر کی پریشانی دم بہ دم بڑھتی جارہی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس گرمی میں انہیں سر درد ہو جائے۔''

میں نے لوگوں کو خدا حافظ کہا اور اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا لیکن مجمع چاروں طرف سے اُمڈ پڑا۔ پلیٹ فارم پر موجود لوگوں کے علاوہ بہت سے لوگ لائن پار کر کے میرے ڈبے کے دوسری طرف آ گئے۔ جلد ہی گاڑی روانہ ہو گئی اور ہم سات بجے تک بنکورا پہنچ گئے۔ بنکورا کے سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دوسرے افسروں نے اسٹیشن پر میرا استقبال کیا اور مجھے شہر کے باہر واقع ایک دو منزلہ بنگلے میں لے گئے۔

یہ اپریل کا آغاز تھا اور گرمی بڑھتی جارہی تھی البتہ جب میں شام کو دوسری منزل کے برآمدے میں بیٹھا تو میرے چہرے پر ہوا کے خوش گوار جھونکے لگے۔ صبح اور شام زیادہ ناگوار نہ ہوتی لیکن دن کے وقت گرمی بہت بڑھ جاتی تھی۔ کمرے میں بجلی کا پنکھا لگا ہوا تھا اور برف بھی مل جایا کرتی تھی مگر دوپہر کو اس قدر شدید گرمی پڑتی کہ ان سے بہت کم فائدہ پہنچتا۔ کلکٹر ہفتے میں ایک مرتبہ میرے پاس آیا کرتا۔ ایک دن مجھے کہنے لگا کہ اس نے حکومت کو پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ اب مجھے بنکورا میں نہیں رہنا چاہیے۔ اسے جواب کا انتظار ہے اور جیسے ہی جواب موصول ہوا، مجھے کسی ٹھنڈی جگہ بھیج دیا جائے گا۔

ایک اچھے باورچی کا ملنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ بنکورا میں بھی شروع میں یہی دقت پیش آئی مگر جلد ہی ایک بہت اچھا باورچی مل گیا۔ یہ باورچی مجھے اس قدر پسند آیا کہ رہا ہونے کے بعد میں اسے اپنے ساتھ کلکتہ لے آیا۔

بنکورا میں حکومت کی طرف سے مجھے اسٹیٹسمین کی ایک کاپی دی جاتی۔ میں نے حکومت سے کہا کہ مجھے امریتا بازار پتریکا بھی مہیا کیا جائے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس معاملے پر چیف سیکرٹری کے ساتھ مشورہ کیا جس کے بعد اس اخبار کا انتظام کر دیا گیا۔

میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ میں جب قلعہ احمد نگر میں داخل ہوا تو میرا ریڈیو سیٹ مجھ سے لے لیا گیا تھا۔ چند دنوں کے بعد چھتاری خان نے اس کو استعمال کرنے کی اجازت مانگی اور میں نے خوشی سے اس کو اجازت دے دی۔ جب تک میں احمد نگر میں رہا، یہ ریڈیو دوبارہ دیکھنے میں نہ آیا۔ جب مجھے بنگال منتقل کیا جا رہا تھا تو یہ ریڈیو سیٹ بھی میرے سامان میں رکھ دیا گیا۔ جب میں نے اس کو استعمال کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ خراب ہو گیا ہے۔ بنکورا کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھے دوسرا ریڈیو سیٹ دے دیا اور ایک طویل عرصے کے بعد میں نے براہ راست دوسرے ملکوں کی خبریں سنیں۔

اپریل کے آخری دنوں میں اخبارات سے معلوم ہوا کہ آصف علی بٹالہ کی جیل میں بہت سخت بیمار ہیں۔ وہ کئی دنوں سے بے ہوش تھے اور ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی چنانچہ حکومت نے انہیں رہا کر کے دہلی بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

اپریل یا مئی میں لارڈ ویول ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر مزید مشورے کے لیے لندن گئے اور مئی کے آخر میں واپس ہندوستان آ گئے۔ ایک شام میں نے ریڈیو پر دہلی کی خبروں میں سنا کہ وائسرائے نے یہ اعلان کیا ہے کہ برطانیہ کی سابق یقین دہانیوں کے مطابق ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے ازسرنو اقدامات کیے جائیں گے، شملہ میں ایک کانفرنس بلائی جائے گی جس میں شرکت کے لیے کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کو دعوت دی جائے گی اور ورکنگ کمیٹی کے صدر اور ارکان کو رہا کر دیا جائے گا تاکہ وہ اس کانفرنس میں شریک ہو سکیں۔

دوسرے دن میں نے سنا کہ میری اور میرے ساتھیوں کی رہائی کے لیے احکامات جاری کر دیے گئے ہیں۔ میں نے یہ خبر رات نو بجے سنی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بھی ریڈیو پر یہ خبر سنی اور رات دس بجے مجھے پیغام بھیجا کہ اگرچہ اس نے یہ خبر سنی ہے مگر اسے ابھی تک سرکاری طور پر کوئی حکم موصول نہیں ہوا، جیسے ہی اسے کوئی حکم ملے گا وہ مجھے مطلع کر دے گا۔ چنانچہ آدھی رات کو جیلر نے آ کر اطلاع دی کہ رہائی کے احکامات آ گئے ہیں۔ اتنی رات گئے کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی تھی اس لیے صبح سویرے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے رہائی کا حکم پڑھ کر سنایا اور مجھے بتایا کہ کلکتہ ایکسپریس شام پانچ بجے بنکورا سے روانہ ہوتی ہے جس میں ایک فرسٹ کلاس کوپے میرے لیے ریزرو کرایا جا رہا ہے۔

چند گھنٹوں میں کلکتے سے اخباری نامہ نگار مجھ سے ملنے کے لیے آ پہنچے۔ مقامی لوگ بھی ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ ساڑھے تین بجے سہ پہر کو مقامی کانگریس کمیٹی نے ایک جلسے کا انتظام کر لیا جس میں میں نے مختصر تقریر کی۔ میں ایکسپریس کے ذریعے کلکتہ روانہ ہوا اور اگلی صبح ہوڑا پہنچ گیا۔

ہوڑا کے پلیٹ فارم اور اسٹیشن پر انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے کمپارٹمنٹ سے باہر نکلا اور کار میں بیٹھ گیا۔ بنگال کانگریس کی صدر مسز لبانیا پربھا دتا اور کئی دوسرے مقامی لیڈر میرے ساتھ کار میں تھے۔ ہم روانہ ہونے والے ہی تھے کہ میری نظریں بینڈ بجانے والوں پر پڑیں جو میری کار کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے مسز دتا سے پوچھا کہ وہ بینڈ باجا کس لیے لائے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میری رہائی کی خوشی منانے کے لیے! مجھے یہ بات پسند نہ آئی اور میں نے انہیں کہا کہ یہ جشن منانے کا وقت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے رہا کر دیا گیا ہے لیکن میرے ہزاروں دوست اور ساتھی اب بھی جیلوں میں بند ہیں۔

میری درخواست پر بینڈ بند کر کے اسے وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ جب کار ہاؤڑا پل پر سے گزر رہی تھی تو مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آ گیا۔ میں نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا تو تین سال پہلے کے اس دن کی یاد تازہ ہو گئی جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی روانہ ہوا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھیں۔ اب میں تین سال کے بعد واپس آ رہا تھا مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں اور میرا گھر سونا ہو گیا تھا۔ مجھے ورڈز ورتھ کا یہ شعر یاد آ گیا:

مگر آہ! اب وہ قبر میں محو خرام ہے

اور میری دنیا کیسی بدل گئی ہے!

میں نے اپنے ساتھیوں سے کار واپس کرنے کے لیے کہا کیونکہ میں گھر جانے سے پہلے ان کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔ میری کار ہاروں سے لدی ہوئی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک ہار لے کر قبر پر چڑھایا اور خاموشی کے ساتھ فاتحہ پڑھی۔

نواں باب

شملہ کانفرنس

جنگ شروع ہوتے ہی امریکا کی رائے عامہ برطانیہ پر زور دینے لگی کہ وہ ہندوستان کو آزاد کردے۔ پرل ہاربر پر جاپانیوں کے حملے کے بعد امریکا جنگ میں براہ راست ملوث ہو گیا۔ صدر روز ویلٹ نے چرچل کے سامنے بار بار یہ مسئلہ اٹھایا اور غالباً انگریز یہ محسوس کرنے لگے کہ امریکیوں کے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ کرپس مشن جب ہندوستان آیا تو بی بی سی کی اوورسیز سروس نے بار بار یہ اعلان نشر کیا کہ اب ہندوستان کو آزادی حاصل کرنے اور جنگ کے بارے میں اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ صدر روز ویلٹ کا ایک ذاتی نمائندہ بھی میرے نام ان کا ایک خط لے کر ہندوستان آیا۔ امریکی صدر نے اس مکتوب میں یہ امید ظاہر کی تھی کہ ہندوستان کرپس کی پیشکش کو قبول کر کے جنگ میں جمہوری ریاستوں کی طرف شریک ہو جائے گا۔ لیکن کرپس مشن ناکام ہو گیا اور صورت حال وہی رہی جو پہلے تھی۔

اگست ۱۹۴۲ میں جب ہمیں گرفتار کیا گیا تو اس کا امریکا پر جو اثر پڑا وہ برطانیہ کے حق میں اچھا نہیں تھا۔ اس وقت ہمیں یہ معلوم نہ ہوا البتہ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ امریکی عوام نے برطانیہ کی اس کارروائی پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ واشنگٹن میں سینیٹ اور ایوان نمائندگان نے اس مسئلے پر بحث کی اور بہت جوشیلی تقریریں کی گئیں۔

یورپ میں جنگ کی صورت حال بہتر ہونے لگی تو امریکیوں نے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو حل کرنے کی ضرورت پر پھر زور دینا شروع کر دیا۔ لارڈ ویول اور وزیر ہند کے درمیان صلاح مشورے کے بعد گول میز کانفرنس بلانے کا ایک سبب غالباً امریکا کا یہ دباؤ تھا۔ اپریل میں یورپ میں جنگ عملاً ختم ہو گئی لیکن ایشیا میں اس کے بند ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ جاپان کا اب تک وسیع علاقوں پر قبضہ تھا اور خود اسے عملی اعتبار سے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اب تک امریکی ہتھیاروں کی بیشتر طاقت یورپی میدان جنگ میں بروئے کار لائی جا رہی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جاپانیوں کی شکست کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ امریکا کے لیے جاپان کی شکست کا معاملہ جرمنی کی شکست سے بھی زیادہ اہم تھا۔ امریکیوں نے یہ خوب سمجھ لیا تھا کہ اگر ہندوستان کی پوری امداد حاصل ہو تو جاپانیوں کو شکست دینا بہت آسان ہو جائے گا۔ برما، سنگاپور اور انڈونیشیا پر جاپان کا قبضہ تھا اور ان تمام علاقوں میں ہندوستان کی مدد بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ یورپ میں اگرچہ ہٹلر کو

پوری طرح کچل دیا گیا تھا لیکن جاپان کو جلد شکست دینے کے لیے ہندوستان کا تعاون ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے امریکی دباؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

کلکتہ اس وقت مشرق میں امریکی فوجوں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور اس وجہ سے وہ امریکی نامہ نگاروں اور فوجی افسروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سب مجھ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔ میں نے کلکتہ پہنچنے کے اگلے روز ان میں سے بعض لوگوں سے ملاقات کی۔ انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کیے بغیر نفس معاملہ پر گفتگو شروع کر دی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ وائسرائے کی پیشکش پر کانگریس کا ردعمل کیا ہوگا؟ میں نے جواب دیا کہ جب تک مجھے اس پیشکش کی تفصیلات معلوم نہیں ہوتیں اس وقت تک میں کوئی قطعی بات کہنے کی پوزیشن میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک ہندوستان پر انگریزوں کا سیاسی تسلط برقرار ہے اس وقت تک وہ جنگ میں شرکت پر مائل نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی شخص کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں تو وہ ہاتھ پیر باندھنے والے کے دشمن سے لڑنے پر کیسے آمادہ ہوگا؟

انہوں نے اس کے جواب میں مجھ سے پوچھا کہ کیا اٹلانٹا کے چارٹر میں ہندوستان کی آزادی کی ضمانت نہیں دی گئی؟ میں نے الٹ کر جواب دیا کہ میں نے اس چارٹر کو تحریری شکل میں نہیں دیکھا اور مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا ہے؟

اس کے بعد میں نے کہا کہ غالباً آپ اس مشہور بیان کا حوالہ دے رہے ہیں جو صدر روز ویلٹ نے مسٹر چرچل کے ساتھ مذاکرات کے بعد جاری کیا ہے۔ روز ویلٹ نے کہا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد تمام قوموں کو حق خود ارادی کے اصول کے تحت اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ جب پارلیمنٹ میں مسٹر چرچل سے یہ سوال کیا گیا کہ آیا ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ اس بیان کے مطابق ہوگا تو انہوں نے زوردار انداز میں واضح طور پر کہا تھا: ''نہیں! وہ ایک دفعہ نہیں بلکہ تین مرتبہ یہ اعلان کر چکے ہیں کہ ہندوستان پر اس نام نہاد چارٹر کا اطلاق نہیں ہوگا۔'' انہوں نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ صدر امریکا کے بیان میں ہندوستان کا مسئلہ مدنظر نہیں تھا۔ جب مسٹر روز ویلٹ کی توجہ چرچل کے اس جواب کی طرف مبذول کرائی گئی تو انہوں نے اعتراف کیا کہ برطانوی وزیراعظم کے ساتھ ان کے مذاکرات کا کوئی تحریری ریکارڈ نہیں ہے اس لیے چرچل ان کے بیان کے پابند نہیں اور نہ ہی سیاسی اعتبار سے اس کی کوئی اہمیت ہے۔

امریکی نامہ نگاران حقائق سے ناواقف نہیں تھے اس لیے جب میں نے ان سے پوچھا کہ چارٹر کہاں اور کیا ہے تو وہ مسکرا دیے۔ ان نامہ نگاروں میں ایک خاتون بھی شامل تھیں۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا چارٹر کی موجودگی کے بارے میں میرے خطیبانہ سوال کا اشارہ روز ویلٹ کے اس اعتراف کی جانب ہے کہ مسٹر چرچل کے ساتھ ہونے والی مفاہمت کا کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں ہے؟

میں نے کہا: ''بلاشبہ میرے ذہن میں یہی بات تھی''۔ نامہ نگاروں نے مجھ سے آخری سوال یہ کیا کہ اگر کانگریس نے ویول کی پیشکش قبول کر لی تو کیا میں ہندوستانیوں کی جبری بھرتی کی حمایت کروں گا؟

میں نے جواب میں کہا کہ اگر ہندوستان کو اس کی آزادی کا یقین دلا دیا گیا تو وہ جنگ میں رضا کارانہ طور پر شریک ہو جائے گا۔ اس وقت ہمارا پہلا فرض یہ ہوگا کہ پوری قومی طاقت کو جنگ کے لیے بروئے کار لائیں اور جبری بھرتی کی حمایت کریں۔

میں نے نامہ نگاروں کو اپنا وہ بیان یاد دلایا جو میں نے ۱۹۴۰ کے اوائل میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے جاری کیا تھا۔ میں نے اس بیان میں یہ اعلان کیا تھا کہ اگر ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل کر دیا گیا تو وہ نہ صرف اپنی مرضی سے جنگ میں شریک ہوگا بلکہ جبری بھرتی کے ذریعے اپنے ہر تندرست نوجوان کو جنگ کے محاذ پر بھی بھیجے گا۔ میں نے اس وقت یہ بھی کہا تھا کہ ہماری پیشکش صرف جمہوریت کے لیے جینا ہی نہیں بلکہ اس کے لیے جان دینا بھی ہے۔ میں نے کہا: یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ انگریزوں نے ہمیں عزت کے ساتھ مرنے کا موقع بھی نہ دیا اور میری پیشکش کو مسترد کر دیا۔

۱۴ جون ۱۹۴۵ کو وزیر ہند مسٹر ایل ایس ایمری نے برطانوی دارالعوام میں ایک بیان دیا جس میں انہوں نے اعلان کیا کہ ہندوستان کو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے جنگ کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔ اس کے بعد جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آیا انڈین نیشنل کانگریس کے لیڈروں کو حکومت چلانے کا کام سونپا جائے گا تو مسٹر ایمری نے کہا کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کو حکومت بنانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ کانگریس کو اپنی مرضی کے مطابق مولانا آزاد اور جواہر لعل سمیت کسی بھی لیڈر کو اپنا نمائندہ منتخب کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔

ہندوستان میں اس بیان سے عام طور پر یہ تاثر لیا گیا کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ آخر کار حل ہونے والا ہے۔ لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ کانگریس کی طرف سے اس پیشکش کو منظور نہ کرنے کی اب کوئی وجہ نہیں ہے۔ میرے پاس روزانہ سیکڑوں ٹیلی گرام اور خط آنے لگے جن میں اس پر اصرار ہوتا تھا کہ کانگریس کو یہ پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔ میں نے ملک میں یہ ماحول دیکھا تو اخبارات کو ایک مختصر بیان جاری کر دیا۔ میں نے واضح کیا کہ کانگریس نے کبھی ذمے داری قبول کرنے سے گریز نہیں کیا بلکہ ایسے موقعوں کا ہمیشہ خیر مقدم کیا ہے۔ اگر ہندوستان کو اپنے سیاسی اور انتظامی مستقبل کا تعین کرنے کا موقع دیا جاتا ہے تو میں اس چیلنج کو قبول کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ میں نے واضح اور دوٹوک لفظوں میں کہا کہ میں آزادی کی شاندار عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہوں، میرا نقطہ نظر تعمیری ہے، تخریبی نہیں!

رہائی کے ایک دن بعد مجھے کلکتے میں وائسرائے کی طرف سے گول میز کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا جو ۲۵ جون کو شملے میں ہونے والی تھی۔ میں نے جواب میں لکھا کہ میں نے ۲۱ جون ۱۹۴۵ کو بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا ہے۔ میں نے انہیں یہ بھی لکھا کہ میں کانفرنس سے پہلے ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ اگر میں اس خط و کتابت کو شائع کردوں جو احمد نگر جیل سے میرے اور ان کے درمیان ہوئی تھی تو انہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟

اس زمانے میں میری صحت بہت خراب تھی۔ میرا وزن چالیس پاؤنڈ کم ہو گیا تھا اور مجھ سے کچھ کھایا نہیں جاتا تھا۔ مجھے بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور قویٰ جیسے شل ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ میں وائسرائے سے کانفرنس کو کم سے کم دو ہفتے کے لیے ملتوی کرنے کی درخواست کروں۔ اس سے مجھے علاج اور طبیعت بحال کرنے کا موقع مل جائے گا مگر میں نے اس قدر اہم اجلاس کو محض ذاتی صحت کی خاطر ملتوی کرانا مناسب نہ سمجھا۔

میں نے بنگال لیجسلیٹو کونسل کے ممتاز رکن ہمایوں کبیر سے کہا کہ وہ شملہ کانفرنس کے دوران میرے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کریں۔ میں نے انہیں پہلے سے جواہر لعل کے لیے ایک پیغام دے کر بمبئی بھیج دیا۔ میں نے جواہر لعل کو بتایا کہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے پہلے ہمیں اپنا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے ایک ملاقات کر لینی چاہیے۔ انہوں نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور کہا کہ ان کے اپنے ذہن میں بھی یہی خیال موجود تھا۔

میں ۲۱ جون کو بمبئی پہنچا اور حسب معمول بھولا بھائی ڈیسائی کے ہاں ٹھہرا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں سے مجھے ۹ اگست ۱۹۴۲ کو گرفتار کیا گیا تھا۔ میں برآمدے میں بیٹھا اور دوستوں سے باتیں کرنے لگا تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تین برس بیت چکے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ میں کل ہی ان لوگوں سے ملا تھا اور ۹ اگست کے بعد جو واقعات پیش آئے، وہ محض خواب و خیال تھے۔ گرد و پیش کی چیزیں وہی تھیں، دوست بھی وہی تھے اور وہی بحیرہ عرب دور افق تک اپنا دامن پھیلائے ہوئے تھا۔

گاندھی جی اپنے دستور کے مطابق برلا ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم نے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بھی وہیں بلا لیا تا کہ وہ آسانی سے اس میں شریک ہو سکیں۔ میں نے ورکنگ کمیٹی کو اس دعوت نامے کے بارے میں بتایا جو شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے مجھے بھیجا گیا تھا۔ ورکنگ کمیٹی نے اس پر غور کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میں گول میز پر کانگریس کی نمائندگی کروں۔ وائسرائے کو اس فیصلے سے مطلع کر دیا گیا جنہوں نے بمبئی سے ہمارے سفر کے انتظامات کر دیے۔ مجھے انبالے تک پہنچانے کے لیے ایک ہوائی جہاز دے دیا گیا۔ وہاں سے ایک کار کے ذریعے میں شملہ پہنچ گیا۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ بمبئی سے روانگی سے پہلے مجھے وائسرائے کی طرف سے اس

خط کا جواب مل گیا جو میں نے انہیں کلکتے سے لکھا تھا۔ وہ کانفرنس سے پہلے میرے ساتھ ملاقات کرنے پر خوشی سے راضی ہو گئے مگر خط وکتابت کی اشاعت کے بارے میں انہوں نے کہا کہ چونکہ وہ خود شملے آ رہے ہیں اس لیے وہ اس معاملے پر وہیں گفتگو کریں گے۔

اس روز بہت گرمی تھی اور جب ہم دہلی پہنچے تو میں تھکن سے چُور ہو چکا تھا۔ انبالے سے کالکا تک موٹر کار میں سفر اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ پورے راستے میں لوگوں کے ہجوم ہم سے ملتے رہے۔ لوگوں نے کار کو گھیرے میں لے لیا، پائیدانوں اور چھت پر چڑھ گئے اور ہم بڑی مشکل سے آگے بڑھ پائے۔ معلوم ہوتا تھا کہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ ان سے بار بار اپیل کی گئی کہ وہ آگے سے ہٹ جائیں اور ہمیں روکیں نہیں کیونکہ اس طرح تاخیر ہو جائے گی اس لیے ہمیں جانے دیں۔ آخر رات دس بجے ہم شملے پہنچ گئے۔ ہمیں سیوائے ہوٹل لے جایا گیا جہاں ہمارے لیے کمرے مخصوص تھے۔

اگلی صبح دس بجے میں نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ انہوں نے نہایت اخلاق کے ساتھ میرا استقبال کیا اور برطانوی حکومت کی طرف سے نئی تجویزوں کا مختصر خاکہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ جنگ کے زمانے میں دوررس آئینی تبدیلیاں نہیں کی جائیں گی البتہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں گے۔ وہ یہ روایت قائم کرنے کی بھی کوشش کریں گے کہ وائسرائے ہمیشہ کونسل کے مشوروں پر عمل کرے۔ انہوں نے مجھ سے اپیل کی کہ میں حکومت پر اعتبار کروں۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کا مسئلہ حل ہونا چاہیے۔ انہوں نے اس جانب بھی اشارہ کیا کہ اب جنگ بند ہونے والی ہے، ہندوستان کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اس پیشکش کو قبول کر لے اور جنگ کو کامیاب انجام تک پہنچانے کے لیے انگریزوں کے ساتھ تعاون کرے۔ پھر انہوں نے مسلم لیگ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان مفاہمت ضروری ہے۔

میں نے صاف صاف لفظوں میں انہیں بتایا کہ لیگ کے ساتھ مفاہمت بظاہر بہت مشکل ہے۔ لیگ پر جن لوگوں کا کنٹرول ہے، ان کا تاثر یہ ہے کہ انہیں حکومت کی تائید حاصل ہے اس لیے وہ معقول شرطوں پر مفاہمت نہیں کریں گے۔

وائسرائے نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت کی طرف سے لیگ کی حمایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر مسلم لیگ کے لیڈروں کو ایسا کوئی خیال ہے تو وہ مکمل طور پر غلطی پر ہیں۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ حکومت غیر جانبدار ہے اور رہے گی۔

اس کے بعد میں نے اس خط وکتابت کا سوال اٹھایا جو احمد نگر جیل سے میرے اور ان کے درمیان ہوئی تھی۔ میں نے امید ظاہر کی کہ انہیں اس کی اشاعت پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

وائسرائے نے کہا کہ اگر مجھے واقعی اس میں گہری دلچسپی ہے تو وہ اس کی اشاعت پر کوئی اعتراض نہیں کریں گے البتہ اس وقت انہیں چھاپنا افسوسناک ہوگا۔ انہوں نے کہا اب ہم ایک نئے جذبے اور عزم کے ساتھ ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ملاقات کرنے والے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ ماضی کی کدورتیں اور تلخیاں بھلا دی جائیں۔ اگر اس وقت پرانی یادیں تازہ کی گئیں تو ماحول بدل جائے گا اور دوستی اور خلوص کے بجائے بداعتادی اور غصے کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ انہوں نے مجھ سے اپیل کی کہ میں اس خط و کتابت کی اشاعت کے معاملے پر زور نہ دوں اور یہ کہ اگر میں نے ان کی تجویز مان لی تو وہ بہت ممنوں ہوں گے۔

میں نے دیکھا کہ وائسرائے کا انداز مخلصانہ ہے اور وہ دل سے سیاسی فضا میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے بھی ایک نئی فضا پیدا کرنے اور دوستی کے ایک نئے جذبے کے ساتھ اپنے مسائل پر گفتگو کرنے کی خواہش ہے۔ میں کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جس سے ماحول خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ چنانچہ میں نے ان کی تجویز مان لی۔

وائسرائے نے دو مرتبہ کہا کہ وہ ان جذبات کے اظہار پر میرے شکر گزار ہیں۔

اس کے بعد وائسرائے نے اپنی تجویز کی تفصیلات بیان کیں۔ میرا پہلا ردعمل یہ تھا کہ یہ تجویز بنیادی طور پر کرپس کی پیشکش سے مختلف نہیں ہے البتہ اب حالات میں ایک بڑا فرق رونما ہو چکا تھا۔ کرپس کی پیشکش اس وقت کی گئی تھی جب انگریزوں کو ہندوستان کے تعاون کی اشد ضرورت تھی۔ آج یورپ میں لڑائی ختم ہو چکی ہے اور اتحادی ہٹلر پر نمایاں فتح حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے باوجود برطانوی حکومت ہندوستان میں ایک نیا سیاسی ماحول پیدا کرنے کی غرض سے اپنی پچھلی تجویز کو دوبارہ پیش کر رہی تھی۔

میں نے وائسرائے کو بتایا کہ انڈین کانگریس نے مجھے اپنی طرف سے کارروائی کرنے کا اختیار دیا ہے لیکن میں قطعی جواب دینے سے پہلے اپنے رفقا کے ساتھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ اسی خیال سے میں نے تجویز کو دوبارہ غور کے لیے شملے میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بلایا ہے۔ اس طرح میں کانگریس کا فیصلہ کانفرنس میں پیش کر سکوں گا۔ میں نے لارڈ ویول کو یقین دلایا کہ میں دشواریاں پیدا کرنے کے بجائے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔

وائسرائے جب میرے سامنے اپنی تجویزیں بیان کر رہے تھے تو ان کے انداز میں ایک بے تکلفی اور خلوص تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کا رویہ ایک سیاستدان کا نہیں بلکہ سپاہی کا ہے۔ انہوں نے کھل کر براہ راست گفتگو کی اور کسی ہیر پھیر کے بغیر اصل نکتے کی طرف آ گئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کا انداز فکر سر اسٹیفرڈ کرپس سے بالکل مختلف تھا۔ کرپس نے اپنی تجویزوں کے مثبت پہلوؤں اور مضبوط نکات کو اجاگر کیا اور کمزور پہلوؤں کو

پس پشت ڈالنے کی کوشش کی لیکن لارڈ ویول نے کسی قسم کی رنگ آمیزی نہ کی۔ وہ مجھے کوئی غلط تاثر نہیں دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے کھردرے لہجے میں کہا کہ لڑائی ابھی جاری ہے اور جاپان ایک طاقتور دشمن ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں برطانوی حکومت کوئی دور رس قدم اٹھانے کو تیار نہیں ہے۔ اس کے لیے جنگ کے خاتمے کا انتظار کرنا ہوگا البتہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت دور اثر تبدیلیوں کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ ایگزیکٹو کونسل صرف ہندوستانی ارکان پر مشتمل ہوگی اور اس طرح ملک کی اعلیٰ ترین انتظامیہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آجائے گی۔ جب ایک مرتبہ یہ ہوگیا تو ایک نئی صورت حال پیدا ہو جائے گی اور جنگ کے بعد مزید پیش رفت یقینی ہو جائے گی۔

لارڈ ویول کے ساتھ میری ملاقات سے شملے کی فضا بدل گئی۔ وائسرائے اس رات سرکاری ضیافت دینے والے تھے اور میں نے سنا کہ ڈنر کے دوران انہوں نے میری بہت تعریف کی۔ انہوں نے کانگریس کے دوسرے لیڈروں کا بھی حوالہ دیا اور کہا کہ کانگریسی لیڈروں کے سیاسی خیالات اور حکومت کے ساتھ ان کے اختلافات جیسے بھی ہوں، وہ شریف آدمی ہیں۔ وائسرائے کے یہ ریمارکس پورے شملے میں پھیل گئے اور ان سے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ بہت سے لوگ، جن کا اس وقت تک کانگریس کے ساتھ رویہ سرد مہری پر مبنی تھا اور میرے وجود کو بھی بمشکل تسلیم کرتے تھے، یکبارگی ہم سے محبت کرنے لگے۔ وہ میرے پاس تحفے تحائف لے کر آنے لگے اور مجھے یقین دلانا چاہا کہ انہوں نے کانگریس کو ہمیشہ دل کی گہرائیوں سے سراہا ہے اور اس کی طرفداری کی ہے۔

۲۴ تاریخ کی سہ پہر کو سردار ہرنام سنگھ کے مکان پر ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جہاں گاندھی جی ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے اجلاس میں وائسرائے سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں مختصر رپورٹ پیش کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اگرچہ ان کی یہ پیشکش کرپس سے مختلف نہیں ہے اس کے باوجود ہمیں یہ پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔ میں نے اپنے موقف کی حمایت میں بدلے ہوئے حالات کا حوالہ دیا۔ یورپ میں اب جنگ ختم ہو چکی تھی اور جاپان بھی زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مرتبہ جنگ ختم ہوگئی تو برطانیہ کے لیے ہمارا تعاون حاصل کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہے گی۔ چنانچہ ویول کی پیشکش کو مسترد کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھ کر کانفرنس میں شرکت کرنی چاہیے کہ اگر شرطیں مناسب ہوئیں تو ہم انہیں قبول کر لیں گے۔

اس پر ایک طویل بحث ہوئی لیکن ورکنگ کمیٹی نے آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں کانفرنس میں درج ذیل نکات پر زور دینا چاہیے:

۱۔ ہمیں اس بارے میں واضح اور صاف بیان ملنا چاہیے کہ ایگزیکٹو کونسل کا وائسرائے کے ساتھ کیا تعلق ہو

گا؟ کیا ایسی صورت میں جب کونسل متفقہ فیصلہ کرے، وائسرائے اس کا پابند ہوگا یا وائسرائے کو ایسی صورتوں میں بھی ویٹو کا اختیار ہوگا؟

۲-فوج کی حیثیت واضح ہونی چاہیے۔ایک زمانہ ایسا تھا کہ فوج اور عوام کے درمیان ایک دیوار حائل تھی۔اب یہ صورت حال تبدیل ہونی چاہیے تاکہ ہندوستانی لیڈروں کو فوج کے ساتھ رابطے کا موقع مل سکے۔

۳- برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کی رائے معلوم کیے بغیر ہندوستان کو جنگ میں دھکیل دیا تھا البتہ کانگریس نے اس صورت حال کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔اگر کوئی تصفیہ ہوتا ہے اور نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل پاتی ہے تو اسے ہندوستان کے جنگ میں شریک رہنے کے مسئلے کو ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں پیش کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ ہندوستان جاپان کے خلاف جنگ میں برطانوی فیصلے کے تحت نہیں بلکہ اپنے نمائندوں کی رائے کی بنا پر شریک ہوگا۔

گاندھی جی ورکنگ کمیٹی کے اس اجلاس میں شروع سے آخر تک موجود رہے اور وہ اس فیصلے میں ایک فریق تھے۔ انہوں نے اس موقعے پر یہ سوال نہ اٹھایا کہ جنگ میں شرکت کا مطلب یہ ہے کہ کانگریس عدم تشدد کے اصول سے دستبردار ہو رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی تشدد یا عدم تشدد کا سوال نہ اٹھایا۔ ورکنگ کمیٹی کے وہ ارکان بھی، جنہوں نے اس سے پہلے اس بنا پر استعفا دے دیا تھا، خاموش بیٹھے رہے۔

وائسرائے کے اعلان کے مطابق انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے صدور اور شیڈول کاسٹ اور سکھوں کے نمائندے کانفرنس میں شریک ہوئے۔مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر اور مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر کونسل آف اسٹیٹ میں کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ کے لیڈروں اور اسمبلی میں نیشنلسٹ پارٹی اور یورپی گروپ کے لیڈروں کو بھی دعوت دی گئی۔ ان کے علاوہ کانفرنس میں وہ لوگ بھی شریک ہوئے جو اس وقت صوبائی حکومت کے وزیراعظم تھے یا انہوں نے حال ہی میں یہ منصب سنبھالا تھا۔ ہندو مہا سبھا نے کوشش کی کہ اسے بھی دعوت دی جائے لیکن وائسرائے نے ان کے استحقاق کو تسلیم نہ کیا۔

ہم سے کہا گیا کہ کانفرنس شروع ہونے سے کچھ پہلے آ جائیں۔ وائسرائے نے وائسریگل لاج کے لان میں ہمارا استقبال کیا جہاں ہمارا ان سے رسمی تعارف کرایا گیا۔ میں اس زمانے میں بہت کمزور تھا اور میرے لیے چند منٹ سے زیادہ کھڑے رہنا بہت مشکل تھا۔ میں نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری سر ایوان جینکنز سے اس کا ذکر کیا تو وہ مجھے ایک کونے میں لے گئے جہاں ایک صوفہ پڑا ہوا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے چند منٹ گزرے تھے کہ وہ ایک خاتون کو لے کر آئے اور تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ عربی زبان کی بہت اچھی عالم ہیں۔ میں نے خاتون کے ساتھ عربی میں گفتگو کرنے کی کوشش کی تو مجھے پتا چلا کہ اس بیچاری کا علم نعم (ہاں) اور

لا (نہیں) تک محدود تھا۔ پھر میں نے اس خاتون سے انگریزی میں پوچھا کہ آخر وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کو یہ خیال کیسے ہوا کہ آپ عربی زبان روانی سے بولتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں چند مہینے بغداد میں رہ کر آئی ہوں اور کل رات میں نے کھانے کی دعوت میں کچھ مہمانوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ کسی عرب کو کسی بات پر تعجب ہو تو وہ ''عجیب عجیب'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ خاتون نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس سے مہمان بہت مرعوب ہوئے اور انہوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ میں عربی زبان کی اسکالر ہوں۔

تھوڑی دیر کے بعد لارڈ ویول آئے اور کہا کہ اب کانفرنس روم میں جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہاں نشستوں کی ترتیب ایسی تھی کہ وائسرائے درمیان میں تھا، کانگریس سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی کی حیثیت سے وائسرائے کے بائیں طرف تھی اور لیگ دائیں طرف۔ اس طرح شاید غیر شعوری طور پر یہ اعتراف کیا گیا کہ لیگ حکومت کی حامی ہے۔ بحث مباحثہ سارا دن جاری رہا اور صرف لنچ کے لیے وقفہ کیا گیا۔ کانفرنس عام پبلک کے لیے نہیں تھی اور اس میں اخباری نمائندوں کو نہیں بلایا گیا تھا۔ پہلی نشست کے بعد میں نے لارڈ ویول سے کہا کہ اگر اخبارات کو سرکاری طور پر کوئی رپورٹ نہ بھیجی گئی تو ہماری گفتگو کے بارے میں بے بنیاد قیاس آرائیاں کی جائیں گی اس لیے مناسب ہوگا کہ اخبارات کے لیے ایک پریس ریلیز جاری کر دیا جائے البتہ یہ پریس ریلیز تمام شرکا کے اتفاق رائے سے جاری ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ ہر نشست کے بعد ایک سرکاری بیان تیار کیا جائے گا اور بیان جاری ہونے سے پہلے کانفرنس سے منظوری حاصل کی جائے گی۔ چنانچہ اسی شام مجھے ایک مسودہ بھیج دیا گیا اور میں نے ایک یا دو معمولی ترمیموں کے بعد اسے واپس کر دیا۔ اخباروں کو جاری کرنے سے پہلے یہ ترمیمیں بیان میں شامل کر لی گئیں۔ پوری کانفرنس کے دوران اسی طریق کار پر عمل ہوتا رہا۔

کانفرنس شروع ہوتے ہی کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات منظر عام پر آ گئے۔ دوسرے دن تک کانفرنس میں چند بڑے اصولوں پر اتفاق ہو گیا جن میں اقلیتوں کی نمائندگی، جنگ کی سرگرمیوں میں خلوص دل کے ساتھ شرکت اور جنگ کے خاتمے تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت نو تشکیل شدہ ایگزیکٹو کونسل کا تسلسل جیسے اہم مسئلے شامل تھے تاہم کونسل کی رکنیت کے بارے میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ مسٹر جناح کا مطالبہ تھا کہ کانگریس تمام ہندو ممبروں کو نامزد کر سکتی ہے لیکن مسلمان ارکان کو صرف لیگ نامزد کرے گی۔ میں نے واضح کیا کہ کانگریس اس مطالبے کو ہرگز تسلیم نہیں کر سکتی۔ کانگریس تمام سیاسی مسائل پر قومی نقطہ نظر کی حامل تھی اور وہ سیاسی ایشوز پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی امتیاز روا نہیں رکھتی تھی۔ وہ کسی حالت میں بھی اس پر راضی نہیں ہو سکتی کہ اسے صرف ہندوؤں کی تنظیم قرار دیا جائے چنانچہ میں نے اصرار کیا کہ کانگریس کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جس ہندوستانی کو چاہے نامزد کرے قطع نظر اس کے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان، عیسائی

ہے، پارسی ہے یا سکھ۔ کانگریس کو ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر کانفرنس میں شرکت کرنی چاہیے ورنہ شرکت ہی نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے، اسے اپنی طرف سے فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ اس کے نمائندے کون ہوں گے۔

۲۶ جون کی صبح کانفرنس کا دوبارہ اجلاس ہوا لیکن مندوبین کو آپس میں صلاح مشورے کا موقع دینے کے لیے دوپہر کے کھانے سے پہلے اجلاس برخاست کر دیا گیا۔ مسٹر جناح نے کانگریس کے ساتھ غیر رسمی گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے پنڈت گوند بلبھ پنت کو اس مقصد کے لیے نامزد کر دیا جنہیں میں مسٹر جناح سے گفت وشنید کرنے کے لیے سب سے مناسب شخص سمجھتا تھا۔ ان کے درمیان گفتگو کئی روز تک جاری رہی لیکن اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ خضر حیات خان نے، جو پنجاب کے وزیر اعظم کی حیثیت سے کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، اس دوران کئی بار مجھ سے ملاقات کی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمام مسئلوں پر ان کا رویہ بہت معقول تھا اور جیسے جیسے دشواریاں پیدا ہوئیں، انہوں نے ان کے حل کرنے میں مدد کی اور دوسروں سے تعاون کیا۔

شملہ کانفرنس ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں حد فاصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مذاکرات ہندوستان اور برطانیہ کے بنیادی مسئلے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس فرقہ وارانہ مسئلے کی وجہ سے ناکام ہوئے جس نے مختلف ہندوستانی گروپوں میں تفرقہ ڈال دیا تھا۔ اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے مسلم لیگ کی گزشتہ تاریخ پر نظر دوڑانا ضروری ہے۔ مسلم لیگ نے سیاسی مسئلوں کو حل کرنے کے لیے جو رویہ اختیار کیا اسے تین مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

مسلم لیگ ڈھاکا کے مقام پر ۱۹۰۶ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے بعد کرسمس میں قائم کی گئی تھی اور اس کا آغاز نواب مشتاق حسین کی کوششوں سے ہوا تھا۔ میں اس اجلاس میں موجود تھا اور لیگ کے قیام کے جو دو مقاصد بیان کیے گئے تھے وہ مجھے یاد ہیں۔ کہا گیا تھا کہ اس کے قیام کا ایک مقصد ہندوستانی مسلمانوں میں برطانوی حکومت سے وفاداری کے جذبے کو تقویت پہنچانا ہے۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ سرکاری ملازمتوں کے معاملے میں ہندوؤں اور دوسرے طبقوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے مفادات اور حقوق کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ اس طرح لیگ کے لیڈر فطری طور پر کانگریس کی جانب سے پیش کیے جانے والے سیاسی آزادی کے مطالبے کے خلاف تھے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ اگر مسلمان ایسے کسی مطالبے میں شریک ہوئے تو برطانیہ تعلیم اور ملازمتوں کے معاملے میں مسلمانوں کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کرے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ کانگریس کو باغیوں کی غدار تنظیم قرار دیتے تھے اور گوکھلے اور سر فیروز شاہ مہتا جیسے اعتدال پسند سیاسی لیڈروں تک کو انتہا پسند کہتے تھے۔ اس مرحلے میں برطانوی حکومت نے مسلم لیگ کو کانگریس کے مطالبات کو رد کرنے کا ذریعہ بنائے رکھا۔

مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب اس نے دیکھا کہ حکومت کانگریس کے دباؤ کی وجہ سے مختلف اصلاحات نافذ کرنے پر مجبور ہو گئی ہے لیکن کانگریس کی اپنے نصب العین کی طرف قدم بہ قدم پیش رفت پر وہ قدرے پریشان ہو گئی۔ لیگ سیاسی جدو جہد سے تو الگ اور بے تعلق رہی لیکن جیسے ہی مقاصد کے حصول میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی تو اس نے مسلمانوں کے حصے کا مطالبہ کر دیا۔ مسلم لیگ کا یہ پروگرام حکومت کے لیے سودمند تھا۔ درحقیقت یہ خیال بے بنیاد نہیں ہے کہ لیگ برطانیہ کی خواہشات کے مطابق کام کر رہی تھی۔ مورلے منٹو اصلاحات اور صوبائی خودمختاری کے بارے میں مونٹفورڈ اسکیم کے زمانے میں بھی لیگ نے یہی رویہ اپنائے رکھا۔

لیگ کے پروگرام کے تیسرے مرحلے کا آغاز دوسری عالمی جنگ کے دوران ہوا۔ اس وقت تک کانگریس اپنی ساکھ اور طاقت میں اضافہ کر چکی تھی۔ اب یہ صاف ظاہر تھا کہ برطانوی حکومت کو ہندوستان کی آزادی تسلیم کرنا پڑے گی۔ مسٹر جناح اب مسلم لیگ کے لیڈر بن چکے تھے اور وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ انہیں کانگریس اور حکومت کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کانگریس اور حکومت کے درمیان اقتدار کی منتقلی کے معاملے پر جب بھی مذاکرات ہوتے تو مسٹر جناح شروع میں خاموش رہتے، اگر گفتگو ناکام ہو جاتی تو وہ کوئی بودا سا بیان جاری کر دیتے جس میں وہ دونوں فریقوں کی مذمت کر دیتے اور یہ کہتے کہ چونکہ کوئی سمجھوتا طے نہیں پایا اس لیے مسلم لیگ کو برطانوی پیشکش کے بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگست ۱۹۴۰ کی پیشکش اور ۱۹۴۲ میں کرپس کی تجویزوں کے موقعے پر انہوں نے ایسا ہی کیا۔ شملہ کانفرنس میں انہیں ایک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جس سے اب تک انہیں سابقہ نہیں پڑا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، سیاسی مسئلوں پر کانگریس اور حکومت کے درمیان اب تک گفتگو ناکام ہو چکی تھی۔ کانگریس ہندوستان کی آزادی کی ضمانت کے بغیر کوئی حل قبول کرنے کو تیار نہیں تھی چنانچہ سیاسی ایشوز پر مذاکرات ہر دفعہ ناکام ہو جاتے اور فرقہ وارانہ مسئلے پر بات چیت کی نوبت نہ آتی۔ میں نے شملہ کانفرنس میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کو لارڈ ویول کی پیشکش قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اب جبکہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان سیاسی مسئلہ حل ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا، نئی ایگزیکٹو کونسل میں فرقہ وارانہ نمائندگی کے سوال پر یہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔

اس سے پہلے میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ اس سوال پر کانگریس کا موقف قومی نقطہ نظر پر مبنی تھا جبکہ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ کانگریس اپنے قومی کردار سے دستبردار ہو کر ایک فرقہ پرست تنظیم کی حیثیت سے کام کرے۔ مسٹر جناح نے یہ عجیب و غریب موقف اختیار کیا کہ کانگریس ایگزیکٹو کونسل کے لیے صرف ہندو ارکان

کو نامزد کر سکتی ہے۔ میں نے کانفرنس سے پوچھا کہ مسٹر جناح یا مسلم لیگ کو یہ حکم لگانے کا حق کیسے حاصل ہے کہ کانگریس کسے نامزد کرے اور کسے نہ کرے؟ اگر کانگریس مسلمانوں، پارسیوں، سکھوں یا عیسائیوں کے نام پیش کرتی ہے تو اس سے ہندو نمائندوں کی تعداد کم ہو جائے گی لیکن اس سے مسلم لیگ کا کیا تعلق ہے؟ میں نے لارڈ ویول سے کہا کہ وہ صاف صاف بتائیں کہ آیا مسلم لیگ کا یہ مطالبہ معقول ٹھہرایا جا سکتا ہے؟

لارڈ ویول نے میرے اس سوال کا براہ راست جواب نہ دیا البتہ ان کی گفتگو کا مفہوم یہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کے موقف کو معقول نہیں سمجھتے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ کہا کہ یہ معاملہ ایسا ہے جسے کانگریس اور مسلم لیگ کو آپس میں طے کرنا چاہیے اور حکومت یا خود ان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ کسی فریق کو اپنا فیصلہ منظور کرنے پر مجبور کرے۔

کونسل کی رکنیت کے بارے میں اختلاف اس وقت سامنے آیا جب سیاسی مسئلے پر سمجھوتا ہو چکا تھا۔ جب نئے نظام کا خاکہ بن گیا اور سب نے اسے تسلیم کر لیا تو سیاسی جماعتوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے نمائندوں کے نام پیش کریں۔ ظاہر ہے کہ کانگریس کی فہرست میں پہلا نام کانگریس کے صدر کا تھا۔ ہم نے خاصا غور و خوض کیا۔ میں ایک پارسی اور ایک ہندوستانی عیسائی کو فہرست میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

یہاں اس نکتے کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ مجھے اقلیتوں کے نمائندوں کو شامل کرنے پر کیوں اصرار تھا؟ اگست ۱۹۴۲ میں جب ہم گرفتار ہوئے تھے تو برطانوی حکومت نے بعض اقلیتوں کو کانگریس کے خلاف مشتعل کرنے کی کوشش کی تھی۔ جن اقلیتوں کے ساتھ اس سلسلے میں رابطہ کیا گیا ان میں ایک پارسی بھی تھے۔ یہ ایک مختصر جماعت ہے لیکن تعلیم، دولت اور قابلیت کی وجہ سے انہیں قومی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ نریمان کو نظر انداز کر کے بی جی کھیر کو بمبئی کا وزیر اعلیٰ منتخب کرنے سے اس جماعت کے ایک آدمی کے ساتھ بے انصافی کی گئی تھی۔ میں اس واقعے کا پہلے بھی تذکرہ کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ کانگریس کے ۱۹۳۷ کے ایک فیصلے سے بھی پارسیوں کو نقصان پہنچا تھا۔ جب تمام کانگریسی صوبوں میں امتناع شراب کا قانون نافذ کیا گیا تو اس سے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں پارسی تاجر سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ شراب کی تجارت پر پارسیوں کی اجارہ داری تھی اور شراب پر پابندی سے انہیں کروڑوں روپے کے کاروبار سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ حکومت کا خیال تھا کہ ان واقعات کے بعد پارسی کانگریس کے خلاف ہو جائیں گے۔ لیکن ایک جماعت کی حیثیت سے انہوں نے حکومت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بننا قبول نہ کیا۔ انہوں نے ایک بیان میں، جس پر تمام اہم اور مقتدر پارسی لیڈروں نے دستخط کیے تھے، صاف صاف اعلان کر دیا کہ دوسرے معاملوں پر اختلافات کے باوجود ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں وہ کانگریس کے ساتھ ہیں اور اس کے ساتھ رہیں گے۔

میں نے قلعہ احمد نگر کی جیل میں یہ بیان پڑھا تو مجھ پر اس کا گہرا اثر ہوا اور میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ پارسیوں نے یہ بیان جاری کر کے ہندوستان کی بہت خدمت کی ہے۔ میں نے یہ بھی تجویز کیا کہ ہمیں ان کے اس جذبے کا مناسب طریقے سے اعتراف کرنا چاہیے۔ گو پارسی بہت چھوٹی جماعت تھی اس کے باوجود میں نے یہ محسوس کیا کہ انہیں ہندوستان کی مستقبل کی حکومت میں شامل کرنا چاہیے۔ چنانچہ جب ہم ایگزیکٹو کونسل کے لیے کانگریس کے نمائندوں کی فہرست مرتب کر رہے تھے تو میں نے اصرار کیا کہ کانگریس کی طرف سے پیش کی جانے والی فہرست میں ایک پارسی کا نام بھی شامل ہونا چاہیے۔ گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو میرا یہ خیال پسند آیا لیکن وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ چونکہ کانگریس صرف پانچ افراد کو نامزد کر سکتی ہے اس لیے ایک پارسی کو شامل کرنا ممکن نہیں ہے البتہ انہوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ مستقبل کی حکومت میں ایک پارسی کے لیے جگہ نکالنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ میں اس تجویز پر راضی نہ ہوا۔ میرا موقف یہ تھا کہ مستقبل کے بارے میں کچھ یقین نہیں ہے۔ اب ہمیں اپنی پسند کے افراد کو نامزد کرنے کا موقع ملا ہے تو ہمیں ایک پارسی کو فہرست میں ضرور شامل کرنا چاہیے۔ دو دن کی بحث کے بعد بالآخر میری بات مان لی گئی۔

میں نے ایک ہندوستانی عیسائی کو بھی فہرست میں شامل کرنے پر اصرار کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس جماعت کا کوئی نمائندہ کسی اور ذریعے سے کونسل میں نہیں آ سکتا۔ سکھوں اور شیڈول کاسٹ کے لوگوں کی نمائندگی بہرحال ہو جائے گی لیکن جب تک کانگریس اس کی سرپرستی نہ کرے، کوئی ہندوستانی عیسائی حکومت میں جگہ نہیں پا سکے گا۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ ہندوستانی عیسائیوں نے ہمیشہ کانگریس کی حمایت کی ہے اور انہوں نے تمام سیاسی مسئلوں میں قومی نقطہ نظر اختیار کیا ہے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس نے جو فہرست پیش کی اس میں صرف دو ہندوؤں کے نام شامل تھے۔ اس سے ثابت ہو گیا، اگر کسی ثبوت کی ضرورت تھی کہ کانگریس ہندو تنظیم نہیں ہے۔ کہا جا سکتا تھا کہ ہندو، جن کی ہندوستان میں اکثریت تھی، اس تجویز پر اعتراض کریں گے لیکن ہندوؤں نے قابل تعریف رویہ اختیار کرتے ہوئے استقلال کے ساتھ کانگریس کی تائید کی اور اس وقت بھی ان کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا جب انہوں نے دیکھا کہ کانگریس کی پانچ افراد کی فہرست میں تین افراد مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ہندو مہاسبھا نے کانگریس کے اس فیصلے سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن سب جانتے ہیں کہ مہاسبھا کو اس مقصد میں کس قدر بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ قدرت کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ مہاسبھا کی طرح مسلم لیگ نے بھی کانگریس کی طرف سے ایک مسلمان کا نام فہرست میں شامل کرنے پر اعتراض کیا۔

دس برس کے بعد جب میں ان واقعات پر دوبارہ نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اس عجیب صورت حال پر حیرت

ہوتی ہے جو مسلم لیگ کے رویے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ لارڈ ویول نے خود جو فہرست تیار کی اس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے پانچ پانچ ناموں کے علاوہ چار اور نام بھی شامل تھے۔ ایک نام سکھوں کے نمائندے کا، دو شیڈول کاسٹ کے نمائندوں کا اور چوتھا نام پنجاب کے اس وقت کے وزیراعظم خضر حیات خان کا تھا۔ مسٹر جناح نے دو ایسے مسلمانوں کو ایگزیکٹو کونسل میں شامل کرنے کی تجویز پر شدید ردعمل ظاہر کیا جو ان کے نامزد کردہ نہیں تھے۔ خضر حیات خان مجھ سے ملنے آئے اور میں نے انہیں یقین دلایا کہ کانگریس کو ان کی شمولیت پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں نے لارڈ ویول کو بھی یہی کہا۔ اس طرح اگر مسٹر جناح کی مخالفت کی بنا پر کانفرنس ناکام نہ ہوتی تو اس کا یہ نتیجہ ہوتا کہ مسلمانوں کو، جو ہندوستان کی کل آبادی کا صرف ۲۵ فی صد تھے، کونسل کی چودہ میں سے سات نشستیں مل جاتیں۔ یہ کانگریس کی فیاضی کا واضح ثبوت ہے اور اس سے مسلم لیگ کی حماقت پر ایسی روشنی پڑتی ہے جس میں وہ خاصی بھیانک معلوم ہوتی ہے۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کے مفادات کا محافظ سمجھا جاتا تھا مگر اسی کی مخالفت کے باعث ہندوستان کے مسلمان غیر تقسیم شدہ ہندوستان کی حکومت میں ایک معقول حصہ حاصل کرنے سے محروم ہو گئے۔

کانفرنس ختم ہونے پر میں نے اخباری نمائندوں سے ملاقات کی اور یہ وضاحت کی کہ کانگریس کو شملہ کانفرنس میں شرکت کرنے میں کیا دشواریاں پیش آئیں۔ ہمارے سامنے تجویزیں اچانک پیش کی گئیں۔ ۱۵ جون کو میرے ساتھی اور میں سب رہا کیے گئے اور ہمیں وائسرائے کی دعوت کے بارے میں فوراً فیصلہ کرنا پڑا۔ ہمیں اچانک ایک نئی دنیا میں پھینک دیا گیا لیکن ورکنگ کمیٹی نے مشکلات کے باوجود کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ بین الاقوامی سطح پر بڑی تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں اور بلاشبہ ہندوستان کے مسئلے پر بھی ان تبدیلیوں کے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ان تبدیلیوں کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان اور دوسری ایشیائی قوموں کی آزادی کا مسئلہ نظروں کے سامنے آ گیا۔

میں نے نامہ نگاروں کو بتایا کہ وائسرائے سے مختلف ملاقاتوں کے دوران میں کانگریس کی قومی حیثیت پر زور دیتا رہا ہوں۔ میں نے وائسرائے پر یہ بھی واضح کر دیا کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی موجودہ سیاسی تعطل کو دور کرنے کی ہر معقول کوشش میں تعاون کی خواہاں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ مشکل حالات کے باوجود کانفرنس میں شرکت کے لیے شملہ آئی ہے۔ ورکنگ کمیٹی جو بھی فیصلہ کرے گی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی طرف سے اس کی تصدیق اور توثیق لازمی ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کے بارے میں اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اگر شملہ کانفرنس کامیاب ہو جاتی تو جاپان کے خلاف جنگ، جاپان کے خلاف برطانیہ کی جنگ نہ رہتی بلکہ جاپان

کے خلاف ہندوستان کی جنگ بن جاتی۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کی آزادی کے سوال پر ہرگز دورائیں قائم نہیں کی جا سکتیں۔ ہندوستان کی نئی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ان تمام ملکوں کی آزادی تک جاپان کے خلاف جنگ جاری رکھے البتہ ہندوستان کی نئی حکومت ایسے کسی منصوبے میں فریق نہیں بن سکتی جس کا مقصد ان ملکوں پر سابق یورپی حکمرانوں کا تسلط برقرار رکھنا ہے۔ ہم جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں حالات کو جوں کا توں رکھنے کے لیے ایک بھی ہندوستانی فوجی بھیجنے یا ایک بھی پائی خرچ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔

میں نے اخبار نویسوں کو یہ بھی بتایا کہ اقتدار کی ہندوستانی ہاتھوں میں منتقلی کا بنیادی مسئلہ طے ہونے کے بعد کانفرنس نئی ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کی تعداد اور ترکیب پر غور کرے گی۔ مختلف پارٹیوں کو اس معاملے پر اتفاق رائے کے لیے نجی اور غیر رسمی صلاح مشورے کا موقع دینے کی غرض سے کانفرنس کو ملتوی کر دیا گیا۔

یہاں میں اپنے اس بیان کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں جو میں نے اس وقت جاری کیا تھا:

> ان گفتگوؤں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ان غیر رسمی مذاکرات کے دوران مسٹر جناح نے یہ موقف اختیار کیا کہ نئی ایگزیکٹو کونسل کے مسلمان ارکان کو مسلم لیگ نامزد کرے گی۔ کانگریس نے محسوس کیا کہ اس اصول کو تسلیم کر لینا اس کی بنیادی قومی حیثیت کے خلاف ہے۔ یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، یہ نشستوں کا سوال نہیں تھا بلکہ اس سے ہمارے بنیادی اصول پر زد پڑتی تھی۔ ہم مسلم لیگ کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کو تیار تھے لیکن مسٹر جناح نے ایسا رویہ اختیار کیا کہ مفاہمت کی کوئی گنجائش نہ رہی۔
>
> ☆ وائسرائے نے مختلف گروپوں سے کہا کہ ناموں کی فہرستیں انہیں پیش کریں تاکہ ہز ایکسی لینسی پارٹی لیڈروں کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد ایگزیکٹو کونسل کے لیے ارکان کا انتخاب کر سکیں۔ مسٹر جناح نے نام پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے ہز ایکسی لینسی کے ساتھ ۱۲ جولائی کو ملاقات کی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ جہاں تک مسلمانوں کی نشستوں کا تعلق ہے، انہوں نے ایک فہرست تیار کرنے اور مسٹر جناح کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وائسرائے نے مزید بتایا کہ انہوں نے پوری کوشش کی لیکن وہ مسٹر جناح کو قائل نہ کر سکے۔ مسٹر جناح اصرار کرتے رہے کہ صرف مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی ان ارکان کو نامزد کرے گی۔ وائسرائے نے اس سے اتفاق نہ کیا اور انہیں محسوس ہوا کہ فی الحال اس تجویز پر مزید گفتگو کرنا بے سود ہوگا ☆
>
> موجودہ صورت حال سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ کانفرنس مسلم لیگ کے رویے کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ دوسرا نکتہ جو مسلم لیگ کے انکار کی وجہ سے پیدا ہوا یہ ہے کہ اب لارڈ ویول کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ آگے بڑھیں گے یا نہیں؟ ہز ایکسی لینسی نے فی الحال یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس سلسلے میں میں ایک بات دہراؤں گا جو میں نے کانفرنس میں کی تھی۔ برطانوی حکومت اپنے آپ کو فرقہ وارانہ مسئلے سے بری الذمہ نہیں کر سکتی، چاہے آج ہو یا کل، ایک نہ ایک دن اسے عدل و انصاف پر مبنی فیصلہ کر کے اس پر قائم رہنا ہوگا۔ اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے۔ ایک مرتبہ فیصلہ کر لیا جائے تو پھر ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ جو لوگ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہیں، انہیں اس کا موقع ملنا چاہیے اور جو چاہتے ہیں کہ انہیں الگ چھوڑ دیا جائے، انہیں چھوڑ

دینا چاہیے۔ پختہ عزم اور استقلال کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ نیت ڈانواں ڈول ہو اور قدم لڑکھڑا رہے ہوں تو ہم ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ پائیں گے۔ قدم اٹھانے سے پہلے ہمیں ضرور سوچنا چاہیے لیکن ایک مرتبہ فیصلہ ہو گیا تو اس کے بعد تامل اور ہچکچاہٹ قطعی کمزوری کی علامت ہو گی۔

میں نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ کانگریس نے شملہ کانفرنس میں جو موقف اختیار کیا، مجھے اس پر بالکل افسوس نہیں ہے۔

ہم نے جس حد تک ممکن تھا، مسٹر جناح کی خواہشوں کا لحاظ کیا لیکن ہم ان کے اس دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتے تھے کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور با اختیار جماعت ہے۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، وہاں لیگ کی وزارت نہیں تھی۔ صوبہ سرحد میں کانگریس اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت تھی۔ سندھ میں سر غلام حسین کی حکومت کا دارومدار کانگریس کی حمایت پر تھا اور آسام میں بھی یہی حال تھا اس لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کا لیگ کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں تھا۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے ایک نتیجے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اس تحریک کے دوران بعض نئی شخصیتیں ہندوستان کے منظر پر نمودار ہوئیں جنہیں نئے حالات کے تقاضوں نے ابھارا تھا۔ ان میں سے ایک مسز آصف علی تھیں۔ میں بتا چکا ہوں کہ ۹ اگست ۱۹۴۲ کی صبح کو انہوں نے بمبئی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر مجھ سے کہا تھا کہ وہ بیکار نہیں بیٹھیں گی۔ ہماری گرفتاری کے بعد انہوں نے پورے ملک کا دورہ کیا اور برطانیہ کی جنگی سرگرمیوں کی مخالفت کے لیے وہ لوگوں کو منظم کرتی رہیں۔ انہوں نے تشدد اور عدم تشدد کے فرق کا خیال نہ کیا بلکہ ہر وہ طریقہ اختیار کیا جو کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد حکومت نے ان کی سرگرمیوں کا نوٹس لینا شروع کر دیا اور انہیں گرفتار کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن وہ روپوش ہو گئیں اور گرفتاری سے بچتی رہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے ہندوستانیوں نے ان کی مدد کی۔ ان میں بعض سرکاری افسر اور صنعت کار بھی شامل تھے جنہیں عام طور پر حکومت کا وفادار حامی سمجھا جاتا تھا۔ بمبئی اور کلکتے کے کئی تاجروں نے بھی ان کی امداد کی بلکہ وہ انڈین سول سروس اور ہندوستانی فوج کے افسروں کے گھروں میں بھی ٹھہری رہیں۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق فنڈز اکٹھے کر لیتیں۔ غرض ہماری نظر بندی کے دوران وہ پوری طرح فعال اور سرگرم رہیں۔

۱۹۴۵ میں جب میں رہا ہوا تو وہ چھپ کر مجھ سے ملنے آئیں۔ میں نے لارڈ ویول کے ساتھ ان کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ ان کی گزشتہ سرگرمیوں کی بنا پر انہیں گرفتار نہیں کریں گے لیکن مستقبل کا کیا ہو گا؟ میں نے لارڈ ویول کو بتایا کہ اب سیاسی صورت حال بدل گئی ہے اور ان کی طرف سے تخریبی سرگرمیاں جاری

رکھنے کا بہت کم امکان ہے۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ انہیں گرفتار نہیں کیا جائے گا تو میں نے مسز آصف علی سے کہہ دیا کہ اب انہیں روپوش رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ ۱۹۴۵ کے آخری حصے میں انہوں نے پبلک میں آنا شروع کر دیا۔

ان کی سرگرمیاں اتنی مشہور ہو گئی تھیں کہ وائسرائے نے ایک تقریر میں ان کی مثال پیش کرتے ہوئے عدم تشدد کے مسئلے پر کانگریس کے خلوص نیت پر شبہ ظاہر کیا۔ انہوں نے کہا کہ جب ورکنگ کمیٹی کے ایک ممبر کی بیوی تشدد آمیز سرگرمیوں میں مصروف ہو تو حکومت کانگریس کے عدم تشدد کے اعلان پر کس طرح اعتبار کر سکتی ہے؟ جب قلعہ احمد نگر کی جیل میں ہمیں یہ باتیں معلوم ہوئیں تو مجھے پتا چلا کہ آصف علی اس صورت حال سے خاصے فکر مند ہیں۔ انہیں اپنی گرفتاری کی پروا نہیں تھی لیکن وہ ان خطروں کے خیال سے پریشان تھے جن میں ان کی بیوی گھری ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ فکر مند ہونے کے بجائے انہیں اس پر فخر کرنا چاہیے کہ ان کی بیگم ایک اعلیٰ نصب العین کے لیے اس قدر ہمت اور استقلال سے پیش قدمی کر رہی ہیں۔

عام انتخابات

شملہ کانفرنس کے بعد ڈاکٹروں نے بہت اصرار سے مجھے تبدیلی آب و ہوا کے لیے کشمیر جانے کا مشورہ دیا۔ میری صحت اب بھی کمزور تھی اور میں کانگریس کے صدر کی حیثیت سے معمول کے فرائض بھی بڑی مشکل سے انجام دے پاتا تھا۔ جواہر لعل کو بھی تبدیلی آب و ہوا کی ضرورت تھی اور انہوں نے بھی کشمیر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے جولائی اور اگست کے مہینے گلمرگ میں گزارے۔ میں یہیں تھا کہ مجھے برطانیہ کے عام انتخابات میں لیبر پارٹی کی غیر معمولی کامیابی کی خبر ملی۔ میں نے فوراً ایٹلی اور کرپس کو مبارکباد کے ٹیلی گرام بھیجے اور یہ امید ظاہر کی کہ برسر اقتدار آنے کے بعد لیبر پارٹی ان وعدوں کو پورا کرے گی جو وہ اپوزیشن میں رہ کر ہندوستان کے ساتھ اس زمانے میں کرتی رہی ہے۔ ایٹلی نے اپنے جواب میں لکھا کہ لیبر پارٹی ہندوستان کے مسئلے کا صحیح حل نکالنے کی پوری کوشش کرے گی۔ کرپس نے اپنے برقیے میں لکھا کہ انہیں امید ہے کہ ہندوستان کو مایوسی نہیں ہو گی۔ یہاں مجھے یہ بات کہہ دینی چاہیے کہ گاندھی جی اور جواہر لعل نے میری اس خط و کتابت کو پسند نہ کیا۔ وہ ہندوستان کے بارے میں لیبر پارٹی کے رویے کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھتے تھے البتہ مجھے پورا یقین تھا کہ لیبر پارٹی ہندوستان کے مسئلے پر ایک نئے زاویے سے غور کرے گی اور اس کا نتیجہ اچھا ہو گا۔

تھوڑے دنوں کے بعد وائسرائے نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان میں اسی سال موسم سرما میں عام انتخابات ہوں گے۔ اس اعلان کے بعد ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بلانا ضروری ہو گیا۔ کانگریس کے لیے یہ ضروری تھا کہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد اپنا لائحہ عمل طے کرے۔ بعض لوگ ایک نئی تحریک شروع کرنا چاہتے تھے جبکہ بعضوں کا خیال تھا کہ اگر تحریک شروع نہیں کی جاتی تو کانگریس کو انتخابات کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ میری رائے یہ تھی کہ ان دونوں میں سے کسی طریقے کو اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اگر شملہ کانفرنس ناکام ہوئی تو اس میں برطانیہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کانفرنس کی ناکامی کا سبب فرقہ وارانہ تھا نہ کہ سیاسی۔

میں ابھی گلمرگ میں ہی تھا کہ ایک ایسا نیا واقعہ پیش آیا جس کی دنیا کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ امریکا نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے شہروں پر ایٹم بم گرا دیے۔ ایٹم بم گرانے سے پہلے عام طور پر یہ اندازہ تھا کہ جاپانیوں کا زور توڑنے میں کم سے کم دو سال لگیں گے لیکن ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔ جاپانیوں کے پاس تباہ کاری کے اس نئے اور ہیبت ناک ہتھیار کا کوئی جواب نہیں تھا چنانچہ وہ

غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ یورپ میں جنگ پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ چند ہفتوں کے اندر امریکی فوج جاپان کی سرزمین پر اتر گئی، ٹوکیو پر قبضہ ہو گیا اور جنرل میک آرتھر عملاً جاپان کے حکمران بن گئے۔

مجھے اب بھی یقین ہے کہ جاپان پر ایٹم بم گرانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا ہتھیار تھا جس سے دشمن کا مورال مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ دراصل ایٹم بم نے پوری دنیا کی بقا کو خطرے میں ڈال دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں جب جرمنوں نے برطانیہ کے خلاف زہریلی گیس استعمال کی تو عالمی رائے عامہ نے ان کی کھل کر مذمت کی تھی۔ اگر اس وقت جرمنی نے انسانیت کے خلاف ارتکاب جرم کیا تھا تو اس وقت امریکا کو کس طرح بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ میرا خیال تھا کہ ایٹم بموں کا استعمال قابل معافی ضرر رسانی حدود سے تجاوز کرتا ہے اور اس سے اتحادیوں کے وقار یا بہادری کی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی افسوس ہوا کہ اتحادیوں نے اس واقعے کو شاندار فتح قرار دے کر اس کی تعریف کی اور احتجاج کے طور پر کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

میری صحت اب بھی کمزور تھی۔ جولائی اور اگست کشمیر جانے کے لیے موزوں مہینے نہیں اور مجھے وہاں قیام سے کچھ فائدہ نہ ہوا البتہ ستمبر میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوئی اور میری صحت تیزی کے ساتھ بحال ہونے لگی، میری خوراک بڑھ گئی اور میں ورزش کرنے کے قابل ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں کشمیر میں مزید ایک ماہ ٹھہر جاتا تو میری صحت مکمل طور پر بحال ہو جاتی لیکن حالات کا تقاضا تھا کہ مجھے کشمیر چھوڑ دینا چاہیے۔ ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں میری موجودگی ضروری تھی۔ جب میں میدانی علاقے میں آ گیا تو میری صحت میں رونما ہونے والی عارضی بہتری پھر غائب ہو گئی۔

ان مہینوں میں امریکا کے فوجی افسر آرام اور تفریح کی غرض سے بڑی تعداد میں کشمیر جایا کرتے اور ہر دو ہفتوں کے بعد ہوائی جہاز افسروں کی ایک نئی ٹولی کو لے کر سری نگر پہنچ جاتا۔ ان میں سے بعض افسر مجھ سے ملنے میرے گھر پر آئے۔ جب انہوں نے یہ سنا کہ مجھے واپس دہلی جانا پڑا ہے تو انہوں نے مجھے امریکی کمانڈر کے خصوصی طیارے کے ذریعے واپس بھیجنے کی پیشکش کی۔ میں ۱۰ ستمبر کو ان کے ہوائی جہاز سے دہلی پہنچا اور وہاں سے پونا روانہ ہو گیا۔ ۱۴ ستمبر کو پونا میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اور پھر اس کا مقام تبدیل کر کے بمبئی مقرر کر دیا گیا۔ ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں کے اجلاسوں میں اس معاملے پر گرما گرم بحث ہوئی کہ اب ہماری پالیسی کا رخ کیا ہونا چاہیے۔ اکثریت کا، جس میں گاندھی جی بھی شامل تھے، یہ خیال تھا کہ ہمیں اپنے آپ کو خالصتاً تعمیری کاموں کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ انہیں یقین تھا کہ سیاسی میدان میں کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں ہے۔

میرا استدلال یہ تھا کہ لیبر حکومت کے قیام سے برطانیہ میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ لیبر پارٹی

کا ہندوستان کے ساتھ ہمیشہ دوستانہ برتاؤ رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے مناسب ہوگا کہ ہم اسے خلوص کو ثابت کرنے کا موقع دیں۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ ہمیں کوئی نئی تحریک شروع نہیں کرنی چاہیے بلکہ عام انتخابات میں حصہ لینا چاہیے۔ میں نے اس جانب بھی اشارہ کیا کہ شملہ کانفرنس ہندوستان کے مسئلے کو طے کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش تھی اور اگرچہ وہ کامیاب نہیں ہوئی لیکن ہمیں لارڈ ویول کے جذبے کی قدر کرنی چاہیے۔ اب جو لیبر پارٹی برسراقتدار آ گئی ہے تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ طویل بحث مباحثے کے بعد بالآخر میری رائے مان لی گئی۔

اب میں نے ضروری سمجھا کہ سیاسی قیدیوں کا مسئلہ اٹھایا جائے۔ ہندوستان کی حکومت نے ورکنگ کمیٹی کے ارکان کو رہا کر دیا تھا لیکن کانگریس کے ہزاروں عام کارکن اب بھی جیلوں میں بند تھے۔ شملہ کانفرنس کے موقعے پر مجھے صحیح اندازہ نہیں تھا کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا اس لیے میں نے کانفرنس میں تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی کا سوال نہ اٹھایا۔

کانفرنس کے بعد دو واقعات نے پورے منظر کو یکسر تبدیل کر دیا۔ پہلا واقعہ برطانیہ میں لیبر پارٹی کی مکمل فتح اور دوسرا ایٹم بم گرانا اور جنگ کا خاتمہ۔ اب قومی اور بین الاقوامی سیاسی صورت حال بہت زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں اپنی پالیسی میں خاص طور پر دو باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہمیں ایک طرف ہندوستانی قوم میں جدوجہد کی روح کو زندہ رکھنا اور دوسری طرف ہر قسم کے اندھا دھند اقدامات سے گریز کرنا چاہیے۔ حالات نے جو رخ اختیار کیا وہ میرے اندازے کے عین مطابق تھا۔ جنگ ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد لارڈ ویول نے ہندوستان میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ جیسے ہی مجھے اس اعلان کی خبر ملی، میں نے محسوس کیا کہ اب سیاسی قیدیوں کی رہائی کا سوال اٹھانے کا وقت آ گیا ہے۔ اب جبکہ عام انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا تو ان لوگوں کو جیل میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں نے گلمرگ سے لارڈ ویول کو لکھا کہ میں نے شملہ میں سیاسی قیدیوں کے مسئلے کو اس لیے نہیں اٹھایا تھا کیونکہ یہ مناسب موقع نہیں تھا۔ اب صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی ہے۔ جنگ ختم ہو چکی ہے اور عام انتخابات کا اعلان ہو چکا ہے اس لیے عام معافی کا اعلان کر دینا چاہیے۔ یہ اقدام ہندوستانی قوم اور حکومت دونوں کے مفاد میں ہے۔ جہاں تک خود قیدیوں کا تعلق ہے، وہ برسوں جیل میں رہ چکے ہیں اور وہ مزید چند ماہ کی قید کاٹنے کے لیے تیار ہیں۔ مسلسل نظر بندی سے انہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا البتہ اس سے سمجھوتے کے امکانات یقیناً کم ہو جائیں گے۔ اگر حکومت ایک نئی سیاسی فضا پیدا کرنا چاہتی ہے تو اسے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دینا چاہیے۔

لارڈ ویول نے ٹیلی گرام کے ذریعے میرے خط کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں میری رائے سے

اتفاق ہے اور یہ کہ وہ تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی کے احکام جاری کر رہے ہیں تاہم انہوں نے عام معافی کا حکم جاری نہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریسی قیدیوں کی اکثریت کو تو چھوڑ دیا گیا لیکن کانگریس کے بائیں بازو کا ایک مختصر گروپ بدستور نظر بند رہا۔ ان میں جے پرکاش نرائن، رامانند مشرا اور کئی دوسرے لوگ شامل تھے۔

میں اپنی اس مداخلت کے نتیجے سے مطمئن نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ جب باقی سب لوگوں کو رہا کر دیا گیا ہے تو بائیں بازو کے ایک مختصر گروہ کو کیوں نظر بند رکھا گیا ہے؟ ہندوستان کی حکومت ان کو شک وشبے کی نظر سے دیکھتی تھی لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ ان کا طرز عمل ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں حصہ لینے والے دوسرے کانگریسی کارکنوں سے مختلف تھا۔ ستمبر میں بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ختم ہوا تو میں نے لارڈ ویول کو ایک طویل خط لکھا۔ میں نے کہا کہ اگر ان مٹھی بھر سیاسی قیدیوں کو رہا نہ کیا گیا تو اس کا ملک پر برا اثر پڑے گا۔ اگر لارڈ ویول ملک میں مناسب فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں عام معافی کا اعلان کر کے ان قیدیوں کو رہا کر دینا چاہیے۔ آخر لارڈ ویول مان گئے اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ورکنگ کمیٹی انتخابی منشور تیار کرے گی اور بعد میں اس پر غور اور توثیق کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ ورکنگ کمیٹی کو سینٹرل الیکشن کمیٹی کی جانب سے ایک ابتدائی منشور تیار کرنے کا بھی اختیار دے دیا گیا۔ چونکہ الیکشن قریب آ گئے تھے اس لیے مکمل منشور پر غور کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بلانا ممکن نہیں تھا چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے درج ذیل منشور اپنی ذمے داری پر جاری کر دیا۔

انتخابی منشور

☆ نیشنل کانگریس پچھلے ساٹھ برسوں سے ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ اس طویل مدت میں اس کی تاریخ اس ہندوستانی قوم کی تاریخ بن گئی ہے جو اپنی قید کی زنجیروں سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے ان زنجیروں سے رہائی کے لیے مسلسل کوشاں ہے۔ ابتدا میں یہ ایک چھوٹی سی جماعت تھی مگر وہ بتدریج بڑھتی اور اس وسیع وعریض ملک میں پھیلتی رہی اور شہروں اور دور افتادہ دیہات میں ہندوستانی عوام کو آزادی کا پیغام سناتی رہی ہے۔ اس نے اپنے عوام سے طاقت اور استحکام حاصل کیا ہے اور بڑھتے بڑھتے ایک زبردست جماعت بن گئی ہے جو ہندوستان کے اس عزم کی جیتی جاگتی اور پرجوش علامت ہے کہ وہ آزادی اور خودمختاری حاصل کرے گا۔ اس نے پشت در پشت اپنے آپ کو اس مقدس نصب العین کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ اس کے نام اور پرچم تلے ان گنت مردوں اور عورتوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے کے لیے اپنی جانیں قربان کی ہیں اور بے پناہ مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ اس جماعت نے خدمت اور قربانی کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی قوم کے دل میں گھر کر لیا ہے اور اس کے اس عزم نے کہ اپنی قوم کی تذلیل گوارا نہیں کی جائے گی، غیروں کی حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک طاقتور تحریک پیدا کر دی ہے۔

☆ کانگریس کی تاریخ میں عوام کی بہبود کے لیے تعمیراتی کام اور آزادی حاصل کرنے کی غرض سے جہد مسلسل دونوں شامل ہیں۔ اس جدوجہد میں اسے کئی بحرانوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس نے ایک عظیم سلطنت کی فوجی قوت سے بار بار ٹکر لی ہے۔ اس نے پرامن طریقوں سے کام لیا اس لیے وہ ان مقابلوں میں صرف سلامت ہی نہیں رہی بلکہ اسے ان سے ایک نئی قوت حاصل ہوئی ہے۔ پچھلے تین برسوں کے بے مثال عوامی انقلاب اور اسے دبانے کی ظالمانہ اور بے رحم کوششوں کے بعد کانگریس پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت کے ساتھ ابھری ہے اور ہماری قوم، جس کا اس نے طوفانوں اور مصیبتوں میں ہمیشہ ساتھ دیا ہے، اب اس سے بہت زیادہ محبت رکھتی ہے۔

☆ کانگریس ہندوستان کے ہر شہری، مرد یا عورت کو مساوی حقوق اور ترقی کے یکساں مواقع فراہم کرنا چاہتی ہے۔ وہ مختلف طبقوں اور مذہبی گروہوں کے درمیان اتحاد اور رواداری کو فروغ دینے اور ان کے درمیان جذبہ خیر سگالی پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ قوم کو اپنی خواہش اور استعداد کے مطابق آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا پورا موقع ملے۔ اس کی یہ بھی خواہش ہے کہ قوم اور ملک کے ہر گروپ اور ہر علاقے کو اس وسیع ڈھانچے کے اندر اپنی زندگی اور اپنی تہذیب اور ثقافت کو فروغ دینے کی آزادی ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ چاہتی ہے کہ ان علاقوں یا صوبوں کی حد بندی، جہاں تک ممکن ہو سکے، لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر کی جائے۔ کانگریس یہ بھی چاہتی ہے کہ ان تمام لوگوں کو ان کے حقوق دلائے جائیں جو سماجی ظلم اور بے انصافی برداشت کرتے رہے ہیں اور ان تمام رکاوٹوں کو دور کیا جائے جن کی بدولت انہیں مساوی حقوق نہیں مل سکے۔

☆ کانگریس ایک ایسی آزاد جمہوری ریاست قائم کرنے کی خواہاں ہے جس کے دستور میں تمام شہری آزادیوں کی ضمانت دی گئی ہو۔ اس کی رائے میں اس کا آئین وفاقی ہونا چاہیے جس میں وفاق کے یونٹوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو اور جس کے قانون ساز ادارے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیے جائیں۔

☆ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کے بدیسی راج نے ملک کی نشو ونما کو روک دیا ہے اور ایسے کئی اہم مسئلے پیدا کر دیے ہیں جنہیں فوراً حل کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس پورے عرصے میں ملک اور قوم کا اس قدر بیدردی کے ساتھ استحصال کیا گیا ہے کہ عوام معاشی بدحالی اور فاقہ کشی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ ملک کو نہ صرف سیاسی اعتبار سے محکوم رکھا گیا ہے اور اس کی تذلیل کی گئی ہے بلکہ وہ معاشی، سماجی، تہذیبی اور روحانی اعتبار سے بھی بہت پیچھے چلا گیا ہے۔ جنگ کے زمانے میں بلکہ اب بھی غیر ذمے دار حکومت کی طرف سے استحصال اور ہندوستان کے مفادات اور رائے کو نظر انداز کرنے کا عمل پورے نقطہ عروج پر ہے اور انتظامی نااہلی کا نتیجہ ہولناک قحط اور عوام کی معاشی بدحالی کی صورت میں نظر آ رہا ہے۔ آزادی اور خود مختاری کے سوا ان مسئلوں کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک سیاسی آزادی کا ماحصل اقتصادی بھی ہونا چاہیے اور سماجی بھی۔

☆ غربت اور افلاس کی بلا کو دور کرنا اور عوام کے معیار زندگی کو بہتر بنانا ہندوستان کے مسائل میں سب سے اہم اور فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ عوام کی بہبود اور ترقی کانگریس کی خصوصی توجہ اور تعمیری سرگرمیوں کا ہمیشہ سے مطمح نظر رہا ہے۔ اس نے ہر تجویز اور ہر تبدیلی کو اس معیار سے جانچا ہے کہ عوام کی بہبود اور ترقی پر اس کا کیا اثر

ہوگا اور وہ علانیہ کہتی رہی ہے کہ ہمارے عوام کی بہبود میں جو رکاوٹیں حائل ہیں انہیں دور کر دینا چاہیے۔ صنعت اور زراعت، سماجی خدمات اور رفاہ عام کے محکموں اور اداروں کو ترقی دینا چاہیے اور ان کے طریق کار کو جدید خطوط پر استوار کرنا اور کام کو تیزی کے ساتھ پھیلانا چاہیے تاکہ ہمارے ملک کی دولت میں اضافہ ہو اور اس میں دوسروں پر بھروسا کیے بغیر اپنی کوشش سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہو۔ مگر جو کچھ کیا جائے اس کا بنیادی مقصد اور سب سے اعلیٰ فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے عوام کو فائدہ پہنچے، ان کی زندگی کی معاشی، تہذیبی اور روحانی سطح بلند ہو، ان میں بیروزگاری کا خاتمہ ہو اور فرد کی عزت اور وقار میں اضافہ ہو۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں جماعتی ترقی کی غرض سے پہلے سے منصوبہ بندی کریں اور اس کے مختلف پہلوؤں کو مربوط کریں، دولت اور اقتدار کو چند افراد اور گروہوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہونے سے روکیں، مفاد پرست عناصر کو آگے نہ بڑھنے دیں اور معدنی وسیلوں، ذرائع آمد و رفت اور زمین، صنعت اور قومی سرگرمیوں کے دوسرے شعبوں پر جماعت کا اختیار رکھیں تاکہ آزاد ہندوستان ایک کواپریٹو کامن ویلتھ بن جائے۔

☆ بین الاقوامی امور کے بارے میں کانگریس کا موقف یہ ہے کہ دنیا کی تمام آزاد قوموں کی ایک عالمی فیڈریشن قائم ہونی چاہیے۔ جب تک یہ فیڈریشن قائم نہیں ہوتی، ہندوستان کو دنیا کی تمام قوموں خاص طور پر مشرق، مغرب اور شمال میں اپنے پڑوسی ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے چاہئیں۔ مشرق بعید، جنوب مشرقی ایشیا اور مغربی ایشیا کے ملکوں کے ساتھ ہزاروں برسوں سے ہندوستان کے تجارتی اور ثقافتی تعلقات قائم ہیں۔ آزادی ملنے کے بعد ان تعلقات کی تجدید اور فروغ ناگزیر ہے۔ سلامتی کی وجوہ اور جدید تجارتی رجحانات کا بھی یہ تقاضا ہے کہ ان علاقوں کے ساتھ قریبی روابط برقرار رکھے جائیں۔ ہندوستان، جس نے عدم تشدد کی بنیاد پر آزادی کی تحریک خود چلائی ہے، اپنے وزن کو ہمیشہ عالمی امن اور باہمی تعاون کا پلہ بھاری کرنے کے لیے استعمال کرے گا۔ ہندوستان دنیا کی تمام محکوم قوموں اور عوام کی آزادی کا علمبردار ہوگا کیونکہ صرف آزادی اور سامراجیت کے ہر جگہ سے اخراج کی بنیاد پر ہی دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔

☆ ۸ اگست ۱۹۴۲ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی تھی جسے ہندوستان کی تاریخ میں بے پناہ شہرہ حاصل ہوا ہے۔ کانگریس اس مشہور زمانہ قرارداد میں پیش کیے جانے والے مطالبات اور چیلنج پر اب بھی قائم ہے اور اسی قرارداد کی بنیاد اور اس کے نعرۂ جنگ کے ساتھ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے موقع پر میدان میں اتری ہے۔

☆ سینٹرل لیجسلیٹو اسمبلی ایک ایسا ادارہ ہے جس کے پاس کوئی اختیار یا اتھارٹی نہیں ہے۔ وہ عملاً ایک مشاورتی ادارہ ہے جس کے مشوروں کا ہمیشہ مذاق اڑایا گیا ہے اور انہیں بری طرح نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ ایک فرسودہ ادارہ ہے اور اس کا حلقہ انتخاب نہایت محدود ہے۔ اس کے رائے دہندگان کی فہرستیں غلطیوں اور فروگذاشتوں سے بھری پڑی ہیں اور ان میں اضافے اور تصحیح کا کوئی انتظام موجود نہیں ہے۔ ہمارے بہت سے ہم وطن اب بھی جیلوں میں ہیں اور جن لوگوں کو رہا کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر کو الیکشن میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا ہے۔ بہت سی جگہوں پر پبلک جلسے کرنے میں اب بھی رکاوٹیں حائل ہیں۔ ان تمام بندشوں اور دشواریوں کے

باوجود کانگریس نے محض یہ ثابت کرنے کے لیے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے کہ انتخابات چاہے جس قدر محدود ہوں، آزادی کے سوال پر رائے دہندگان پوری طرح یک جان اور متحد ہیں لہٰذا اس الیکشن میں چھوٹے موٹے مسائل، افراد اور فرقہ وارانہ نعروں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ صرف ایک بات کو مدنظر رکھا جائے گا اور وہ ہے مادر وطن کی آزادی اور خود مختاری جس کی بدولت ہماری قوم کو دوسری ہر قسم کی آزادی نصیب ہوگی۔

☆ لہٰذا کانگریس مرکزی اسمبلی کے لیے ووٹ دینے والے ملک بھر کے رائے دہندگان سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اگلے عام انتخابات میں کانگریس کے امیدواروں کی ہر طرح سے امداد اور حمایت کریں اور اس نازک موقعے پر، جس میں مستقبل کے لیے ہر قسم کے امکانات ہیں، کانگریس کا ساتھ دیں۔ ہندوستان کے عوام نے کئی مرتبہ آزادی حاصل کرنے کا عہد کیا ہے۔ یہ عہد ابھی تشنۂ تکمیل ہے۔ وہ محبوب نصب العین جس کی یہ علامت ہے اور جس نے ہمیں اپنی طرف بلایا ہے اب بھی ہمیں پکار رہا ہے لیکن وقت آ رہا ہے جب ہم اپنے عہد کو پورا کریں گے، انتخابات کے ذریعے نہیں بلکہ اس کام کے ذریعے جو انتخابات کے بعد کیا جاتا ہے۔ یہ الیکشن ہمارے لیے ایک معمولی آزمائش ہے۔ یہ ہمیں ان بہت بڑی باتوں کے لیے تیار کرے گا جو مستقبل میں پیش آنے والی ہیں۔ آیئے ہم سب، جو ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کے آرزومند ہیں، اس آزمائش کا پوری قوت اور اعتماد کے ساتھ سامنا کریں اور اس آزاد ہندوستان کی طرف، جس کا ہم خواب دیکھ رہے ہیں، قدم ملا کر آگے بڑھیں۔

جیسا کہ عام توقع تھی، کانگریس کو بنگال، پنجاب اور سندھ کے سوا باقی تمام صوبوں میں بھاری اکثریت حاصل ہوگئی۔ ان تینوں صوبوں میں صورت حال بے حد پیچیدہ تھی۔ بنگال میں مسلم لیگ سب سے بڑی واحد پارٹی تھی اور اس نے تقریباً آدھی نشستیں حاصل کر لی تھیں، پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور لیگ کو تقریباً برابر نشستیں ملیں، سندھ میں بھی مسلم لیگ نے بڑی تعداد میں نشستیں حاصل کیں مگر اسے اکثریت حاصل نہ ہوسکی۔ ان تینوں صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور مسلم لیگ نے وہاں مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جذبات پیدا کرنے کے لیے پروپیگنڈا کیا تھا۔ اس طرح سیاسی مسائل پر ایسا پردہ پڑا کہ وہ مسلمان، جو کانگریس یا کسی اور پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے، لوگوں کو بڑی مشکل سے اپنی بات سننے پر آمادہ کر پاتے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، لیگ کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں اور وہاں کانگریس برسر اقتدار آگئی۔

اس مرحلے پر ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر دوبارہ ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔ جب دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو ہٹلر اور اسٹالن کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف عدم جارحیت کا معاہدہ ہوگیا جس کی وجہ سے کمیونسٹ مشکل میں پھنس گئے تھے۔ کمیونسٹ نازی سوویت معاہدے سے پہلے ہٹلر پر حملہ کرنے اور نازی فلسفۂ حیات کی مذمت کرنے میں پیش پیش تھے۔ ہندوستانی کمیونسٹ دل میں سمجھتے تھے کہ اسٹالن نے نازیوں کے ساتھ معاہدہ کر کے بہت بڑی حماقت کی ہے البتہ دنیا کے دوسرے علاقوں کے کمیونسٹوں کی طرح ان

کی بھی ہمت نہیں تھی کہ ایسا کہہ سکیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ موقف اختیار کر لیا کہ یہ معاہدہ ایک جنگ کو، جسے وہ سامراجیوں کی جنگ کہتے تھے، محدود رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ کیمونسٹ جو تقریباً بے بس ہو چکے تھے، یہ جواز پیش کرنے لگے کہ ہٹلر نسبتاً کم برائی ہے۔ اس موقف کی وجہ سے وہ برطانیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اس خیال کی پر زور حمایت کی کہ ہندوستان کو دونوں کیمپوں کے درمیان غیر جانبدار رہنا چاہیے۔ لیکن جب ہٹلر نے روس پر حملہ کر دیا تو کیمونسٹوں نے پوری قلابازی کھائی اور یہ اعلان کر دیا کہ یہ جنگ عوام کی جنگ ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے برطانیہ کی مکمل حمایت شروع کر دی۔ ہندوستان میں وہ جنگ کے پروپیگنڈے میں شریک ہو کر برطانیہ کی جنگی کوششوں میں کھلم کھلا مدد کرنے لگے۔ مسٹر ایم این رائے نے حکومت سے کھلے بندوں روپیہ لیا اور جنگ کی موافقت میں پروپیگنڈا کرتے رہے۔ کیمونسٹ حکومت سے مختلف طریقوں سے امداد حاصل کرتے رہے۔ کیمونسٹ پارٹی پر عائد پابندی ختم کر دی گئی اور پارٹی کے ارکان جنگ کا پروپیگنڈا کرنے لگے۔

دوسری طرف کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع کر رکھی تھی۔ کانگریسی بہت بڑی تعداد میں گرفتار ہو رہے تھے لیکن اس کے برعکس کیمونسٹ، جو اب تک زیر حراست یا چھپے رہتے تھے، اپنی پارٹی کے لیے علانیہ کام کر سکتے تھے۔ شملہ کانفرنس کے بعد بھی جب کانگریسی رہا کر دیے گئے تو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا لائحہ عمل اختیار کریں؟ وہ اس انتظار میں تھے کہ کانگریس کیا فیصلہ کر سکتی ہے۔

اس دوران تمام سرکاری محکموں میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو گئی۔ مسلح افواج نے جنگ کے زمانے میں مختلف صوبوں اور سماجی طبقوں کے نوجوانوں کی بھاری تعداد کو بھرتی کر لیا۔ جنگی ضروریات کے پیش نظر بھرتی کے اس پرانے انگریزی طریقے کو ترک کرنا پڑا جس کی رو سے آبادی کے صرف چند منتخب گروپوں کو فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا۔ مسلح افواج کے وہ نوجوان، جو اب فوج میں بھرتی ہوئے تھے، برطانیہ کے اس قول کو کہ جنگ کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائے گا، صحیح اور سچا مانتے تھے۔ اس یقین کی وجہ سے انہوں نے لڑائی کے زمانے میں بڑی جانفشانی سے کام کیا۔ اب جو لڑائی ختم ہو گئی تھی تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔

مسلح افواج کی تینوں شاخوں، بحری، بری اور فضائی افواج میں حب الوطنی کی ایک نئی روح پیدا ہو گئی تھی۔ دراصل ان میں اس قدر جوش موجود تھا کہ وہ جب بھی کانگریس کے کسی لیڈر کو دیکھتے تو ان کے جذبات قابو میں نہ رہتے۔ اس دوران میں جہاں بھی گیا، فوج کے جوان بغیر سوچتے ہوئے کہ ان کے یورپی افسروں پر کیا اثر ہو گا، میرا استقبال کرنے اور اپنی ہمدردی اور تحسین کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے آئے۔ جب میں کراچی گیا تو بحریہ کے افسروں کا ایک گروپ مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ انہوں نے کانگریس کی پالیسی کو سراہا اور

کہا کہ اگر کانگریس اور حکومت کے درمیان تصادم ہوا تو وہ حکومت کے بجائے کانگریس کا ساتھ دیں گے۔ بمبئی میں بھی بحریہ کے سیکڑوں افسروں نے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔

یہ جذبات صرف افسروں میں ہی نہیں، عام سپاہیوں میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ میں صوبائی وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں بذریعہ طیارہ لاہور پہنچا تو وہاں مقیم ایک گورکھا رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹرز ہوائی اڈے کے قریب تھا۔ اس رجمنٹ کے سپاہیوں نے جب یہ سنا کہ میرا طیارہ اتر گیا ہے تو ان میں سے سیکڑوں سپاہی صف بستہ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ وہ میرا درشن چاہتے ہیں۔ پولیس والوں میں بھی یہی جذبہ موجود تھا۔ ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں پولیس ہمیشہ حکومت کی پرزور حامی رہی ہے اور انہیں سیاسی کارکنوں سے کبھی ہمدردی نہیں رہی بلکہ وہ ان کے ساتھ اکثر سختی سے پیش آتے تھے۔ لیکن اب ان کے خیالات بھی بدل گئے تھے اور وہ کانگریس کی وفاداری میں کسی اور گروپ سے پیچھے نہیں تھے۔

ایک مرتبہ جب میں کلکتہ کے لال بازار سے گزر رہا تھا تو میری کار گاڑیوں کے ہجوم میں پھنس گئی۔ بعض پولیس کانسٹیبلوں نے مجھے پہچان لیا اور اپنی بیرکوں میں، جو قریب ہی تھیں، یہ خبر پہنچا دی۔ اس کے چند منٹ کے اندر کانسٹیبلوں اور ہیڈ کانسٹیبلوں کے مجمعے نے میری کار کو گھیر لیا۔ انہوں نے مجھے سلام کیا اور بعضوں نے میرے پاؤں چھو لیے۔ ان سب نے کانگریس کے لیے احترام کے جذبات ظاہر کیے اور کہا کہ وہ ہمارے احکامات پر عمل کریں گے۔ ایک اور واقعہ بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بنگال کے گورنر نے مجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور جب میں گورنمنٹ ہاؤس پہنچا تو ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل میری کار کے گرد جمع ہو گئے۔ میں جب کار سے باہر نکلا تو ان میں سے ہر شخص نے فرداً فرداً میرے پاس آ کر مجھے سلام کیا۔ ان سب نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کریں گے۔ چونکہ میں گورنر کی دعوت پر گورنمنٹ ہاؤس گیا تھا اس لیے میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اس موقعے پر نعرے لگائے جائیں۔ میری اس خواہش کے باوجود کانسٹیبل چپ نہ رہے اور وہ میرے اعزاز میں نعرے لگانے لگے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ ان کی ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ ہیں اور وہ اس کے کھلم کھلا اعلان سے خائف نہیں تھے۔ اگر حکومت انہیں کانگریس سے ہمدردی رکھنے کی بنا پر سزا دیتی تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھے۔

ظاہر ہے ان واقعات کی خبر حکام تک پہنچائی جاتی تھی۔ حکومت کو تفصیلی رپورٹیں ملتی تھیں اور وہ انہیں ہندوستان کے وزیر خارجہ کے پاس بھیج دیتی تھی۔ انگریزوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پوری قوم میں آزادی کی خواہش ایک شعلے کی طرح بھڑک اٹھی ہے۔ سیاسی آزادی اب صرف کانگریس کا ہی نہیں بلکہ ہر طبقے کے لوگوں کا نصب العین تھا۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ تمام سرکاری محکموں، سول اور فوجی،

کے ہر طبقے کے لوگ بھی اسی جذبے سے متاثر تھے۔ اب آزادی کی اس امنگ میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ مسلح افواج کے جوان اور افسر سب علانیہ کہتے تھے کہ انہوں نے جنگ میں اپنا خون اس یقین دہانی پر بہایا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ اب وہ یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ یہ وعدہ پورا کیا جائے۔

عام انتخابات کے بعد ہر صوبے میں نئی حکومت بنانے کا سوال پیدا ہو گیا۔ اب میرے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ صوبائی دارالحکومتوں میں جا کر وہاں وزارتوں کی تشکیل کے کام کی نگرانی کروں۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا لیکن ہوائی سفر کی سہولت نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ جنگ کے زمانے میں تمام فضائی آمد و رفت حکومت کے کنٹرول میں تھی اور نشستوں کی الاٹمنٹ بھی حکومت کے ذریعے ہوتی تھی۔ لارڈ ویول نے مجھے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچانے کی ہدایات جاری کر دیں جس کی وجہ سے میں تمام صوبائی دارالحکومتوں کا دورہ کر سکا۔

جب میں وزارت بنانے کے لیے بہار گیا تو میں نے دیکھا کہ کانگریس کے اندر مختلف گروپوں کی رقابتوں نے معاملے کو بہت پیچیدہ کر دیا تھا۔ ان رقابتوں کے علاوہ بعض اہم کانگریسی لیڈروں کے کچھ ذاتی مسائل بھی موجود تھے۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد ڈاکٹر سید محمود نے مجھ پر بعض بے بنیاد الزامات عائد کر دیے تھے۔ انہوں نے بنارس میں جاری کیے جانے والے ایک بیان میں مجھے کانفرنس کی ناکامی کا ذمے دار ٹھہرایا۔ ان کے مطابق کانگریس ورکنگ کمیٹی مسلم لیگ کے مطالبات تسلیم کرنے پر رضامند ہو گئی تھی لیکن صرف میری طرف سے کانگریس کے موقف میں لچک پیدا نہ کرنے پر اصرار کی بنا پر مسلم لیگ کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے۔ یہ بالکل غلط بات تھی۔ مجھے ڈاکٹر محمود کے اس بیان پر سخت افسوس ہوا۔ انہیں پتا تھا کہ رام گڑھ کانگریس کے بعد میں نے کس قدر مشکل سے انہیں اپنی ورکنگ کمیٹی میں شامل کیا تھا۔ جب انہوں نے حکومت سے معافی مانگ کر قلعہ احمد نگر جیل سے رہائی پائی تھی تو میرے کئی ساتھیوں نے انہیں ورکنگ کمیٹی میں شامل کرنے پر مجھے طعن و تشنیع کا ہدف بنایا تھا۔ اب ڈاکٹر محمود نے یہ سوچا کہ چونکہ انہوں نے مجھ پر جھوٹے الزامات عائد کیے ہیں اس لیے میں انہیں بہار کی کابینہ میں شامل نہیں ہونے دوں گا۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ایسے معاملوں میں فیصلہ کرتے وقت میں ذاتی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا۔ انہوں نے وائسرائے سے جو معافی مانگی اور میرے خلاف بیان جاری کیا، ملک کی موجودہ فضا میں میں نے ان کی اس کمزوری کو نظر انداز کر دیا۔ بہرحال میں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں صرف میرٹ کو مدنظر رکھا جائے گا اور میں ان کے عائد کردہ الزامات کو ذاتی پسند یا ناپسند کا سبب نہیں بننے دوں گا۔ جب وزیروں کی فہرست تیار ہوئی اور میں نے کانگریس اسمبلی پارٹی کے ارکان کے نام پڑھ لیے تو ڈاکٹر سید محمود کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کا نام بھی فہرست میں شامل تھا۔

میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ وزارتیں بنانے کے معاملے میں ہمیں مسلم لیگ کے ساتھ فیاضانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ جو ارکان لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے، میں نے انہیں بلاکر صوبائی وزارتوں کی تشکیل کے منصوبے میں اشتراک عمل کی دعوت دی۔ میں نے یہ کام ان تمام صوبوں میں کیا جہاں کانگریس کو مکمل اکثریت حاصل تھی اور جہاں وہ سب سے بڑی واحد پارٹی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت سے صوبوں خاص طور پر بہار، آسام اور پنجاب میں مسلم لیگ کے ارکان اس پیشکش پر بہت خوش ہوتے لیکن مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے ارکان کو میری دعوت قبول کرنے سے روک دیا۔

پنجاب میں صورت حال خاص طور سے پیچیدہ تھی۔ اس صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن یہاں کسی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہیں تھی۔ مسلم ارکان یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان بٹ چکے تھے۔ میں نے دونوں گروپوں کے ساتھ گفتگو کی۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، لیگ نے مسٹر جناح کی ہدایت پر میری دعوت قبول نہ کی۔ پھر بھی میں اس نہج پر گفتگو کر سکا کہ یونینسٹ پارٹی کو کانگریس کی حمایت سے وزارت بنانے کا موقع مل گیا۔ گورنر ذاتی طور پر مسلم لیگ کی طرف مائل تھا لیکن اس نے دیکھا کہ اس کے پاس یونینسٹ پارٹی کے لیڈر خضر حیات خان کو وزارت بنانے کی دعوت دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

پنجاب میں کانگریس پہلی مرتبہ حکومت میں شریک ہوئی تھی اور یہ ایسی صورت حال تھی جسے اب تک ناممکنات میں سے سمجھا جاتا تھا۔ پورے ملک کے سیاسی حلقوں نے یہ اعتراف کیا کہ ان گفتگوؤں میں، جن کے نتیجے میں پنجاب میں نئی حکومت بنی، میں نے انتہائی تدبر اور معاملہ فہمی سے کام لیا۔ ملک بھر کے آزاد ارکان نے بڑھ چڑھ کر مجھے مبارکباد دی۔ نیشنل ہیرلڈ نے، جو یو پی کانگریس کا اخبار ہے، میرے اس طریقے کو سراہا جس سے میں نے پنجاب کے پیچیدہ اور مشکل مسئلے کو حل کیا تھا۔ اخبار نے یہاں تک لکھا کہ میں نے جس حسنِ تدبر کا مظاہرہ کیا وہ کانگریسی لیڈر کی معاملہ فہمی کے ساتھ مذاکرات کرنے کی بہترین مثالوں میں سے ہے۔

پورے ملک میں بے حد پذیرائی پر میں خوش ہوا لیکن اس کے ایک نتیجے سے مجھے خاصا رنج ہوا۔ جب میں نے کانگریس میں کام کرنا شروع کیا تھا تو جواہر لعل اور میرے درمیان بہت اچھے دوستانہ مراسم قائم تھے۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ہم خیال رہے اور آپس میں تعاون کرتے رہے۔ ہمارے درمیان رقابت اور رشک کا سوال کبھی پیدا نہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ نہرو خاندان سے میرے دوستانہ تعلقات پنڈت موتی لعل نہرو کے زمانے سے قائم تھے۔ شروع میں میں جواہر لعل کو اپنے بھائی کا بیٹا اور وہ مجھے اپنے والد کا دوست سمجھتے تھے۔

جواہر لعل طبعاً ایک فیاض اور ہمدرد شخص اور ذاتی حسد اور رشک کے جذبات سے ناآشنا ہیں۔ ان کے بعض عزیزوں اور دوستوں کو ہمارے دوستانہ تعلقات پسند نہیں تھے چنانچہ انہوں نے ہمارے درمیان غلط فہمیاں

اور شکوک و شبہات پیدا کرنا شروع کر دیے ☆ خود پسندی اور خود نمائی جواہر لعل کی طبیعت کا خاصہ ہے اور یہ بات انہیں ہرگز پسند نہیں کہ ان کے مقابلے میں کسی اور شخص کی زیادہ حمایت یا تعریف کی جائے ☆ جواہر لعل کی یہ کمزوری ہے کہ وہ ہر معاملے کو نظریاتی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں چنانچہ ان لوگوں نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہیں میرے خلاف کر دیا۔ انہوں نے جواہر لعل کو سمجھایا اور کہا کہ یونینسٹ پارٹی کے ساتھ کانگریس کا اتحاد اصولاً غلط ہے۔ ان لوگوں کا استدلال یہ تھا کہ مسلم لیگ ایک عوامی جماعت ہے اس لیے کانگریس کو پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے بجائے مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد کرنا چاہیے تھا۔ کمیونسٹوں نے بھی کھلے عام یہی موقف اختیار کر رکھا تھا۔ جواہر لعل پر کسی حد تک ان لوگوں کے خیالات کا اثر تھا اور ممکن ہے انہوں نے یہ سوچا ہو کہ یونینسٹ پارٹی کے ساتھ اتحاد کر کے میں انقلاب پسندی کے اصولوں کو قربان کر رہا ہوں۔

جو لوگ جواہر لعل اور میرے درمیان اختلافات پیدا کرنا چاہتے تھے وہ ان سے کہتے رہے کہ ☆ میری تعریف و توصیف کے نتیجے میں جواہر لعل سمیت کانگریس کے دوسرے لیڈروں کی شخصیت ماند پڑ جائے گی۔ اگر خود ان کا اپنا اخبار نیشنل ہیرلڈ اسی طرح میری مدح سرائی کرتا رہا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس میں میرا کوئی ہمسر باقی نہیں رہے گا۔

میں نہیں سمجھتا کہ جواہر لعل پر ان دلیلوں کا کیا اثر ہوا لیکن بمبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں میں نے دیکھا کہ وہ ہر مسئلے میں میرے طرز عمل پر اعتراض کر رہے ہیں۔ جواہر لعل نے یہ دلیل پیش کی کہ میں نے پنجاب کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ میں نے کانگریس کا وقار ختم کر دیا ہے۔ مجھے ان کی یہ باتیں سن کر حیرت اور افسوس ہوا۔ میں نے پنجاب میں کانگریس کو حکومت میں شامل کر دیا تھا حالانکہ گورنر کی یہ کوشش تھی کہ مسلم لیگ کی وزارت بنے۔ میری کوششوں کے نتیجے میں مسلم لیگ کو الگ تھلگ کر دیا گیا تھا اور کانگریس اقلیت میں ہونے کے باوجود پنجاب کے معاملات میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل کر گئی تھی۔ خضر حیات خان کانگریس کی حمایت کے بل بوتے پر وزیر اعلیٰ بن گئے تھے اور اس طرح وہ کانگریس کے زیر اثر آ چکے تھے۔

جواہر لعل کی رائے تھی کہ کانگریس کا اس صورت میں حکومت میں شامل ہونا، جب اس کی اکثریت نہ ہو، درست نہیں ہے۔ اس طرح وہ سودے بازی کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ اسے اپنے اصولوں سے انحراف کرنا پڑے۔ میں نے اس بات کی تردید کی کہ کانگریس کے لیے اپنے اصولوں کو چھوڑنے کا کوئی خطرہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے صاف صاف لفظوں میں واضح کر دیا کہ اگر ورکنگ کمیٹی کو میرا لاہور کا فیصلہ منظور نہیں تو وہ جو پالیسی چاہے، اختیار کر سکتی ہے۔ کانگریس نے وزارت میں شامل رہنے کی کوئی ضمانت نہیں دی اور وہ جب چاہے وزارت کو چھوڑ سکتی ہے۔

گاندھی جی نے میرے خیالات کی بھرپور تائید کی۔ انہوں نے کہا کہ گو پنجاب میں کانگریس اقلیت میں تھی اس کے باوجود میرے مذاکرات کے نتیجے میں وزارت کی تشکیل اور کارکردگی میں اس کی آواز اب فیصلہ کن حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ کانگریس کے نقطہ نظر سے اس مسئلے کا اس سے بہتر حل ممکن نہیں تھا اور یہ کہ وہ میرے فیصلے کو تبدیل کرنے کے خلاف ہیں۔ جب گاندھی جی نے اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا تو ورکنگ کمیٹی کے دوسرے تمام ارکان نے بھی میری حمایت کر دی اور جواہر لعل کو سب کی رائے ماننا پڑی۔

ورکنگ کمیٹی کے سامنے اگلا سوال کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات کا تھا۔ اب تک حکومت کے ساتھ جو بھی گفت و شنید ہوئی اس میں کانگریس کا صدر پارٹی کی نمائندگی کرتا رہا۔ سر اسٹیفرڈ کرپس ۱۹۴۲ میں جب ہندوستان آئے تو خود جواہر لعل نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ میں کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے ان کے ساتھ مذاکرات کروں۔ شملہ کانفرنس میں بھی میں نے پارٹی کے واحد نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی تھی بلکہ گاندھی جی اس کانفرنس میں شریک بھی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس مرتبہ جواہر لعل کا رویہ مختلف تھا۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ کیبنٹ مشن کے ساتھ واحد نمائندے کے بجائے ورکنگ کمیٹی کی ایک مختصر سب کمیٹی کو مذاکرات کرنے چاہئیں۔

مجھے ان کی اس تجویز پر حیرت ہوئی۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جواہر لعل اس قسم کا سوال اٹھائیں گے۔ میں نے سوچا کہ چونکہ یہ اعتماد کا سوال ہے اس لیے میں نے ان کی مخالفت کی۔ میں نے اس جانب اشارہ کیا کہ اب تک کانگریس کا صدر ہی پارٹی کا واحد نمائندہ رہا ہے اور مجھے اس میں تبدیلی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اگر ورکنگ کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ اس طریق کار کو تبدیل کرنا ضروری ہے تو وہ ایسا کرنے کی یقیناً مجاز ہے البتہ میں ایسے کسی فیصلے میں فریق نہیں بنوں گا بلکہ میں ایسے کسی فیصلے کو کانگریس کے صدر کے فرائض میں کمی کے مترادف قرار دوں گا۔

اس نکتے پر گاندھی جی نے پھر میری حمایت کی۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ اس تبدیلی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اگر کانگریس کا صدر کرپس اور ویول کے ساتھ مذاکرات میں واحد نمائندے کی حیثیت سے شرکت کر سکتا ہے تو اب تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کیبنٹ مشن کے ساتھ بات چیت کے لیے اس وقت کوئی کمیٹی مقرر کی گئی تو اس سے یہ ظاہر ہوگا کہ کانگریس کے صدر کو پارٹی کا اعتماد حاصل نہیں ہے۔ ماضی کے تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس کے صدر سے بہتر کوئی نمائندہ موجود نہیں۔ اس مرحلے پر کمیٹی کے تقرر سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا بلکہ اس سے کانگریس کی صفوں اور عوام میں انتشار پیدا ہوگا☆

ورکنگ کمیٹی نے گاندھی جی کا مشورہ قبول کرتے ہوئے صدر کو دوبارہ کانگریس کا واحد نمائندہ مقرر کر دیا۔

ممکن ہے جواہر لعل نے یہ محسوس کیا ہو کہ بات بہت آگے بڑھ گئی ہے اور اس سے مجھے دکھ پہنچا ہے۔ میں حسب معمول بھولا بھائی ڈیسائی کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا کہ جواہر لعل صبح سویرے میرے پاس آئے اور بڑی محبت اور خلوص کے ساتھ مجھے اطمینان دلایا کہ ان کی تجویز کا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ انہیں میری قیادت پر اعتماد نہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھ مضبوط کیے جائیں کیونکہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر بعض ساتھیوں کو میرے ساتھ شامل کر لیا جائے تو میں بہتر انداز میں مذاکرات جاری رکھ سکوں گا۔ انہوں نے بے تکلفی سے اعتراف کیا کہ وہ معاملے کو ٹھیک سمجھ نہیں پائے تھے۔ انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم دونوں اس سارے قصے کو بھول جائیں۔ میں ان کی صاف گوئی پر بہت خوش ہوا۔ ہم آپس میں گہرے دوست رہے ہیں اور مجھے اس غلط فہمی پر بہت دکھ ہوا تھا۔

میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ ہندوستانی بحریہ کے بعض افسر کراچی میں مجھ سے ملے تھے جس میں انہوں نے منجملہ دوسری شکایتوں کے نسلی امتیاز کا بھی ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ اب تک انہوں نے اس امتیاز کے خلاف جو اجتماعی درخواستیں دی ہیں اور احتجاج کیا ہے، اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کی بے اطمینانی بڑھتی رہی اور ایک دن دہلی میں میں نے اچانک اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ انہوں نے راست اقدام شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے حکومت کو یہ نوٹس دیا تھا کہ اگر ایک مقررہ تاریخ تک ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو وہ سب ایک ساتھ استعفا دے دیں گے۔ یہ تاریخ گزر گئی ہے اور انہوں نے اپنے گزشتہ فیصلے کے مطابق بمبئی میں ایک عام جلسہ کیا ہے۔ اس خبر سے پورے ملک میں بجلی کی لہر دوڑ گئی اور قوم کی بھاری اکثریت ان کے ساتھ ہو گئی۔ اس صورت حال سے حکومت پریشان ہو گئی۔ اس نے برطانوی دستے طلب کر لیے اور ہندوستانی بحریہ کے تمام جہازوں پر انگریز افسر اور ملاح تعینات کر دیے۔

میرے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ یہ عوامی تحریک یا راست اقدام کے لیے مناسب موقع نہیں ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ ہمیں برطانوی حکومت کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ بھی جاری رکھنا چاہیے۔ میرے نزدیک ہندوستانی بحریہ کے افسروں کا یہ اقدام غلط تھا۔ اگر نسلی امتیاز کی وجہ سے انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا تو یہ تکلیف بری اور فضائی فوج کے لوگوں کو بھی تھی۔ وہ انتظامیہ کے خلاف احتجاج کرنے میں تو حق بجانب تھے لیکن اس طرح کا عملی احتجاج مجھے مصلحت کے خلاف معلوم ہوتا تھا۔

مسز آصف علی نے بحریہ کے افسروں کے اس نصب العین کو اٹھا لیا اور ان کی پرجوش حمایتی بن گئیں۔ وہ میری تائید حاصل کرنے کے لیے دہلی آئیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ بحریہ کے افسروں نے مصلحت اندیشی سے کام نہیں لیا اور میرا مشورہ یہ ہے کہ انہیں غیر مشروط طور پر کام پر واپس چلے جانا چاہیے۔ بمبئی کانگریس نے

مشورے کے لیے مجھے ٹیلی فون کیا اور میں نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعے انہیں بھی یہی مشورہ دیا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اس وقت بمبئی میں تھے۔ انہوں نے بھی مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ بحریہ کے افسروں نے غلط قدم اٹھایا ہے اور انہیں کام پر واپس چلے جانا چاہیے۔ سردار پٹیل نے پوچھا کہ اگر حکومت ان لوگوں کو کام پر واپس آنے کا موقع نہ دے تو انہیں کیا کرنا چاہیے؟ میں نے جواب دیا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے میرا اندازہ یہ ہے کہ حکومت انہیں واپس آنے کی اجازت دے دے گی۔ اگر حکومت کوئی دشواری پیدا کرے تو ہم مناسب کارروائی کریں گے۔

مجھے اگلے روز وزارت بنانے کے لیے پشاور جانا تھا تاہم میں نے اپنا سفر ملتوی کر کے کمانڈر انچیف سے فوری ملاقات کی درخواست کی۔ اگلی صبح دس بجے لارڈ اوکن لیک نے پارلیمنٹ ہاؤس میں مجھ سے ملاقات کی۔ میں نے یہ دو معاملے ان کے سامنے غور کے لیے پیش کیے۔

۱۔ کانگریس نے بحریہ کے افسروں کے اس فعل کو ناپسند کیا ہے اور انہیں غیر مشروط طور پر کام پر واپس جانے کا مشورہ دیا ہے تاہم کانگریس چاہتی ہے کہ انہیں سزا نہ دی جائے۔ اگر حکومت نے کوئی تادیبی کارروائی کی تو کانگریس اس معاملے کو اپنا مسئلہ بنا کر ان کی طرف سے پیروی کرے گی۔

۲۔ بحریہ کے افسروں کو نسلی امتیاز سمیت جو دوسری شکایتیں ہیں، ان کا جائزہ لے کر انہیں دور کیا جائے۔

لارڈ اوکن لیک نے نہایت دوستانہ انداز میں گفتگو کی بلکہ ان کا خلوص میری توقع سے بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر وہ کسی شرط کے بغیر کام پر واپس چلے جائیں تو انہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ جہاں تک نسلی امتیاز کا تعلق ہے، وہ پوری کوشش کریں گے کہ اسے مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔ ان کے جواب سے مجھے اطمینان ہو گیا اور میں نے فوری طور پر ایک بیان جاری کر دیا جس میں بحریہ کے افسروں سے کہا گیا کہ وہ ڈیوٹی پر واپس آ جائیں۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا کہ انہیں کسی قسم کی سزا نہیں دی جائے گی۔

موجودہ حالات کے پس منظر میں بمبئی میں نیول افسروں کی بغاوت خصوصی اہمیت کی حامل تھی۔ ۱۸۵۷ کے بعد یہ پہلا واقعہ تھا کہ مسلح افواج کے ایک طبقے نے کسی سیاسی مسئلے پر انگریزوں کے خلاف کھلی بغاوت کی تھی۔ یہ بغاوت ایک تنہا مثال نہیں تھی کیونکہ اس سے پہلے ہندوستان کے جنگی قیدیوں نے سبھاش چندر بوس کی قیادت میں انڈین نیشنل آرمی قائم کر لی تھی۔ اس فوج نے ۱۹۴۴ میں ہندوستان پر حملہ کیا اور ایک موقع پر امپھل پر تقریباً قبضہ کر لیا تھا۔ جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد انگریزوں نے برما پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور انڈین نیشنل آرمی کے بہت سے افسروں کو قید کر لیا گیا۔ وہ انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے پر نادم نہیں تھے۔ ان میں سے بعض لوگوں پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ ان تمام واقعات سے انگریزوں کو یقین

ہو گیا کہ جب تک ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا اطمینان بخش حل تلاش نہیں کیا جاتا، اس وقت تک وہ مسلح افواج پر بھروسا نہیں کر سکتے۔

میں نے انڈین آرمی کے افسروں کی گرفتاری کی خبر اس وقت سنی جب میں شملہ کانفرنس کے بعد گلمرگ گیا ہوا تھا۔ پنجاب ہائی کورٹ کے ایک جج مسٹر پرتاب سنگھ ایک دن بہت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آئے اور کہا کہ سبھاش چندر بوس کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف لڑنے والے بعض انڈین افسروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کا ایک عزیز بھی ان افسروں میں شامل تھا اس لیے انہیں ان نوجوانوں کے انجام کی بہت فکر تھی۔ وہ روایتی سرکاری ملازم کی ذہنیت کے حامل تھے اور اس وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ اگر کانگریس نے کسی صورت سے اس معاملے میں مداخلت کی تو اس سے ان قیدیوں کو نقصان پہنچے گا۔ انہوں نے تجویز کیا کہ کانگریس کو انڈین نیشنل آرمی کے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں لینی چاہیے کیونکہ ان کا استدلال یہ تھا کہ اس طرح مقدمہ سیاست سے پاک رہے گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ کی رائے بالکل غلط ہے۔ اگر کانگریس نے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ لی تو حکومت انڈین نیشنل آرمی کے افسروں کو سزا دے گی اور بعض کو سزائے موت بھی سنائی جا سکتی ہے۔ ان افسروں میں بعض ہندوستان کے بہترین نوجوان ہیں اور ان کا قید رہنا یا سزائے موت پانا بہت بڑا قومی نقصان ہوگا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ انڈین نیشنل آرمی کے افسروں کی طرف سے مقدمے کی پیروی کانگریس کرے گی۔ چنانچہ میں نے اسی مضمون کا ایک بیان اخبارات کو جاری کر دیا۔

میری رائے کے مطابق برطانوی حکومت کو ان افسروں کے طرز عمل پر شکایت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ہندوستانی فوج کے ایک حصے کو برما اور سنگاپور بھیجا گیا تھا۔ جب جاپان نے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا تو برطانوی حکومت نے اس ہندوستانی فوج کو اس کے حال پر چھوڑ دیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک برطانوی افسر تھا جس نے ہندوستانی فوج کو جاپانیوں کے حوالے کیا تھا۔ اگر ہندوستانی فوجی غفلت اور سستی کا مظاہرہ کرتے تو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے جاپان کی جنگی سرگرمیوں کے سلسلے میں ان سے سڑکیں بنوائی جاتیں یا فیکٹریوں میں کام لیا جاتا۔ وہ جاپانیوں کے ہاتھ میں کھلونا بنے رہتے اور ممکن ہے کہ انہیں ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے جاپان کا آلہ کار بنایا جاتا۔ ان لوگوں نے مختلف رویہ اختیار کیا اور خود ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب تک وہ جاپان کے قیدی تھے اس وقت تک برطانوی حکومت ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اگر وہ مجبور ہو کر جاپانیوں کے طرفدار ہو جاتے تو بھی ان کے اس عمل کو جائز قرار دیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے جو کچھ کیا وہ اس سے بہتر تھا۔ انہوں نے لبریشن آرمی آف انڈیا کے نام سے الگ فوج بنانے کا جو فیصلہ کیا وہ حالات اور مصلحت کے عین مطابق تھا۔ اس طرح انہوں نے اس بات کو یقینی بنا لیا کہ اگر انگریز ہندوستان سے نکال دیے گئے تو اس پر

جاپانی فوج کا نہیں، انڈین نیشنل آرمی کا قبضہ ہوگا۔ میرے نزدیک ان حالات میں انڈین نیشنل آرمی کے ارکان پر مقدمہ چلانے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔

کانگریس کی رائے یہ تھی کہ اگر حکومت انڈین نیشنل آرمی کے افسروں پر مقدمہ چلانا چاہتی ہے تو اس مقدمے کی سماعت کھلی عدالت میں ہونی چاہیے اور یہ کہ ملزموں کی طرف سے قانونی دفاع کا انتظام کانگریس کو کرنا چاہیے۔ میں نے اس سلسلے میں لارڈ ویول کو لکھا اور اصرار کیا کہ انہیں کانگریس کے نقطہ نظر کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ لارڈ ویول نے میرے خیالات سے اتفاق کیا اور انہوں نے یہ حکم دے دیا کہ ان افسروں کے خلاف مقدمے کی سماعت لال قلعے میں کھلی عدالت میں ہونی چاہیے۔ مقدمے کی سماعت کئی ماہ تک جاری رہی اور اس کی وجہ سے عوام میں زبردست جوش و خروش پیدا ہوگیا۔ آخر عدالت کے فیصلے کے مطابق وائسرائے کی طرف سے معافی کی بنا پر یہ تمام افسر رہا کر دیے گئے۔

چند ایک افسر ایسے بھی تھے جو قید رہے یا جن کے بارے میں عدالت نے حکم صادر نہ کیا۔ اس سے عوام میں شدید بے چینی پیدا ہوگئی اور ملک کے مختلف حصوں میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ جب میں پنجاب میں وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں لاہور گیا تو طالب علموں نے بہت بڑا جلوس نکالا اور مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے اس مکان پر آ گئے جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ تقریباً دوپہر کا وقت تھا اور یہ لوگ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ میں شروع سے ہی یہ محسوس کرتا تھا کہ ان مظاہروں کا کوئی جواز نہیں ہے۔ میں نے طالب علموں کے ساتھ سخت الفاظ میں گفتگو کی اور انہیں بتایا کہ کانگریس نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کے پیش نظر مظاہرے کرنا بالکل بے محل ہے۔ ہم نے قیدیوں کی طرف سے مقدمہ لڑنے اور انہیں رہا کرانے کا تہیہ کر رکھا ہے اور اس مقصد کے لیے تمام قانونی اور دستوری ذرائع استعمال کیے جا رہے ہیں۔ اس قسم کے بے قاعدہ مظاہروں سے الٹا نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ اس وقت ہندوستان کا پورا سیاسی مستقبل زیر غور ہے۔ برطانیہ میں ایک نئی حکومت قائم ہوگئی ہے اور لیبر پارٹی کو پارلیمنٹ میں واضح اکثریت حاصل ہوگئی ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل تلاش کرنے کا وعدہ کیا ہے اور انہیں ضروری کارروائی کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ لہٰذا کانگریس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ فی الحال کوئی تحریک شروع نہیں کی جائے گی۔ اب مناسب ہوگا کہ عوام انتظار کریں اور دیکھیں کہ کانگریس کیا ہدایتیں جاری کرتی ہے۔

میں نے کہا ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مظاہرے ہوئے۔ کلکتے میں مظاہروں کے سلسلے میں بعض تشدد آمیز کارروائیاں ہوئیں، دہلی میں لوگوں نے سرکاری عمارتوں کو نذر آتش کرنے کی کوشش کی اور سرکاری املاک تباہ کر دیں۔ میں واپس دہلی آیا تو لارڈ ویول سے ملاقات کی۔ انہوں نے ان واقعات کا تذکرہ

کیا اور کہا کہ ان واقعات سے کانگریس کی اس یقین دہانی کی تصدیق نہیں ہوتی کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کو پرامن ماحول میں طے کیا جائے گا۔ میرے لیے اس شکایت کو حق بجانب ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے دہلی کے تمام کانگریسی کارکنوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ کانگریس کو ایک سنگین بحران کا سامنا ہے۔ تمام قومی تحریکوں میں ایک مرحلہ آتا ہے جب لیڈروں کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا وہ عوام کی قیادت کریں گے یا ان کے پیچھے چلیں گے؟ ہندوستان میں ہم بظاہر اس منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ اگر کانگریس کا خیال ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ صرف پرامن ذرائع سے حل ہو سکتا ہے تو کانگریس کے ارکان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس پیغام کو عوام تک پہنچائیں اور اس پر عمل کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ کم از کم میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں کہ عوام جو کچھ کریں، اسے سر جھکا کر مان لوں۔ میری رائے میں دہلی میں جو کچھ ہوا ہے، وہ غلط ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ رائے عامہ کی صحیح رہنمائی کروں اور اسے قابو میں رکھوں۔ میں عوامی خواہشات کی پیروی کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اگر کانگریس کے کارکنوں کو میرا طریقہ پسند نہیں تو انہیں کوئی دوسرا لیڈر تلاش کر لینا چاہیے۔

گیارھواں باب

برطانوی کیبنٹ مشن

فروری ۱۹۴۶ میں میں نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ ملک کی کایا پلٹ گئی ہے۔ اب ایک بالکل نئے ہندوستان نے جنم لے لیا تھا۔ تمام ہندوستانی، خواہ وہ سرکاری ملازم تھے یا عام شہری، آزادی کے ایک نئے جذبے سے سرشار تھے۔ برطانیہ کا رویہ بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ جیسا کہ مجھے شروع سے توقع تھی، لیبر حکومت ہندوستان کی صورت حال کا صحیح زاویے سے جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد ایک پارلیمانی وفد کو ہندوستان بھیجا جس نے ۴۶-۱۹۴۵ کے موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس وفد کے ارکان سے گفتگو کر کے مجھے اطمینان ہوگیا کہ انہوں نے ہندوستان کے بدلتے ہوئے مزاج کا اندازہ لگا لیا ہے اور انہیں یقین ہوگیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کو اب زیادہ عرصے تک ٹالا نہیں جا سکتا اور یہ کہ وہ حکومت کو جو رپورٹ پیش کریں گے اس سے لیبر کابینہ کے اس عزم کو تقویت ملے گی کہ ہندوستان کے مسئلے کا جلد اور دوستانہ تصفیہ ہونا چاہیے۔

۱۷ فروری ۱۹۴۶ کو رات کے ساڑھے نو بجے میں ریڈیو سن رہا تھا کہ مجھے برطانیہ کے نئے فیصلے کی خبر ملی۔ لارڈ پیتھک لارنس نے پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کی آزادی کے سوال پر ہندوستانی نمائندوں سے گفت وشنید کے لیے ایک کیبنٹ مشن کو ہندوستان بھیجے گی۔ یہی بات اس پروگرام میں بیان کی گئی جس کا خاکہ وائسرائے کی اسی دن کی تقریر میں پیش کیا گیا۔ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ کیبنٹ مشن وزیر خارجہ برائے امور ہند لارڈ پیتھک لارنس، تجارتی بورڈ کے صدر سر اسٹیفرڈ کرپس اور بحریہ کے پہلے لارڈ مسٹر اے وی الیگزینڈر پر مشتمل ہوگا۔ اس خبر پر میرا ردعمل معلوم کرنے کے لیے ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک نمائندہ کوئی آدھے گھنٹے کے اندر میرے پاس پہنچ گیا۔

میں نے اس سے کہا کہ مجھے لیبر حکومت کے فیصلہ کن قدم پر خوشی ہوئی ہے۔ میں اس بات پر بھی خوش ہوں کہ ہندوستان آنے والے وفد میں سر اسٹیفرڈ کرپس بھی شامل ہیں جو بلاشبہ میرے پرانے دوست ہیں اور ہمارے ساتھ پہلے بھی مذاکرات کر چکے ہیں۔

میں نے مزید کہا کہ میرے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ برطانیہ کی نئی حکومت ہندوستان کے مسئلے سے پہلوتہی نہیں کر رہی بلکہ جرأت کے ساتھ اس کا سامنا کر رہی ہے۔ یہ ایک بہت اہم تبدیلی ہے۔

۱۵ مارچ ۱۹۴۶ کو مسٹر اٹیلی نے دارالعوام میں ہندوستان کی صورت حال کے بارے میں ایک بیان دیا جس کی ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کی پوری تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے صاف لفظوں میں یہ اعتراف کیا کہ صورت حال اب مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہے اور اس پر ایک نئے زاویے سے غور کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ان کے اس اعلان نے ہندوستان پر بڑا اثر ڈالا کہ اگر پرانی روش پر قائم رہنے کی کوشش کی گئی تو اس سے مسئلہ حل نہیں ہو گا بلکہ تعطل پیدا ہو جائے گا۔

مسٹر اٹیلی نے اپنی تقریر میں چند ایسے نکات بیان کیے جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انہوں نے یہ بات تسلیم کی کہ ماضی میں دونوں فریقوں سے غلطیاں ہوئی ہیں اور اب ہمیں پچھلی باتیں دہرانے کے بجائے مستقبل پر نظر رکھنی چاہیے۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے فارمولوں کو نئی صورت حال پر منطبق کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ ۱۹۴۶ میں جو مزاجی کیفیت پائی جاتی ہے وہ ۱۹۲۰، ۱۹۳۰ یہاں تک کہ ۱۹۴۲ میں بھی نہیں تھی۔ انہوں نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ وہ ہندوستانیوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات پر زور دینا نہیں چاہتے کیونکہ تمام تر اختلافات اور پھوٹ کے باوجود ہندوستان کے عوام آزادی کی خواہش میں یک جان اور متحد ہیں۔ ہندوستان کے تمام طبقوں کا یہی بنیادی مطالبہ ہے، خواہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان، سکھ ہیں یا مراٹھے، سیاستدان ہیں یا سول سروس کے لوگ۔ مسٹر اٹیلی نے کھلے دل کے ساتھ اعتراف کیا کہ قومیت کا تصور بتدریج فروغ پاتا جا رہا ہے اور اب یہ ان فوجیوں میں سرایت کر چکا ہے جنھوں نے جنگ کے دوران شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ مسٹر اٹیلی نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندوستان میں کچھ سماجی اور اقتصادی مشکلات موجود ہیں تو انہیں صرف ہندوستان کے لوگ ہی دور کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر کو اس اعلان پر ختم کیا کہ کیبنٹ مشن کچھ کر کے دکھانے کی طرف مائل ہے اور وہ کامیابی حاصل کرنے کا عزم لے کر ہندوستان جا رہا ہے۔

کیبنٹ مشن ۲۳ مارچ کو ہندوستان پہنچا۔ سر اسٹیفرڈ کرپس اس سے پہلے جب ہندوستان آئے تھے تو جے سی گپتا نے میزبان کے فرائض انجام دیے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کرپس کے ساتھ ملاقات کے لیے دہلی جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں کرپس کے لیے ایک خط دیا جس میں ان کے دوبارہ ہندوستان آنے پر انہیں خوش آمدید کہا۔

میں ۲ اپریل ۱۹۴۶ کو دہلی پہنچا۔ میں نے سوچا کہ اس وقت سب سے اہم غور طلب مسئلہ ہندوستان اور برطانیہ کا سیاسی اختلاف نہیں بلکہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ شملہ کانفرنس کے بعد مجھے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ سیاسی مسئلہ تصفیے کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے البتہ فرقہ وارانہ اختلافات اب بھی جوں کے توں

ہیں۔اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمان ایک جماعت کی حیثیت سے اپنے مستقبل کے بارے میں بہت فکر مند تھے۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ بعض صوبوں میں انہیں واضح اکثریت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں صوبائی معاملات میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا۔ لیکن مجموعی اعتبار سے چونکہ وہ ہندوستان میں ایک اقلیت تھے اس لیے وہ اس خوف سے پریشان رہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں ان کا مرتبہ اور حیثیت محفوظ نہیں ہو گی۔

میں نہایت فکر مندی سے اس مسئلے پر مسلسل غور کرتا رہا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان کا دستور وفاقی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس دستور کی تشکیل اس انداز سے ہونی چاہئے کہ اس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ شعبوں میں مکمل خودمختاری کی ضمانت حاصل ہو۔ ہمیں صوبائی خودمختاری کے مسئلے کو قومی وحدت سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ یہ کام اسی صورت میں ممکن تھا کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان اختیارات اور فرائض کی تقسیم کا کوئی اطمینان بخش فارمولا دریافت کرلیا جائے۔ کچھ اختیارات اور فرائض بنیادی طور پر مرکز سے متعلق ہوں گے اور بعض صوبوں کے پاس ہوں گے۔ کچھ اختیارات ایسے ہوں گے جو نہ مرکز سے متعلق ہوں گے اور نہ صوبوں سے، بلکہ مرکز یا صوبے انہیں باہمی رضامندی سے استعمال کریں گے۔ پہلا قدم یہ تھا کہ ایک ایسا فارمولا مرتب کیا جائے جس کی رو سے یہ طے کر دیا جائے کہ کم سے کم کتنے معاملات ایسے ہیں جو لازمی طور پر مرکزی حکومت کے ذمے ہوں گے۔ یہ امور ہر صورت میں یونین حکومت کے پاس ہونے چاہئیں۔ اس کے علاوہ ایسے معاملات کی بھی ایک فہرست ہونی چاہیے جنہیں صوبائی حکومتیں چاہیں تو مرکز کے سپرد کر سکیں۔ اسے مرکزی حکومت کے لیے اختیاری فہرست کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر کوئی صوبہ چاہے تو تمام یا چند معاملات میں اپنے اختیارات مرکزی حکومت کو تفویض کر سکے گا۔

میرے نزدیک یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ دفاع، مواصلات اور امور خارجہ ایسے معاملات ہیں جنہیں صرف ہندوستان کی مرکزی حکومت نمٹ سکتی ہے۔ اگر ان امور کو صوبائی سطح پر لایا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وفاقی حکومت کا مقصد فوت ہو جائے گا اور اس کی بنیاد ہی باقی نہیں رہے گی۔ ٹھیک اسی طرح کچھ امور صوبائی حکومتوں کی ذمے داری میں ہونے چاہئیں البتہ ان کے علاوہ امور کی ایک تیسری فہرست بھی ہونی چاہیے جن کے بارے میں صوبائی قانون ساز اسمبلیاں یہ طے کریں گی کہ آیا ان معاملوں کو اپنے ماتحت رکھیں گی یا انہیں مرکز کو سونپ دیا جائے گا؟

میں نے اس معاملے پر جتنا غور کیا اتنی ہی یہ بات میرے ذہن میں صاف ہوتی گئی کہ ہندوستان کے مسئلے کو صرف انہی خطوط پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس اصول کی بنیاد پر ملک کا دستور تیار کیا گیا تو یہ بات یقینی ہو جائے گی کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ان تین معاملوں کے سوا دوسرے تمام امور کا انتظام خود صوبے کریں گے۔

اس سے مسلمانوں کا یہ اندیشہ دور ہو جائے گا کہ وہ ہندوؤں کے ماتحت ہو جائیں گے۔ ایک مرتبہ یہ ذہنی خوف ختم ہو گیا تو اس کا امکان ہو گا کہ صوبوں کو اپنے کچھ اور اختیارات مرکز کو سونپنے میں اپنا مفاد نظر آئے۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے قطع نظر ہندوستان جیسے ملک کا یہ بہترین سیاسی حل ہے۔ ہندوستان ایک وسیع وعریض ملک ہے جس کی آبادی مختلف اکائیوں پر مشتمل ہے جو اپنے اندر یکسانیت رکھتی ہیں اور مختلف صوبوں میں آباد ہیں۔ قانونی مصلحت اور انتظامی سہولت کے پیش نظر صوبوں کو یہ یقین دلانا بھی ضروری ہے کہ انہیں دستور میں زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو گی۔

یہ نقشہ بتدریج میرے ذہن میں قائم ہوا تھا۔ جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا تو اس کے خدوخال پوری طرح واضح ہو چکے تھے البتہ میں نے اب تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس مسئلے پر مشورہ نہیں کیا تھا۔ میں اس مسئلے پر تبادلہ خیالات کو ضروری بھی نہیں سمجھتا تھا کیونکہ ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات کے سلسلے میں مجھے مکمل اختیارات دے رکھے تھے۔ میں نے سوچا کہ جب اس کا مناسب موقع آئے گا تو اپنے نقطہ نظر کو صاف اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کر دوں گا۔

کیبنٹ مشن کے ارکان سے میری پہلی ملاقات ۶ اپریل ۱۹۴۶ کو ہوئی۔ مشن نے مذاکرات کے لیے پہلے سے کچھ سوال تیار کر رکھے تھے۔ پہلا سوال ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں تھا۔ جب مشن نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ میں فرقہ وارانہ صورت حال سے کس طرح نمٹوں گا تو میں نے وہی حل پیش کیا جو میں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ میں نے جیسے ہی یہ کہا کہ مرکز کے پاس لازمی شعبوں کی کم سے کم فہرست اور اختیاری امور کی اضافی فہرست ہونی چاہیے تو لارڈ پیتھک لارنس نے کہا: ''دراصل آپ فرقہ وارانہ مسئلے کا ایک نیا حل پیش کر رہے ہیں''۔

سر اسٹیفرڈ کرس نے میری تجویز میں خصوصی دلچسپی لی اور بڑی دیر تک مجھ سے جرح کرتے رہے۔ آخر میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے نقطہ نظر سے مطمئن ہیں۔

ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ۱۲ اپریل کو منعقد ہوا جس میں میں نے کیبنٹ مشن کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں رپورٹ پیش کی۔ میں نے فرقہ وارانہ مسئلے کا جو حل پیش کیا تھا اسے خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب گاندھی جی اور دوسرے ساتھیوں کو میری اس اسکیم پر گفتگو کو موقع ملا۔ ورکنگ کمیٹی کو شروع میں اس حل کے بارے میں بہت سے شکوک تھے چنانچہ ممبروں نے طرح طرح کی مشکلات اور اندیشے ظاہر کیے۔ میں نے ان کے اعتراضات کے جواب دیے اور جو پہلو صاف نہیں تھے ان کی وضاحت کی۔ بالآخر ورکنگ کمیٹی کو تجویز کے صحیح ہونے کا یقین ہو گیا اور گاندھی جی فرقہ وارانہ مسئلے کے حل سے مکمل طور پر متفق ہو گئے۔

یہ واقعہ ہے کہ گاندھی جی نے یہ کہہ کر مجھے مبارکباد دی کہ میں نے ایک ایسے مسئلے کا حل ڈھونڈ نکالا جس نے ہر ایک کو زچ کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میرا حل انتہائی فرقہ پرست مسلم لیگیوں کے خوف کو بھی دور کر دے گا۔ اس کے علاوہ اس حل کے پیچھے فرقہ وارانہ جذبات کے بجائے حقیقی قومیت کی روح کارفرما ہے۔ گاندھی جی نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں صرف وفاقی دستور ہی قابل عمل ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس نقطہ نظر سے بھی میرے حل کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اگرچہ اس میں کوئی انوکھا اصول پیش نہیں کیا گیا مگر اس سے ہندوستان کے پس منظر میں وفاقیت کے اثرات صاف ظاہر ہوتے ہیں۔

سردار پٹیل نے مجھ سے سوال کیا کہ آیا مرکزی حکومت کا دائرۂ عمل صرف تین معاملوں تک محدود رہے گا؟ انہوں نے کہا کہ کچھ ایسے امور ہیں جیسے کرنسی اور مالیات جنہیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے مرکز کے پاس ہونا چاہیے۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تجارت اور صنعت کو صرف کل ہند بنیاد پر ہی ترقی دی جا سکے گی اور یہی صورت تجارتی پالیسی کی ہے۔

مجھے ان کے اعتراضات کا جواب دینے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ گاندھی جی نے خود ہی میرے نقطہ نظر کو اپنا لیا اور سردار پٹیل کے سوالوں کا جواب دینے لگے۔ انہوں نے کہا یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ صوبائی حکومتیں کرنسی اور کسٹمز جیسے امور پر مرکز سے اختلاف کریں گی۔ ان معاملوں میں متفقہ پالیسی اختیار کرنا خود صوبائی حکومتوں کے مفاد میں ہوگا۔ چنانچہ اس پر اصرار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ کرنسی یا مالیات کو مرکزی امور کی لازمی فہرست میں شامل کیا جائے۔

مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ قرارداد لاہور میں، جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی، ہندوستان کی ممکنہ تقسیم کا ذکر کیا۔ میں نے جو حل پیش کیا تھا، اس میں مسلم لیگ کے اندیشوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب جبکہ میں نے اپنی اسکیم پر اپنے ساتھیوں اور کیبنٹ مشن کے ارکان سے تبادلہ خیالات کر لیا تھا تو میں نے سوچا کہ اس اسکیم کو ملک کے سامنے پیش کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ میں نے ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ کو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے مطالبات کے بارے میں ایک بیان جاری کر دیا۔ اب جو ہندوستان کی تقسیم ایک حقیقت بن چکی ہے اور دس برس بیت چکے ہیں، آج میں اپنے اس بیان پر دوبارہ نظر ڈالتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا تھا، آخر وہی ہوا۔ چونکہ اس بیان میں میں نے ہندوستان کے مسئلے کے حل کے ضمن میں اپنی قطعی رائے ظاہر کی تھی اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے یہاں اس بیان کا مکمل متن شائع کر دینا چاہیے۔ یہ سب میں نے اُس وقت کہا تھا اور اب بھی یہی کہوں گا۔

☆ مسلم لیگ نے پاکستان کی جو اسکیم تجویز کی ہے، میں نے اس کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لیا ہے۔

ایک ہندوستانی کی حیثیت سے میں نے پورے ہندوستان کے مستقبل پر اس اسکیم کے اثرات پر گہرا غور وخوض کیا ہے۔
ایک مسلمان کی حیثیت سے میں نے دیکھا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

☆ اس اسکیم کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ نہ صرف بحیثیت مجموعی پورے ہندوستان کے لیے خاص طور پر مسلمان کے لیے نقصان دہ ہوگی اور جتنے مسئلے اس کے ذریعے حل ہوں گے، اس سے زیادہ نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔

☆ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پاکستان کا نام ہی میری سرشت اور مزاج کے خلاف ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک اور کچھ ناپاک ہیں۔ پاک اور ناپاک علاقوں کی یہ تقسیم سراسر غیر اسلامی ہے۔ یہ اصطلاح اس کٹر برہمن مت کے زیر اثر وضع کی گئی ہے جو انسانوں کو پاک اور ناپاک کے زمروں میں تقسیم کرتی ہے۔ یہ تقسیم اسلام کی روح اور تعلیمات سے انحراف ہے۔ اسلام ایسی کسی تقسیم کو ہرگز تسلیم نہیں کرتا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: ''خدا نے پوری روئے زمین کو میرے لیے مسجد بنایا ہے''۔

☆ اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی اسکیم شکست خوردگی کی علامت ہے جو یہودیوں کی طرح قومی وطن کے مطالبے کی بنیاد پر استوار کی گئی ہے۔ یہ اسکیم اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اجتماعی طور پر اپنی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکتے اور اس پر راضی ہیں کہ ایک کونے میں، جو اُن کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو، سمٹ کر بیٹھ جائیں۔

☆ یہودیوں کی قومی وطن کی آرزو سے تو ہمدردی کی جا سکتی ہے کیونکہ وہ دنیا بھر میں منتشر ہیں اور کسی ایک علاقے میں حکومت کے انتظامات پر اثر نہیں ڈال سکتے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان کی تعداد ۹ کروڑ سے اوپر ہے اور وہ کمیت اور کیفیت ہر لحاظ سے ہندوستانی زندگی کا اس قدر اہم عنصر ہیں کہ حکومت کے انتظامات اور پالیسی پر فیصلہ کن حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدرت نے انہیں چند مخصوص علاقوں میں بڑی تعداد میں یک جا کر کے انہیں مزید تقویت پہنچائی ہے۔

☆ اس پس منظر میں پاکستان کے مطالبے میں کوئی جان نہیں رہتی۔ میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے اس حق کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوں کہ پورے ہندوستان کو میدان عمل سمجھوں اور اس کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کی تشکیل میں شرکت کروں۔ میرے لیے یہ بڑی بزدلی کی بات ہے کہ میں اپنے آبائی ورثے سے دستبردار ہو کر اس کے ایک ٹکڑے پر قناعت کر لوں۔

☆ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، مسٹر جناح کی پاکستان کی اسکیم ان کے دو قومی نظریے پر مبنی ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستان میں کئی قومیتیں آباد ہیں جن کے درمیان مذہب بنائے امتیاز ہے۔ ان میں سے دو بڑی قومیں ہیں یعنی ہندو اور مسلمان، ان کی اس اعتبار سے کہ وہ دو الگ قومیں ہیں، دو الگ ریاستیں ہونی چاہئیں۔ جب ڈاکٹر ایڈورڈ تھامپسن نے ایک مرتبہ مسٹر جناح سے کہا کہ ہندو اور مسلمان ہندوستان کے ہزاروں شہروں، قصبوں اور دیہات میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہ رہے ہیں تو مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اس کا ان کی جداگانہ قومیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مسٹر جناح کے نظریے کے مطابق چونکہ یہ دونوں قومیں ہر بستی، ہر گاؤں اور ہر

شہر میں ایک دوسرے سے دوچار ہوتی رہتی ہیں، اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ انہیں دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

☆ میں اس مسئلے کے باقی تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اس پر صرف مسلمانوں کے مفاد کے نقطۂ نظر سے غور کرنے کو تیار ہوں۔ میں اس سے بھی آگے جاؤں گا اور یہ کہوں گا کہ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ پاکستان کی اسکیم سے مسلمانوں کو کسی طرح سے بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو میں اسے تسلیم کرنے کو تیار ہوں اور دوسروں کو اسے منظور کرنے پر آمادہ کرنے کی غرض سے کوشش کروں گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر میں اس اسکیم کا مسلمانوں کے جماعتی مفاد کے نقطۂ نظر سے جائزہ لوں تو مجبوراً اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اس سے مسلمانوں کو ذرا بھی فائدہ نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ان کے جائز اندیشے دور ہو سکتے ہیں۔

☆ آیئے ذرا ٹھنڈے دل سے ان نتائج پر غور کریں جو پاکستان کی اسکیم پر عملدرآمد کے نتیجے میں برآمد ہوں گے۔ ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا جن میں سے ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی اور دوسری میں ہندوؤں کی۔ ہندوستان کی ریاست میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان باقی رہ جائیں گے جو پورے ملک میں چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہوں گے۔ وہ یو پی میں ۱۷ فی صد، بہار میں ۱۲ فی صد اور مدراس میں ۹ فی صد ہوں گے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ کمزور ہوں گے۔ انہوں نے تقریباً ایک ہزار سال سے ان علاقوں کو اپنا وطن سمجھا ہے اور یہاں اسلامی تہذیب اور ثقافت کے مشہور مرکز تعمیر کیے ہیں۔

☆ ایک روز ان لوگوں کی صبح کو آنکھ کھلے گی تو وہ دیکھیں گے کہ وہ راتوں رات اجنبی اور پردیسی بن گئے ہیں۔ وہ صنعتی، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے پسماندہ ہوں گے اور ایک ایسی حکومت کے رحم وکرم پر ہوں گے جو خالص ہندو راج بن گئی ہوگی۔

☆ اس کے برعکس خود ریاست پاکستان میں وہ غیر محفوظ اور کمزور ہوں گے۔ پاکستان کے اندر کہیں بھی ان کی اتنی بڑی اکثریت نہیں ہوگی جتنی ریاست ہندوستان میں ہندوؤں کی۔

☆ دراصل ان کی اکثریت اتنی کم ہوگی کہ ان علاقوں کے غیر مسلموں نے جو اقتصادی تعلیمی اور سیاسی شعبوں میں جو سبقت حاصل کر لی ہے، وہ اسے بے اثر کر دے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور پاکستان میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی پھر بھی ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ حل نہ ہوتا۔

☆ جب دو ریاستیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑی ہوں تو ان دونوں کی اقلیتوں کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کی اقلیتوں کو یرغمال بنانے کا طریقہ جاری ہو جائے اور سزا دینے اور بدلہ لینے کی کارروائیاں ہونے لگیں۔ اس وجہ سے پاکستان کی اسکیم مسلمانوں کے کسی مسئلے کا حل پیش نہیں کرتی۔ یہ اسکیم ان علاقوں میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کر سکتی جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے شہری ہونے کے ناتے انہیں ہندوستانی یا عالمی امور میں وہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی جو وہ انڈین یونین جیسی کسی بڑی ریاست کے شہری بن کر حاصل کر سکتے ہیں۔

☆ یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ اگر پاکستان خود مسلمانوں کے مفاد کے لیے اس قدر مضر ہے تو

مسلمانوں کی اتنی تعداد اس کے فریب حسن میں کیونکر مبتلا ہو گئی ہے؟ اس کا جواب ہمیں بعض انتہا پسند فرقہ پرست ہندوؤں کے رویے میں ملتا ہے۔ جب مسلم لیگ نے پاکستان کی گفتگو چھیڑی تو ہندوؤں کو اس میں اتحاد اسلامی کی ایک ناپاک سازش نظر آنے لگی اور انہوں نے اس خوف کے زیر اثر اس کی مخالفت شروع کر دی کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں اور مسلم ریاستوں کے درمیان جتھے بندی کا پیش خیمہ ہے۔

☆ اس مخالفت نے لیگ کے حامیوں کو اور اکسایا اور انہوں نے ایک سیدھے سادے مگر نامعقول منطقی استدلال سے کام لے کر یہ کہا کہ چونکہ ہندو اس قدر شدت سے پاکستان کی مخالفت کر رہے ہیں اس لیے یقیناً اس میں مسلمانوں کا فائدہ ہوگا۔ اس طرح جذباتی ہیجان کی ایسی فضا پیدا ہو گئی جس میں سوچ سمجھ کر اچھے برے کے درمیان تمیز کرنا ناممکن ہو گیا اور مسلمانوں کا نوجوان اور اثر پذیر طبقہ خاص طور پر جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ لیکن مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جب موجودہ جنونی کیفیت ختم ہو جائے گی اور اصل مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جا سکے گا تو جو لوگ اس وقت پاکستان کی حمایت کر رہے ہیں، وہ خود ہی اس کو مسلم مفادات کے لیے مضر ٹھہرا کر اس سے منہ پھیر لیں گے۔

☆ میں نے کانگریس کو جو فارمولا قبول کرنے پر راضی کر لیا ہے اس میں پاکستان کی اسکیم کے تمام فوائد حاصل ہو جائیں گے اور اس اسکیم میں موجودہ تمام خامیاں اور خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ پاکستان کی بنیاد مسلم اکثریت کے علاقوں میں مرکز کی مداخلت کا خوف ہے کیونکہ مرکز میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی۔ کانگریس اس خوف کو اس طرح دور کرتی ہے کہ صوبوں کو مکمل خود مختاری دی جائے گی اور جو اختیارات مرکز کو نہ دیے جائیں گے وہ بھی صوبوں کو حاصل ہوں گے۔ اس نے مرکزی معاملات کی دو فہرستیں رکھی ہیں، ایک لازمی اور دوسری اختیاری۔ اس طرح اگر کوئی صوبہ چاہے تو ماسوائے ان اختیارات کے جو مرکز کے سپرد کیے جائیں گے اور کم سے کم ہوں گے، باقی تمام اختیارات اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اس بنا پر کانگریس کی اسکیم کے ذریعے اس بات کو یقینی بنایا گیا ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو داخلی معاملات میں مکمل آزادی حاصل ہو تا کہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ترقی کی تدبیریں کریں اور اس کے ساتھ ان معاملوں میں، جن کا تعلق پورے ہندوستان سے ہے، مرکز پر اپنا اثر ڈال سکیں۔

☆ ہندوستان کی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ یہاں اختیارات کی مرکزیت پر مبنی وحدانی حکومت قائم کرنے کی ہر کوشش یقیناً ناکام ہو کر رہے گی۔ ٹھیک اسی طرح ہندوستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی کوشش بھی ناکام ہوگی۔ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مسائل کا حل صرف اس طریقے پر ممکن ہے جو کانگریس کے فارمولے میں پیش کیا گیا ہے اور جس میں صوبوں اور پورے ہندوستان کی ترقی کی گنجائش ہے۔ کانگریس کا فارمولا مسلم اکثریت کے علاقوں کے اس خوف کو دور کرنے کے لیے بالکل کافی اور مناسب ہے جس کی وجہ سے پاکستان کی اسکیم بنائی گئی ہے۔ دوسری طرف اس میں پاکستان کی اسکیم کی خرابیاں نہیں ہیں جس کی بدولت وہ مسلمان، جو اقلیتی صوبوں میں ہیں، خالص ہندو حکومت کے ماتحت ہو جائیں گے۔

☆ میں ان لوگوں سے ہوں جو فرقہ وارانہ تلخی اور اختلافات کی موجودہ کیفیت کو ہندوستانی زندگی کا ایک عارضی مرحلہ سمجھتے ہیں۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ جب ہندوستان پر اپنے مستقبل کی ذمے داری آ جائے گی تو

یہ اختلافات اس وقت دور ہو جائیں گے۔ اس وقت مجھے مسٹر گلیڈ اسٹون کا یہ مقولہ یاد آ رہا ہے کہ جو شخص پانی سے ڈرتا ہو اس کا سب سے اچھا علاج یہ ہے کہ اسے پانی میں پھینک دیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح اندیشوں اور خدشوں کو دور کرنے کے لیے ہندوستان کو اپنے معاملات کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھوں میں لینا ہوگا۔

☆ جب ہندوستان اپنی قسمت کا مالک ہو جائے گا تو وہ فرقہ وارانہ بدگمانی اور کشمکش کی موجودہ کیفیت کو بالکل بھول جائے گا اور دور جدید کی زندگی کے مسائل کا جدید نقطۂ نظر سے سامنا کرے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اختلافات موجود رہیں گے لیکن یہ اختلافات فرقہ وارانہ نہیں، معاشی ہوں گے۔ سیاسی جماعتوں کی باہمی آویزش جاری رہے گی مگر اس کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ اقتصادی اور سیاسی مسائل پر ہوگی۔ مستقبل کی جماعت بندی طبقہ واری ہوگی، فرقہ وارانہ نہیں ہوگی اور اسی لحاظ سے پالیسیاں تشکیل دی جائیں گی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ محض ایک عقیدہ ہے جو ممکن ہے بعد کے واقعات سے درست ثابت نہ ہو تو میں اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان کے ۹ کروڑ مسلمان بہرحال ایک اہم عنصر ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور حالات جیسے بھی ہوں، ان کے پاس اس قدر طاقت موجود ہے کہ اپنی منزل اور مستقبل کو محفوظ رکھ سکیں۔

۱۹۳۹ میں جب قرارداد لاہور، جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی، منظور ہوئی تو لیگ تقسیم کے راستے پر آگے بڑھ چکی تھی البتہ اس نے یہ بات پوری طرح واضح نہیں کی تھی کہ اس کا اصل مطالبہ کیا ہے؟ قرارداد کے الفاظ مبہم تھے اور اس کی کئی تاویلیں کی جا سکتی تھیں۔ بہرحال اس کا عمومی منشا صاف تھا۔ مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو مکمل خود مختاری دی جائے۔ سر سکندر حیات خان نے قرارداد کی تائید کرتے ہوئے اس کی یہی تاویل کی تھی مگر اب لیگ کے لیڈروں نے اپنے مطالبے کے معنی میں بہت زیادہ وسعت پیدا کر دی تھی۔ وہ ملک کی تقسیم اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی ایک خود مختار ریاست کے قیام کی باتیں کرنے لگے تھے۔ کیبنٹ مشن ان کے اس مطالبے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس مشن ایک ایسے حل کے حق میں تھا جو کم و بیش میری تجویز کے مطابق تھا۔

گفتگو کا سلسلہ تقریباً آخر اپریل تک جاری رہا۔ مشن کے ساتھ ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور مشن کے ارکان بھی آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ اسی دوران مشن نے کام میں وقفہ کیا اور کشمیر چلا گیا۔ اب گرمی شروع ہو گئی تھی اور دہلی میں گرمی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا آرام کر لوں اور اس خیال سے کہ کشمیر جاؤں گا، وہاں کچھ دوستوں کو لکھ بھی دیا تھا۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ مشن کے ارکان کشمیر چلے گئے ہیں تو میں نے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا۔ میں نے سوچا کہ کشمیر میں میرے قیام کی یہ تعبیر کی جا سکتی ہے کہ میں مشن کے ساتھ رابطہ رکھنا اور اس کی رائے پر اثر ڈالنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ میں مسوری چلا گیا۔

مشن کے ارکان ۲۴ اپریل کو واپس دہلی آ گئے اور وائسرائے کے ساتھ ہونے والی گفتگو کی روشنی میں آئینی معاملات کا جائزہ لیتے رہے۔ کئی مرتبہ بحث مباحثہ کرنے کے بعد سر اسٹیفرڈ کرپس ان مسائل پر غیر رسمی

گفتگو کے لیے میرے پاس آئے جو اس دوران پیدا ہو گئے تھے۔ ۲۷ اپریل کو مشن نے یہ بیان جاری کیا کہ بڑی پارٹیوں کے درمیان باہمی رضامندی سے معاہدہ کرنے کے لیے مزید غیر رسمی بات چیت کرنا مناسب ہوگا۔ چنانچہ مشن نے کانگریس اور مسلم لیگ کے صدور کو دعوت دی کہ وہ مشن کے ساتھ شملہ میں گفتگو کرنے کے لیے اپنی اپنی ورکنگ کمیٹیوں کے نمائندے نامزد کر دیں۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لیے نمائندوں کو مقرر کرنے کا اختیار مجھے دے دیا۔ میں نے جواہر لعل اور سردار پٹیل کو اپنے رفقائے کار کی حیثیت سے کانگریس کی نمائندگی کرنے کے لیے نامزد کر دیا۔ شملہ میں ہمارے قیام کا انتظام حکومت نے کیا۔ گاندھی جی باضابطہ مذاکرات کرنے والوں میں شامل نہیں تھے تاہم مشن نے انہیں شملہ آنے کی دعوت دے دی تا کہ ضرورت کے وقت ان سے مشورہ کیا جا سکے۔ انہوں نے مشن کی دعوت قبول کر لی اور آ کر مینور ولا میں ٹھہر گئے۔ ہم وہاں ورکنگ کمیٹی کے غیر رسمی اجلاس کرتے رہے تا کہ گاندھی جی بھی ان میں شریک ہو سکیں۔

۲ مئی کو شملہ میں گفتگو شروع ہوئی اور ۱۲ مئی تک جاری رہی۔ باضابطہ کانفرنس کے علاوہ ہم نے بہت سی غیر رسمی بحثیں بھی کیں۔ میرا قیام Retreat میں تھا اور مشن کے ممبر کئی موقعوں پر مجھ سے ملنے وہاں آتے۔

کوئی دو ہفتوں کے بعد ہم دہلی واپس آ گئے۔ کیبنٹ مشن کے ارکان نے آپس میں مزید گفتگو کے بعد اپنی تجویزیں مرتب کر لیں جن کا اعلان مسٹر ایٹلی نے ۱۶ مئی کو دارالعوام میں کر دیا۔ پلان کی وضاحت کے لیے ایک قرطاسِ ابیض بھی شائع کیا گیا اور یہ بیان کیا گیا کہ ہندوستان کا نیا دستور جلد سے جلد تیار کرنے کے لیے برطانوی کیبنٹ مشن اس انتظام کو سب سے زیادہ موزوں سمجھتا ہے۔ میں نے کیبنٹ مشن پلان کو ضمیمہ (نمبر ۵) میں شامل کر دیا ہے اور دلچسپی رکھنے والے قارئین میری اس اسکیم کے ساتھ اس کا موازنہ کر سکتے ہیں جسے میں نے ۱۵ اپریل کے بیان میں پیش کیا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ کیبنٹ مشن پلان پر گفتگو کا سلسلہ شملہ میں جاری رکھا جائے۔ میں نے لارڈ ویول سے کہا کہ ہمارا شملہ میں اپنی گفتگو کو مکمل کر لینا ہی بہتر ہوگا اس لیے کہ دہلی کا موسم زیر بحث مسائل پر ٹھنڈے دل اور فکر و احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ لارڈ ویول نے کہا کہ حکومت کا مرکز دہلی میں ہے اور اگر وہ زیادہ عرصے کے لیے دہلی سے دور رہے تو کام میں حرج ہو سکتا ہے۔ اس پر میں نے یہ کہا کہ دہلی میں ان کے لیے کوئی دقت نہیں ہوتی اس لیے کہ وائسریگل لاج ائر کنڈیشنڈ ہے اور انہیں باہر نکلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی البتہ کیبنٹ مشن کے ارکان اور ہماری صورت کچھ اور ہے۔ دہلی کی کیفیت ایک بھٹی کی سی ہو گئی ہے اور ہمارے لیے اس میں کام جاری رکھنا بہت دشوار ہوگا۔ لارڈ ویول نے جواب دیا کہ یہ صرف چند دنوں کی بات ہے۔

کیبنٹ مشن اور اس کا پلان کم تکلیف دہ نہیں تھا کہ کشمیر میں رونما ہونے والے واقعات نے ایک اور دردسری کا اضافہ کر دیا۔ نیشنل کانفرنس شیخ عبداللہ کی قیادت میں کشمیری عوام کے سیاسی حقوق کی جنگ لڑ رہی تھی۔ اس نے کشمیر چھوڑ دو کا نعرہ لگایا اور اپنا مقدمہ کیبنٹ مشن کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ کشمیر کا مہاراجا شخصی حکومت کو ختم کر کے عوام کی خود مختار حکومت قائم کرے۔ مہاراجا کی حکومت نے اس کے جواب میں شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے نیشنل کانفرنس کے ایک نمائندے کو حکومت میں شامل کر لیا گیا تھا اور بظاہر ایک سمجھوتے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے لیکن شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری سے تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔

جواہر لعل کو کشمیر میں نمائندہ حکومت کے قیام کی جدوجہد سے ہمیشہ گہری دلچسپی تھی۔ جب یہ واقعات رونما ہوئے تو انہوں نے سوچا کہ انہیں کشمیر جانا چاہیے۔ یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے قانونی دفاع کا کوئی انتظام ہونا چاہیے۔ میں نے آصف علی سے کہا کہ وہ اس کام کو سنبھال لیں۔ جواہر لعل نے کہا کہ وہ بھی آصف علی کے ہمراہ جائیں گے اور اس طرح وہ دونوں روانہ ہو گئے۔ مہاراجا کی حکومت اس فیصلے سے مشتعل ہو گئی اور ان کے کشمیر میں داخلے پر پابندی لگا دی گئی۔ جب یہ لوگ راولپنڈی سے چل کر کشمیر کی سرحد پر پہنچے تو انہیں اڑی کے مقام پر روک لیا گیا۔ انہوں نے پابندی کے حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیا اور کشمیر کی حکومت نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اس کارروائی سے ملک میں فطری طور پر زبردست ہیجان پیدا ہو گیا۔

یہ واقعات میرے لیے کچھ خوشی کا باعث نہ تھے۔ مجھے ایک طرف کشمیر کی حکومت کی اس کارروائی پر غصہ آ رہا تھا اور دوسری طرف میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ کشمیر کے متعلق ایک نیا تنازع کھڑا کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے وائسرائے کے ساتھ اس بارے میں گفتگو کی اور کہا کہ ہندوستان کی حکومت کو یہ انتظام کر دینا چاہیے کہ میں ٹیلی فون پر جواہر لعل سے بات کر سکوں۔

جواہر لعل ایک ڈاک بنگلے میں نظر بند تھے۔ کچھ دیر کے بعد میرا ان سے ٹیلی فون پر رابطہ ہو گیا۔ میں نے جواہر لعل سے کہا کہ میری رائے ہے کہ انہیں جس قدر جلد ممکن ہو، دہلی واپس آ جانا چاہیے۔ موجودہ حالات میں ان کا کشمیر میں داخل ہونے پر اصرار کرنا مناسب نہیں۔ جہاں تک کشمیر کے مسئلے کا تعلق ہے، میں نے انہیں کانگریس کے صدر کی حیثیت سے یقین دلایا کہ میں اس معاملے کو خود اپنے ہاتھ میں لوں گا۔ میں شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کی رہائی کے لیے بھی کارروائی کروں گا لیکن جواہر لعل کو فوراً واپس آ جانا چاہیے۔

جواہر لعل نے پہلے عذر کیا لیکن کچھ بحث کے بعد میری اس یقین دہانی پر کہ میں کشمیر کے نصب العین کو اپنے ہاتھ میں لے لوں گا، وہ واپس آنے پر راضی ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے لارڈ ویول سے درخواست کی

کہ وہ جواہر لعل اور آصف علی کو واپس لانے کے لیے ایک ہوائی جہاز کا انتظام کریں۔ جب میں نے یہ درخواست کی، اس وقت شام کے سات بج چکے تھے مگر انہوں نے اسی رات ایک ہوائی جہاز بھیج دیا جو رات دس بجے سری نگر پہنچ گیا اور جواہر لعل اور آصف علی کو لے کر صبح دو بجے واپس آ گیا۔ اس پورے قصے میں لارڈ ویول کا رویہ انتہائی دوستانہ رہا اور مجھے ان کا یہ طرز عمل بہت پسند آیا۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ کیبنٹ مشن نے اپنی اسکیم ۱۶ مئی کو شائع کر دی تھی۔ بنیادی طور پر یہ اسکیم وہی تھی جس کا خاکہ میرے ۱۵ اپریل کے بیان میں درج تھا۔ کیبنٹ مشن پلان میں یہ کہا گیا کہ صرف تین محکمے لازمی طور پر مرکزی حکومت کے پاس رہیں گے۔ یہ محکمے تھے دفاع، خارجہ امور اور مواصلات، جنہیں میں نے اپنی اسکیم میں تجویز کیا تھا البتہ مشن نے ایک نئے عنصر کو پلان میں شامل کر لیا۔ اس نے پورے ملک کو اے، بی اور سی تین زونوں میں تقسیم کر دیا کیونکہ مشن کے ارکان یہ محسوس کرتے تھے کہ اس سے اقلیتوں میں زیادہ اطمینان اور اعتماد پیدا ہو گا۔ پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبے اور برٹش بلوچستان کو بی زون میں شامل کیا گیا۔ یہ مسلم اکثریت کے علاقے تھے۔ زون سی بنگال اور آسام پر مشتمل تھا جہاں مسلمانوں کو دوسروں کے مقابلے میں معمولی اکثریت حاصل تھی۔ کیبنٹ مشن کا خیال تھا کہ یہ انتظام مسلم اقلیت کو مکمل طور پر مطمئن کر دے گا اور لیگ کے تمام جائز خدشے دور ہو جائیں گے۔

مشن نے میری اس رائے کو بھی تسلیم کر لیا کہ بیشتر امور صوبوں کے اختیار میں ہوں گے۔ اس طرح مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو مکمل خود مختاری مل جائے گی اور صرف چند امور کو متفقہ طور پر علاقائی نظام کے ماتحت رکھا جائے گا۔ اس لحاظ سے بھی سیکشن بی اور سی میں مسلمانوں کی اکثریت یقینی تھی اور وہ اپنی تمام تر توقعات پوری کر سکتے تھے۔ جہاں تک مرکز کا تعلق تھا، اس کے پاس صرف تین محکمے تھے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے صوبوں کے انتظام میں نہیں دیے جا سکتے تھے۔ چونکہ کیبنٹ مشن پلان میں صرف میری اسکیم کی روح کارفرما تھی اور اس میں صرف تین زونوں کے قیام کا اضافہ کیا گیا تھا اس لیے میں نے محسوس کیا کہ ہمیں اس اسکیم کو منظور کر لینا چاہیے۔

مسٹر جناح نے شروع شروع میں اس اسکیم کی بھرپور مخالفت کی۔ مسلم لیگ ایک الگ اور خود مختار ریاست کے مطالبے میں اس قدر آگے نکل چکی تھی کہ اب اس کی واپسی ناممکن ہو گئی تھی۔ مشن نے بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان کی تقسیم اور ایک آزاد ریاست کے قیام کی ہرگز سفارش نہیں کرے گا۔ لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفرڈ کرپس بار بار یہ کہہ چکے تھے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان جیسی ریاست، جو مسلم لیگ کا مطمع نظر ہے، کیسے قابل عمل اور مستحکم ہو سکتی ہے؟ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مسئلے کو

حل کرنے کا واحد طریقہ میرا فارمولا ہے جس کے مطابق صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری حاصل ہوگی اور مرکزی حکومت کے لیے صرف تین امور مخصوص ہوں گے۔ لارڈ پیتھک لارنس نے ایک مرتبہ نہیں کئی بار کہا کہ میرے فارمولے کو منظور کر لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلم اکثریت کے صوبے شروع میں صرف تین امور کو مرکزی حکومت کے حوالے کریں گے اور اس طرح انہیں اپنی مکمل خودمختاری کا یقین ہو جائے گا۔ دوسری طرف ہندو اکثریت کے صوبے مرکزی حکومت کو رضا کارانہ طور پر کئی اور معاملے منتقل کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔ کیبنٹ مشن کا خیال تھا کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ کسی بھی حقیقی فیڈریشن میں شامل یونٹوں کو یہ طے کرنے کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ کس قدر اور کس نوعیت کے اختیارات مرکزی حکومت کو تفویض کریں گے۔

مسلم لیگ کونسل تین روز تک اجلاس کرنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر پائی۔ اجلاس کے آخری دن مسٹر جناح کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اقلیتوں کے مسئلے کا جو حل کیبنٹ مشن پلان میں پیش کیا گیا ہے، اس سے زیادہ منصفانہ کوئی اور فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کونسل سے کہا کہ کیبنٹ مشن نے جو اسکیم پیش کی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ ہے جسے وہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس بنیاد پر انہوں نے مسلم لیگ کو مشورہ دیا کہ وہ اس اسکیم کو منظور کر لے۔ چنانچہ کونسل نے متفقہ طور پر اس کے حق میں رائے دے دی۔

میں میسوری میں ہی تھا کہ مسلم لیگ کے بعض ارکان نے مجھ سے ملاقات کر کے اپنی حیرت اور تعجب کی کیفیت مجھ سے بیان کی۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ اگر لیگ کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرنے کے لیے تیار ہے تو اس نے ایک آزاد ریاست کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کو کیوں گمراہ کیا؟ میں نے ان لوگوں کے ساتھ تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر تبادلہ خیالات کیا۔ آخر میں انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ مسلم لیگ کا نقطہ نظر جو بھی ہو، ہندوستان کے مسلمانوں کو کیبنٹ مشن پلان سے بہتر شرائط کی توقع نہیں ہونی چاہیے تھی۔

میں نے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ہونے والے مباحث کے دوران واضح کیا کہ کیبنٹ مشن پلان بنیادی طور پر میری وہی اسکیم ہے جس کی کانگریس منظوری دے چکی ہے۔ اس طرح کانگریس کو پلان کے بنیادی سیاسی حل کو منظور کرنے میں کچھ زیادہ دشواری پیش نہ آئی البتہ دولت مشترکہ کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کا سوال ابھی حل طلب تھا۔ میں نے مشن سے کہا تھا کہ وہ اس کا فیصلہ ہندوستان پر چھوڑ دے۔ مجھے یقین تھا کہ ہم صرف اسی طریقے سے صحیح فیصلہ کر سکیں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میرا خیال ہے کہ اگر یہ سوال ہندوستان پر چھوڑ دیا گیا تو ممکن ہے کہ وہ دولت مشترکہ میں بدستور شامل رہنے کا فیصلہ کر لے۔ سر اسٹیفرڈ کرپس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا ہی کیا جائے گا۔ اس طرح کیبنٹ مشن پلان میں یہ معاملہ آزاد ہندوستان پر چھوڑ دیا گیا۔ اس وجہ سے بھی ہمیں کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرنے میں آسانی ہو گئی۔ طویل بحث مباحثے کے

بعد ورکنگ کمیٹی نے ۲۶ جون کی قرارداد میں کیبنٹ مشن پلان کو مستقبل کے لیے منظور کر لیا البتہ وہ عبوری حکومت کی تجویز کو منظور نہ کر سکی۔

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لینا ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کا ایک شاندار واقعہ تھا۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستان کی آزادی کا پیچیدہ مسئلہ مذاکرات اور مفاہمت کے ذریعے طے ہوا نہ کہ تشدد اور لڑائی کے ذریعے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ فرقہ وارانہ مشکلات قطعی طور پر ماضی کی داستان بن گئی ہیں۔ پورے ملک میں شادمانی کا احساس تھا اور سب لوگ آزادی کے مطالبے میں متحد ہو گئے تھے۔ ہم خوشیاں منا رہے تھے مگر اس وقت ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہماری خوشیاں قبل از وقت ہیں اور تقدیر ہمیں مایوسی کا کڑوا گھونٹ پلانے والی ہے۔

بارھواں باب

تقسیم ہند کا پیش خیمہ

سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل حل ہوتے نظر آ رہے تھے کہ مجھے ایک نئے مسئلے کی طرف توجہ کرنا پڑی۔ میں ۱۹۳۹ میں کانگریس کا صدر منتخب ہوا تھا۔ کانگریس کے دستور کے مطابق میرے عہدے کی میعاد صرف ایک سال تھی۔ معمول کے حالات میں ۱۹۴۰ میں نئے صدر کا انتخاب عمل میں آنا چاہیے تھا لیکن اسی اثنا میں جنگ چھڑ گئی جس کے بعد انفرادی ستیہ گرہ تحریک کا آغاز ہو گیا۔ ہماری معمول کی سرگرمیاں معطل ہو گئیں اور ہمیں ۱۹۴۰ اور پھر ۱۹۴۲ میں گرفتار کر لیا گیا۔ کانگریس کو بھی غیر قانونی تنظیم قرار دے دیا گیا۔ ان حالات میں میرے بعد نئے صدر کے انتخاب کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اور میں اس پورے عرصے میں صدر کے فرائض انجام دیتا رہا۔

اب حالات معمول پر آ گئے تھے اس لیے قدرتی طور پر سوال پیدا ہوا کہ کانگریس کے نئے الیکشن کرائے جائیں اور ایک نئے صدر کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ جیسے ہی اخبارات میں یہ سوال اٹھایا گیا، لوگوں نے یہ مطالبہ کر دیا کہ مجھے اگلی مدت کے لیے دوبارہ صدر منتخب کیا جائے۔ میرے دوبارہ انتخاب کے حق میں سب سے بڑی یہ دلیل پیش کی گئی کہ کرپس، لارڈ ویول اور اس وقت کیبنٹ مشن کے ساتھ مذاکرات میں نے ہی کیے تھے اور گو شملہ کانفرنس فرقہ وارانہ اختلافات کے باعث ناکام ہو گئی تھی، اس کے باوجود سیاسی مسئلے کا حل تلاش کرنے میں پہلی مرتبہ مجھے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ کانگریس کے اندر عام خیال یہ تھا کہ چونکہ اب تک ہر گفتگو میری ہی رہنمائی میں اور میری ذمے داری پر ہوئی تھی اس لیے ان مذاکرات کی کامیاب تکمیل اور تعمیل کا کام بھی میرے ہی سپرد ہونا چاہیے۔ بنگال، بمبئی، مدراس، بہار اور یو پی کے کانگریسی حلقوں میں کھلم کھلا یہ رائے ظاہر کی جا رہی تھی کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کو میری ہی قیادت میں کامیابی سے ہمکنار ہونا چاہیے۔

لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ کانگریس ہائی کمان کے داخلی حلقوں کی رائے بالکل مختلف ہے۔ میں نے دیکھا کہ سردار پٹیل اور ان کے دوستوں کی خواہش ہے کہ انہیں کانگریس کا صدر منتخب کیا جائے۔ میرے لیے یہ ایک بہت ہی نازک معاملہ ہو گیا اور شروع میں میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں اس معاملے کے تمام پہلوؤں کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ چونکہ میں ۱۹۳۹ سے لے کر ۱۹۴۶ تک سات سال صدر رہ چکا ہوں اس لیے اب مجھے ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں صدارت کے لیے اپنا نام تجویز کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔

مجھے دوسری بات یہ طے کرنا تھی کہ میرا جانشین کون ہو؟ مجھے اس کی فکر تھی کہ میرے بعد منتخب ہونے والا صدر میرے نقطہ نظر سے متفق ہو اور میری پالیسی پر کاربند رہے۔ میں نے اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر گہرے غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ موجودہ حالات میں سردار پٹیل موزوں شخص ثابت نہیں ہو سکتے۔ میں نے تمام حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ جواہر لعل کو کانگریس کا نیا صدر ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ۲۶ اپریل ۱۹۴۶ کو ایک بیان میں ان کا نام صدارت کے لیے تجویز کر دیا اور کانگریس کے تمام ارکان سے اپیل کی کہ وہ انہیں متفقہ طور پر صدر منتخب کر لیں۔

☆ میں نے اس مسئلے میں اپنی عقل سلیم کے مطابق عمل کیا لیکن اس کے باوجود جو کچھ ہوا، اسے دیکھتے ہوئے مجھے خیال ہوتا ہے کہ شاید میری سیاسی زندگی کی یہ سب سے بڑی بھول تھی۔ اس نازک مرحلے پر میں نے کانگریس کی صدارت سے دستبردار ہونے کا جو فیصلہ کیا، مجھے اس پر ہمیشہ افسوس رہے گا۔ یہ ایک ایسی غلطی تھی جسے میں گاندھی جی کے لفظوں میں ہمالہ جیسی عظیم غلطی قرار دوں گا۔

میں نے دوسری غلطی یہ کی کہ جب میں نے خود انتخاب نہ لڑنے کا فیصلہ کر لیا تو میں نے سردار پٹیل کی حمایت نہ کی۔ ہمارے درمیان کئی معاملوں پر اختلافات موجود تھے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے میرے جانشین بنتے تو کیبنٹ مشن پلان پر کامیابی کے ساتھ عملدرآمد کراتے۔ وہ جواہر لعل کی اس غلطی کا ہرگز ارتکاب نہ کرتے جس کی وجہ سے مسٹر جناح کو کیبنٹ پلان کو سبوتاژ کرنے کا موقع ملا۔ مجھے جب بھی یہ خیال آتا ہے تو میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر پاتا کہ اگر میں یہ غلطیاں نہ کرتا تو شاید پچھلے دس برسوں کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ ☆

میرے بیان سے پورے ملک میں کانگریس کے اندر ہلچل مچ گئی۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے کئی ممتاز لیڈر میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں اپنا بیان واپس لے کر اپنا نام پیش کرنے کی اجازت دے دوں۔ اخبارات میں بھی اسی قسم کی اپیلیں شائع ہوئیں لیکن میں ایک فیصلہ کر چکا تھا اور مجھے اپنی رائے تبدیل کرنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی۔ میرے اس فیصلے کو گاندھی جی کے خیالات سے تقویت ملی جنھوں نے اس بارے میں میرے ساتھ اتفاق کیا کہ مجھے صدر کی حیثیت سے مزید کام نہیں کرنا چاہیے البتہ وہ میری اس رائے سے ناخوش تھے کہ جواہر لعل کو میرا جانشین ہونا چاہیے۔ غالباً ان کا جھکاؤ سردار پٹیل کی طرف تھا۔ لیکن جب میں نے جواہر لعل کا نام تجویز کر دیا تو انہوں نے ایسا کوئی عندیہ نہ دیا جس سے ظاہر ہوتا کہ انہیں میرا فیصلہ پسند نہیں۔ بعض لوگوں نے سردار پٹیل اور آچاریہ کرپلانی کے نام تجویز کیے تاہم بعد میں جواہر لعل متفقہ طور پر صدر منتخب کر لیے گئے۔

مسلم لیگ کونسل نے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرلیا تھا۔ اسی طرح کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی اس کی منظوری دے دی البتہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی منظوری ضروری تھی۔ ہم نے سوچا کہ یہ ایک رسمی کارروائی ہو گی کیونکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہمیشہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں کی توثیق کر دیتی تھی۔ چنانچہ ۷ جولائی ۱۹۴۶ کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بلا لیا گیا۔ جب ایک مرتبہ فیصلہ ہو گیا تو میں یہ سمجھا کہ میرا دہلی میں قیام کرنا ضروری نہیں ہے۔ دہلی میں گرمی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی اس لیے میں ۳۰ جون کو واپس کلکتہ آ گیا۔ ۴ جولائی کو میں کلکتے سے بمبئی روانہ ہو گیا۔ سرت چندر بوس بھی اسی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ تقریباً ہر اسٹیشن پر بہت سے لوگ جمع ہو جاتے۔ ان کا نعرہ یہ تھا کہ مجھے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کام جاری رکھنا چاہیے۔ سرت بابو تقریباً ہر بڑے اسٹیشن پر میرے ڈبے میں آتے اور بار بار یہ کہتے کہ دیکھئے پبلک کیا چاہتی ہے اور اس کے باوجود آپ نے کیا کیا ہے۔

۶ جولائی کو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور اس نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے غور کے لیے کئی قراردادوں کے مسودے تیار کر لیے۔ پہلی قرارداد کیبنٹ مشن پلان کے بارے میں تھی۔ قرارداد پیش کرنے کا کام میرے سپرد کیا گیا کیونکہ یہ توقع کی جا رہی تھی کہ کانگریس کا بائیں بازو کا گروپ اس کی شدید مخالفت کرے گا۔

جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا تو میں نے جواہر لعل سے کہا کہ وہ نئے صدر کی حیثیت سے میری جگہ صدارت کے منصب کو سنبھالیں۔ اس کے بعد میں نے کیبنٹ مشن پلان سے متعلق قرارداد اجلاس میں پیش کی اور اس کے اہم نکات کا مختصر تذکرہ کیا۔ بائیں بازو کے لوگوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ قرارداد کی مخالفت کی۔ کانگریس کے سوشلسٹ مخالفت میں پیش پیش تھے کیونکہ انتہا پسندی کا نقطہ نظر اختیار کر کے ہر دلعزیزی حاصل کرنے کا یہ ایک عامیانہ طریقہ بن گیا تھا۔ انہوں نے حقیقت کو پس پشت ڈال کر اداکاری کے انداز دکھانا شروع کر دیے۔ یوسف مہر علی ان دنوں سخت بیمار تھے مگر حاضرین کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے وہ انہیں اسٹریچر پر ڈال کر اجلاس میں لے آئے۔ انہوں نے بھی کیبنٹ مشن پلان کے خلاف تقریر کی۔

میں نے اپنی تقریر میں پلان کے امکانات اور نتائج کے بارے میں تفصیل کے ساتھ وضاحت کی اور کہا کہ یہ پلان دراصل کانگریس کی عظیم فتح ہے۔ میں نے کہا کہ یہ پلان تشدد اور خونریزی کے بغیر آزادی کے حصول کی واضح علامت ہے۔ برطانیہ کا ہندوستان کے قومی مطالبے کو تسلیم کر لینا، جبکہ پرامن ایجی ٹیشن اور مذاکرات کے سوا کوئی اور ذریعہ اختیار نہیں کیا گیا، ایک ایسا واقعہ ہے جس کی دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ چالیس کروڑ کی ایک قوم فوجی اقدامات کے ذریعے نہیں بلکہ بات چیت اور مفاہمت کے ذریعے آزاد ہو رہی ہے۔ اگر صرف اسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اپنی کامیابی کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہ لگانا بہت بڑی

حماقت ہوگی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کیبنٹ مشن پلان میں کانگریس کے تمام اہم اصولوں کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس پلان میں ہندوستان کے اتحاد کی ضمانت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے حقوق کی یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ کانگریس ہندوستان کی آزادی اور اتحاد کی حمایت اور انتشار پیدا کرنے والے رجحانات کی مخالفت کرتی رہی ہے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کانگریسی سوشلسٹوں جیسے لوگ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے فتح حاصل نہیں کی، شکست کھائی ہے۔

میری تقریر کا حاضرین پر فیصلہ کن اثر پڑا اور جب رائے شماری کرائی گئی تو قرارداد بھاری اکثریت کے ساتھ منظور کر لی گئی۔ اس طرح ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن پلان کو قبول کرنے کے فیصلے پر مہر ثبت کر دی۔

چند دنوں کے بعد مجھے لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفرڈ کرپس کی جانب سے مبارکباد کے ٹیلی گرام موصول ہوئے۔ انہوں نے کانگریس کی طرف سے قرارداد منظور کرنے پر خوشی ظاہر کی اور مجھے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ میں نے کیبنٹ مشن پلان کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اب ان افسوسناک واقعات میں سے ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہماری سیاست اور زندگی کا رخ موڑ دیا۔ ۱۰ جولائی کو جواہر لعل نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس بلائی ☆ جس میں انہوں نے ایک حیرت انگیز بیان دے دیا۔ بعض اخباری نمائندوں نے ان سے سوال کیا کہ کیا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس قرارداد کو منظور کرنے کے معنی یہ ہیں کہ کانگریس نے پلان کو عبوری حکومت کی تشکیل سمیت بجنسہٖ تسلیم کر لیا ہے؟ ☆

جواہر لعل نے جواب میں کہا کہ کانگریس دستور ساز اسمبلی میں شرکت کرتے ہوئے اپنے آپ کو معاہدوں کی پابند نہیں سمجھے گی اور جس قسم کے حالات پیدا ہوں گے، ان کے مطابق آزادی کے ساتھ فیصلے کرے گی۔

پریس کے نمائندوں نے مزید استفسار کیا کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم کی جا سکتی ہے؟

جواہر لعل نے پرزور طریقے سے کہا کہ کانگریس نے محض دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی ہے اور وہ خود کو کیبنٹ مشن پلان میں مناسب تبدیلی یا کمی بیشی کرنے کی مجاز سمجھتی ہے۔

☆ مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو بادل نخواستہ قبول کیا تھا اور مسٹر جناح اس سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کونسل سے خطاب کرتے ہوئے پوری وضاحت کے ساتھ کہا تھا کہ وہ پلان کو منظور کر لینے کی سفارش محض اس لیے کر رہے ہیں کہ اس سے بہتر چیز حاصل نہیں کی جا سکتی۔ ان کے سیاسی حریفوں نے پلان کی منظوری پر ان پر نکتہ چینی شروع کر دی اور کہا کہ وہ بہتر نتائج حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ انہوں نے مسٹر جناح پر الزام لایا کہ وہ خود مختار اسلامی ریاست کے مطالبے سے دستبردار ہو گئے ہیں۔ مخالفین انہیں طعنے دینے لگے کہ اگر لیگ کیبنٹ مشن پلان کو قبول کرنے پر رضامند تھی، جس میں مسلمانوں کو ایک الگ ریاست

بنانے کا حق نہیں دیا گیا تھا تو مسٹر جناح ایک آزاد اسلامی مملکت کے لیے غل غپاڑہ کیوں مچاتے رہے ہیں؟

اس طرح مسٹر جناح کیبنٹ مشن کے ساتھ ہونے والے مذاکرات کے نتائج سے مطمئن نہیں تھے۔ جواہر لعل کا بیان ان کے لیے ایک غیر متوقع حادثہ ثابت ہوا۔ انہوں نے فوری طور پر اس مضمون پر مبنی یہ بیان جاری کر دیا کہ کانگریس کے صدر کے اعلان کا تقاضا یہ ہے کہ پوری صورت حال کا ازسرنو جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے لیاقت علی خان سے کہا کہ لیگ کونسل کا اجلاس بلایا جائے۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ مسلم لیگ کونسل نے دہلی میں کیبنٹ مشن پلان کو اس لیے منظور کر لیا تھا کیونکہ ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ کانگریس نے بھی اس اسکیم کو مان لیا ہے اور ہندوستان کا اگلا دستور اسی پلان کی اساس پر تیار کیا جائے گا۔ اب جبکہ کانگریس کے صدر نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ کانگریس دستور ساز اسمبلی میں اکثریت کے ذریعے اس اسکیم کو تبدیل کر سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اقلیتوں کو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا۔ مسٹر جناح کا استدلال یہ تھا کہ جواہر لعل کے اعلان کے معنی یہ ہیں کہ کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان کو مسترد کر دیا ہے لہٰذا وائسرائے کو چاہیے کہ وہ مسلم لیگ کو، جس نے پلان منظور کیا ہے، حکومت بنانے کی دعوت دیں☆

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۲۷ جولائی کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ مسٹر جناح نے اپنی افتتاحی تقریر میں پاکستان کے مطالبے کو دہرایا اور کہا کہ مسلم لیگ کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے۔ تین دن کی بحث کے بعد کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کیبنٹ مشن پلان کو مسترد کر دیا گیا۔ کونسل نے پاکستان حاصل کرنے کے لیے راست اقدام کا بھی فیصلہ کیا۔

میں اس نئی صورت حال سے سخت پریشان ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ جس اسکیم کے لیے میں نے انتھک جدوجہد کی تھی، وہ خود ہمارے ہاتھوں برباد ہو رہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ معاملے کی موجودہ صورت پر غور کرنے کے لیے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس فوراً طلب کرنا چاہیے۔ جواہر لعل شروع میں اجلاس بلانے پر آمادہ نہیں تھے لیکن جب میں نے اصرار کیا تو وہ مان گئے۔ چنانچہ ۸ اگست کو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں مجموعی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا گیا۔ میں نے کہا کہ اگر ہم صورت حال کو بگڑنے سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ واضح کر دینا چاہیے کہ کانگریس کے صدر نے بمبئی میں پریس کانفرنس کے دوران جو بیان دیا تھا، وہ ان کی ذاتی رائے تھی جو کانگریس کے فیصلے سے مطابقت نہیں رکھتی۔ میں نے واضح کیا کہ کانگریس کی رائے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی قرارداد میں ظاہر کر دی گئی ہے اور کوئی شخص، چاہے وہ کانگریس کا صدر ہی کیوں نہ ہو، اس کو بدلنے کا مجاز نہیں ہے☆ جواہر لعل نے یہ رائے ظاہر کی کہ اگر ورکنگ کمیٹی یہ دہرانا چاہتی ہے کہ کیبنٹ مشن پلان کانگریس نے منظور کیا ہے تو انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا البتہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر ورکنگ کمیٹی

نے یہ قرارداد منظور کر لی کہ کانگریس کے صدر کا بیان کانگریس کی پالیسی کی نمائندگی نہیں کرتا تو اس سے پارٹی اور ذاتی طور پر انہیں سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا☆

ورکنگ کمیٹی اب بڑی مشکل میں پڑ گئی۔ ایک طرف کانگریس کے صدر کی عزت پر حرف آتا تھا اور دوسری طرف وہ سمجھوتا، جو اتنی مشکلوں سے حاصل کیا گیا، خطرے میں تھا۔ صدر کے بیان کی تردید کرنے سے کانگریس کمزور ہوتی لیکن کیبنٹ مشن پلان سے دستبردار ہونے سے پورا ملک تباہ ہو جاتا۔ آخر ہم نے ایک قرارداد کا مسودہ تیار کیا جس میں جواہر لعل کے بیان کا کوئی حوالہ نہ دیا گیا البتہ اس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے فیصلے کی درج ذیل الفاظ میں دوبارہ توثیق کی گئی:

ورکنگ کمیٹی کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے اپنے پچھلے فیصلے کو منسوخ کرتے ہوئے طے کیا ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی میں شریک نہیں ہوگی۔ ایسے دور میں جب ہم بیرونی حکومت کے تسلط سے نجات پا کر تیزی کے ساتھ مکمل آزادی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور جب ہمیں وسیع اور پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسئلوں کا سامنا کرنا اور انہیں حل کرنا ہے، ہندوستان کے عوام اور ان کے نمائندوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اشتراک عمل کی ضرورت ہے تاکہ یہ تبدیلی خوشگوار طریقے سے عمل میں آئے اور تمام متعلقہ لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے مقاصد اور نقطہ نظر میں اختلافات پائے جاتے ہیں، پھر بھی ملک کے اجتماعی مفاد اور ہندوستانی قوم کی آزادی کی خاطر کمیٹی ان تمام لوگوں سے اس امید کے ساتھ اشتراک عمل کی اپیل کرتی ہے جو ملک کی آزادی اور بہبود کے خواہاں ہیں کہ قومی فرائض کی ادائیگی میں اتحاد عمل سے ہندوستان کو درپیش بہت سے مسائل کو حل کرنے کی صورت نکل آئے گی۔

☆ کمیٹی نے اس بارے میں مسلم لیگ کے اعتراضات کو نوٹ کیا ہے جن کا منشا یہ دکھانا ہے کہ کانگریس نے ان تجویزوں کو، جو ۱۶ مئی کے بیان میں درج تھیں، مشروط طور پر قبول کیا تھا۔ کمیٹی اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اگرچہ وہ بیان میں درج تمام تجویزوں کو پسند نہیں کرتی اس کے باوجود اس نے اسکیم کو پورا پورا تسلیم کر لیا ہے۔ اس نے اس کی تشریح اس مقصد سے کی ہے کہ اسکیم میں جو تضادات نظر آتے ہیں انہیں دور کر دیا جائے اور ان اصولوں کی روشنی میں، جو حکومت کے بیان میں درج ہیں، ان باتوں کا ذکر کر دیا جائے جو غلطی سے نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ صوبائی خودمختاری کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ہر صوبے کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی گروپ میں شمولیت اختیار کرے یا اپنی الگ حیثیت برقرار رکھے۔ تشریح کے سلسلے میں جو سوالات پیدا ہوں گے ان کا فیصلہ اسی طریق کار کے مطابق کیا جائے گا جو بیان میں مقرر کیا گیا ہے۔ کانگریس دستور ساز اسمبلی میں اپنے نمائندوں کو ہدایت کرے گی کہ وہ اسی کے مطابق عمل کریں۔

☆ کمیٹی نے دستور ساز اسمبلی کی خودمختار حیثیت پر زور دیا ہے جس سے مراد اس کا یہ حق ہے کہ وہ کسی بیرونی طاقت یا اتھارٹی کی مداخلت کے بغیر ہندوستان کے لیے ایک دستور وضع کرے البتہ یہ ایک فطری بات ہے کہ وہ اپنے منصب کو ادا کرتے وقت ان داخلی حدود کا لحاظ رکھے گی جو اس کے عمل کے ساتھ وابستہ ہیں اس لیے

وہ آزاد ہندوستان کا دستور مرتب کرنے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرے گی اور اس کی گنجائش رکھے گی کہ ان تمام لوگوں کو، جن کے دعوے اور مفادات حق بجانب معلوم ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ آزادی اور اطمینان حاصل ہو۔ ورکنگ کمیٹی نے اسی مقصد کی خاطر اور اسی خواہش کے تحت کہ وہ دستور ساز اسمبلی میں بامل شرکت کرے اور اس کو کامیاب بنائے، ۲۶ جون ۱۹۴۶ کو ایک قرارداد منظور کی تھی اور ۷ جولائی ۱۹۴۶ کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اس کی توثیق کی تھی۔ کانگریس آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس فیصلے پر قائم ہے اور اسی کے مطابق دستور ساز اسمبلی میں کام کرے گی۔

☆ ورکنگ کمیٹی کو توقع ہے کہ مسلم لیگ اور تمام متعلقہ افراد پوری قوم اور خود اپنے مفاد کی خاطر اس عظیم کام میں شریک ہوں گے۔

ہمیں امید تھی کہ ورکنگ کمیٹی کی یہ قرارداد معاملے کو بگڑنے سے بچا لے گی۔ اب اس میں شک وشبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان کو پورا پورا منظور کر لیا ہے۔ اگر مسلم لیگ ہماری قرارداد کو تسلیم کر لیتی تو وہ اپنے وقار کو صدمہ پہنچائے بغیر اپنی پچھلی پوزیشن پر واپس آسکتی تھی مگر مسٹر جناح نے اس کو منظور نہ کیا اور کہا کہ جواہر لعل کا بیان ہی کانگریس کے ذہن کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر کانگریس اس قدر جلد جلد اپنی رائے بدل سکتی ہے جبکہ انگریز ابھی ملک میں موجود ہیں اور اس کے ہاتھوں میں اقتدار بھی نہیں آیا تو اقلیتیں کس بھروسے پر یہ یقین کر لیں کہ جب انگریز چلے جائیں گے تو کانگریس پھر بدل نہیں جائے گی اور اس کا نقطہ نظر وہی نہیں ہو جائے گا جو جواہر لعل نے اپنے بیان میں اختیار کیا ہے؟

ورکنگ کمیٹی کی طرف سے کیبنٹ مشن پلان کی غیر مبہم منظوری کا وائسرائے نے فوراً جواب دیا اور انہوں نے ۱۲ اگست کو ان الفاظ میں جواہر لعل کو مرکز میں عبوری حکومت بنانے کی دعوت دے دی:

☆ ہز ایکسی لینسی دی وائسرائے نے ہز میجسٹی کی حکومت کی منظوری سے کانگریس کے صدر کو دعوت دی ہے کہ وہ عبوری حکومت کے فوری قیام کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کریں اور صدر کانگریس نے اس دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو جلد ہی نئی دہلی آ کر ہز ایکسی لینسی دی وائسرائے کے ساتھ اس تجویز پر گفتگو کریں گے۔

مسٹر جناح نے اسی روز ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے کہا کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ۱۰ اگست کو وردھا میں جو قرارداد منظور کی ہے، اس سے کوئی بات نہیں بنتی کیونکہ یہ ان ہی خیالات کی تکرار ہے جن کا اظہار کانگریس شروع سے کرتی چلی آ رہی ہے۔ اب صرف الفاظ بدل گئے ہیں۔ انہوں نے عبوری حکومت میں تعاون کے سلسلے میں جواہر لعل کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد ۱۵ اگست کو جواہر لعل نے مسٹر جناح کے ساتھ ان کے مکان پر ملاقات کی لیکن ان کی گفتگو کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور صورت حال تیزی کے ساتھ خراب ہونے لگی۔

جولائی کے آخر میں جب مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو اس میں راست اقدام کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اجلاس میں مسٹر جناح کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ پروگرام پر عملدرآمد کے لیے جو اقدام مناسب سمجھیں، کریں۔ مسٹر جناح نے اعلان کیا کہ ۱۶ اگست ڈائریکٹ ایکشن کا دن ہوگا مگر انہوں نے یہ واضح نہ کیا کہ اس دن کا پروگرام کیا ہو گا؟ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس ضمن میں تفصیلات طے کرنے کے لیے مسلم لیگ کونسل کا ایک اور اجلاس ہوگا لیکن یہ اجلاس منعقد نہ ہوا۔ دوسری طرف میں نے کلکتے میں دیکھا کہ ایک عجیب وغریب صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے مخصوص دن منانے کے لیے سیاسی جماعتیں ہڑتال کیا کرتی تھیں، جلوس نکالتی تھیں اور جلسے کرتی تھیں لیکن لیگ کا راست اقدام کا دن کچھ اور ہی قسم کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کلکتے میں دیکھا کہ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگی ۱۶ اگست کو کانگریسیوں پر حملے کریں گے اور کانگریس کی املاک لوٹ لیں گے۔ بنگال کی حکومت نے ۱۶ اگست کو سرکاری چھٹی کا دن قرار دیا تو خوف و ہراس کی کیفیت میں اور اضافہ ہو گیا۔ بنگال اسمبلی میں کانگریس پارٹی نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا اور جب اس کا کوئی اثر نہ ہوا تو احتجاجاً واک آؤٹ کیا کہ حکومت نے ایک پارٹی کے فیصلے کو نافذ کرنے کے لیے پالیسی کے طور پر سرکاری مشینری کو استعمال کیا ہے۔ کلکتے میں بے اطمینانی اور پریشانی اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ وہاں مسلم لیگ کی حکومت تھی اور مسٹر ایس ایچ سہروردی وزیر اعلیٰ تھے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۹ اگست کو ایک پارلیمانی سب کمیٹی مقرر کی جو سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور مجھ پر مشتمل تھی۔ ۱۳ اگست کو سب کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ہم نے عبوری حکومت کے قیام کے سلسلے میں وائسرائے کو پیش کرنے کے لیے تجویز پر گفتگو کی۔ جواہر لعل نے پارلیمانی کمیٹی کا اجلاس ۱۷ اگست کو طلب کیا جس میں شرکت کے لیے میں ہوائی جہاز کے ذریعے ۱۶ اگست کو دہلی روانہ ہو گیا۔

۱۶ اگست ہندوستان کی تاریخ میں سیاہ ترین دن تھا۔ کلکتہ کے عظیم الشان شہر میں ہجوم کے تشدد نے، جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی، خوف، قتل اور لوٹ مار کا طوفان برپا کر دیا، سیکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں، ہزاروں افراد زخمی ہو گئے اور کروڑوں روپے کی املاک تباہ ہو گئیں۔ لیگ نے لوگوں کے جلوس نکالے جنہوں نے غارت گری اور آتشزنی کی وارداتیں شروع کر دیں اور بہت جلد پورے شہر پر مسلمان اور ہندو غنڈوں کا قبضہ ہو گیا۔

سرت چندر بوس گورنر کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ وہ صورت حال پر قابو پانے کے لیے فوری کارروائی کریں۔ انہوں نے گورنر کو یہ بھی بتایا کہ انہیں اور مجھے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی جانا ہے۔ گورنر نے ان سے کہا کہ وہ ہوائی اڈے تک ہماری حفاظت کے لیے فوجی دستے کا انتظام کر دیں گے۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور جب کوئی نہ آیا تو تن تنہا روانہ ہو گیا۔ سڑکیں سنسان تھیں اور شہر پر موت کا سناٹا چھایا

ہوا تھا۔ جب میں اسٹرینڈ روڈ سے گزر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے ٹھیلے والے اور چوکیدار لٹھ اٹھائے کھڑے ہیں۔ انہوں نے میری کار پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ میرے ڈرائیور نے چلّا کر کہا کہ یہ کانگریس کے صدر کی کار ہے لیکن انہوں نے اس کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ غرض میں بڑی مشکل سے ہوائی جہاز کی روانگی سے چند منٹ پہلے ڈم ڈم پہنچا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا فوجی دستہ ٹرکوں میں انتظار کر رہا ہے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ وہ امن و امان بحال کرنے میں مدد کیوں نہیں کر رہے تو انہوں نے جواب دیا کہ انہیں تیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن کچھ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ پورے شہر میں فوج اور پولیس تیار تھی لیکن وہ بے گناہ مردوں اور عورتوں کے قتل کا تماشا دیکھتی رہی۔

۱۶ اگست ۱۹۴۶ صرف کلکتے کے لیے ہی نہیں، پورے ہندوستان کے لیے سیاہ دن تھا۔ حالات نے جو پلٹا کھایا تھا، اس کی وجہ سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کے ذریعے مسائل کے پُر امن طریقے پر حل ہونے کی امید جاتی رہی۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ عظیم ترین المیہ تھا اور مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سانحے کی ذمے داری جواہر لعل پر عائد ہوتی ہے۔ ان کے اس افسوسناک بیان سے کہ کانگریس کو کیبنٹ مشن پلان میں ترمیم کا اختیار حاصل ہے، سیاسی اور فرقہ وارانہ تصفیے کا پورا سوال پھر کھڑا ہو گیا۔ مسٹر جناح نے جواہر لعل کی اس غلطی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور لیگ نے اس سے پہلے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ اس سے دستبردار ہو گئی۔

جواہر لعل میرے عزیز ترین دوست ہیں اور انہوں نے ہندوستان کی قومی زندگی میں جو حصہ لیا ہے وہ کسی سے کم نہیں۔ ☆ البتہ مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی طرف سے قومی نصب العین کو شدید نقصان پہنچانے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ انہوں نے ۱۹۳۷ میں بھی، جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ کے تحت پہلے الیکشن ہوئے تھے، اسی قسم کی حماقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کو بمبئی اور یوپی کے سوا ملک بھر میں زبردست ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ ☆

بنگال میں صوبے کے گورنر نے خاص طور پر لیگ کی حکومت بنانے کا تقریباً فیصلہ کر لیا تھا لیکن کریشک پرجا پارٹی کی کامیابی نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ پنجاب، سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبے جیسے مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی لیگ کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ بمبئی میں اس نے کئی نشستیں حاصل کر لیں لیکن اسے سب سے بڑی کامیابی یوپی میں ہوئی جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہاں لیگ کو جمعیت علمائے ہند کی حمایت حاصل تھی۔ جمعیت نے اس تاثر کے تحت لیگ کی حمایت کی تھی کہ انتخابات کے بعد مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ تعاون کرے گی۔

چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خان اس وقت یوپی میں مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ جب میں

وزارت بنانے کے سلسلے میں لکھنؤ گیا تو ان دونوں سے بھی گفتگو کی۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ نہ صرف کانگریس سے تعاون کریں گے بلکہ کانگریس کے پروگرام کی بھی بھرپور حمایت کریں گے۔ قدرتی طور پر ان کو امید تھی کہ نئی حکومت میں مسلم لیگ کو بھی شامل کیا جائے گا۔ مقامی حالات کچھ ایسے تھے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک حکومت میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ یا تو دونوں لیے جاتے یا دونوں چھوڑ دیے جاتے۔ میں نے انہیں امید دلائی کہ ان دونوں کو حکومت میں شامل کر لیا جائے گا۔ اگر وزارت صرف سات ارکان پر مشتمل ہوئی تو ان میں سے دو مسلم لیگی اور باقی سب کانگریسی ہوتے۔ اگر وزارت نو ارکان کی ہوتی تو کانگریس کی اکثریت میں اور اضافہ ہو جاتا۔ مجھ سے گفتگو کے بعد ایک نوٹ تیار کیا گیا جس میں لکھا گیا کہ مسلم لیگ پارٹی کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرے گی اور کانگریس کا پروگرام قبول کرے گی۔ نواب اسماعیل خان اور چودھری خلیق الزمان دونوں نے اس دستاویز پر دستخط کر دیے اور میں وزارت کے قیام کے سلسلے میں لکھنؤ سے پٹنہ روانہ ہو گیا۔

کچھ دنوں کے بعد میں واپس الٰہ آباد آیا تو مجھے یہ جان کر سخت افسوس ہوا کہ جواہر لعل نے چودھری خلیق الزمان اور نواب اسماعیل خان کو لکھ دیا ہے کہ ان دونوں میں سے صرف ایک کو وزارت میں شامل کیا جا سکے گا۔ انہوں نے مزید لکھا کہ یہ بات مسلم لیگ پارٹی طے کر سکتی ہے کہ ان میں سے کسے وزارت میں لیا جائے۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، صورت حال کچھ ایسی تھی کہ ان میں سے صرف ایک حکومت میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان دونوں نے معذرت کر دی اور لکھا کہ وہ جواہر لعل کی پیشکش کو قبول نہیں کر سکتے۔

یہ ایک نہایت افسوس ناک واقعہ تھا۔ اگر لیگ کی طرف سے تعاون کی پیشکش قبول کر لی جاتی تو مسلم لیگ پارٹی عملاً کانگریس میں مدغم ہو گئی ہوتی۔ جواہر لعل نے اپنے عمل سے یو پی میں لیگ کو ایک نئی زندگی بخش دی۔ ہندوستانی سیاست کے تمام طالب علم جانتے ہیں کہ مسلم لیگ کی تنظیم نو یو پی ہی میں ہوئی تھی۔ مسٹر جناح نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور جارحانہ اقدامات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جس کا آخری نتیجہ قیام پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوا۔

مجھے معلوم ہے کہ پرشوتم داس ٹنڈن نے ان تمام معاملات میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ مجھے ٹنڈن کے خیالات کبھی قابل لحاظ معلوم نہیں ہوئے اور میں نے جواہر لعل کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے موقف میں نرمی پیدا کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ مسلم لیگ کو وزارت میں شامل نہ کرنا ان کی بہت بڑی غلطی ہے۔ میں نے انہیں خبردار کیا کہ ان کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسلم لیگ میں نئی جان پڑ جائے گی اور اس طرح ہندوستان کی آزادی کی راہ میں نئی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ جواہر لعل نے مجھ سے اتفاق نہ کیا اور اپنے نقطہ نظر کو صحیح قرار دیا۔ انہوں نے یہ دلیل دی کہ مسلم لیگ کے صرف ۲۶ ممبر ہیں اور وہ کابینہ میں ایک

سے زیادہ نشست کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ جب میں نے دیکھا کہ جواہر لعل اپنی جگہ سے جنبش کرنے کے لیے تیار نہیں تو میں گاندھی جی سے مشورہ کرنے کے لیے وردھا چلا گیا۔ جب میں نے ان سے پوری صورت حال وضاحت کے ساتھ بیان کی تو انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا اور کہا کہ وہ جواہر لعل کو اپنے فیصلے میں مناسب ترمیم کرنے کی ہدایت کریں گے۔ میں یہ بات ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ جب جواہر لعل نے معاملے کو دوسرے رنگ میں پیش کیا تو گاندھی جی نے جواہر لعل کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور جواہر لعل پر اتنا زور نہ دیا جتنا دینا چاہیے تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یو پی میں مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتا نہ ہو سکا۔ مسٹر جناح نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور پوری لیگ کو کانگریس کا مخالف بنا دیا۔ انتخابات کے بعد مسٹر جناح کے کئی حامی انہیں چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن اب وہ ان کو دوبارہ اپنے حلقے میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جواہر لعل کی ۱۹۳۷ کی غلطی بہت بڑی تھی لیکن ۱۹۴۶ کی غلطی اس سے بھی زیادہ مہنگی پڑی۔ ان کے دفاع میں کہا جا سکتا ہے کہ انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ مسلم لیگ راست اقدام پر اتر آئے گی۔ مسٹر جناح عوامی تحریک کے کبھی قائل نہیں رہے۔ میں نے خود بھی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی کہ مسٹر جناح میں آخر یہ تبدیلی کس طرح ہو گئی؟ غالباً ان کو توقع تھی کہ جب مسلم لیگ کیبنٹ مشن پلان کو مسترد کر دے گی تو برطانوی حکومت پورے معاملے پر از سر نو غور کرے گی اور گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔ وہ ایک وکیل تھے اور انہوں نے شاید یہ سوچا ہو گا کہ اگر مذاکرات دوبارہ شروع ہوئے تو وہ اپنے مطالبات پر زور دے کر کچھ اور حاصل کر لیں گے۔ لیکن ان کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ برطانوی حکومت نے مسٹر جناح کو خوش کرنا مناسب نہ سمجھا اور از سر نو گفتگو شروع نہ کی۔

سر اسٹیفرڈ کرپس اس پوری مدت میں مجھ سے خط و کتابت کرتے رہے۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ کیبنٹ مشن نے کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ دو ماہ سے زیادہ عرصے تک بحث اور گفتگو کی ہے اور اس کے بعد آخر کار ایک پلان مرتب کیا گیا ہے جسے کانگریس اور لیگ دونوں نے منظور کر لیا ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ مسلم لیگ اپنے موقف سے ہٹ گئی مگر اس کی ذمے دار وہ خود ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ تمام مسائل پر دوبارہ گفتگو ہو۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ برطانیہ کے ساتھ ہماری گفت و شنید کبھی آخری شکل اختیار نہیں کرے گی۔ اس کا رائے عامہ پر بہت برا اثر پڑے گا اور نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔ سر اسٹیفرڈ کرپس نے جواب میں لکھا کہ انہیں مجھ سے اتفاق ہے اور ان کا خیال ہے کہ حکومت بھی یہی رویہ اختیار کرے گی۔

حالات نے جو رخ اختیار کیا وہ میری توقع کے عین مطابق تھا۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ وائسرائے نے ۱۲ اگست ۱۹۴۶ کو ایک اعلامیہ جاری کیا جس میں جواہر لعل کو عبوری حکومت تشکیل دینے کی دعوت دی گئی تھی۔

کلکتہ اور دوسرے مقامات پر ہونے والے فسادات کی فضا میں ۱۷ اگست کو دہلی میں ہمارا اجلاس ہوا۔ ہم جانتے تھے کہ مسٹر جناح حکومت میں شامل ہونے کے لیے جواہر لعل کی دعوت قبول نہیں کریں گے۔ دراصل ان کا جواب، جس میں انہوں نے دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، ۱۶ اگست کو ہی آ چکا تھا۔ جواہر لعل نے تعاون کے لیے دوبارہ پیشکش کی اور کہا کہ مسلم لیگ کے لیے ہمیشہ دروازہ کھلا رہے گا لیکن مسٹر جناح کے موقف میں کوئی لچک پیدا نہ ہوئی۔

تیرھواں باب

عبوری حکومت

میں ذکر کر چکا ہوں کہ کانگریس نے عبوری حکومت کی تشکیل کا کام پارلیمانی کمیٹی کے سپرد کر دیا تھا چنانچہ جواہر لعل، پٹیل، راجندر پرشاد اور میں ۱۷ تاریخ کو دہلی میں ملے۔ میرے ساتھیوں کا اصرار تھا کہ مجھے عبوری حکومت میں شامل ہونا چاہیے۔ گاندھی جی کا بھی یہی خیال تھا۔ میرے لیے یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے الگ رہنا چاہیے اس لیے میں نے مشورہ دیا کہ آصف علی کو کابینہ میں شامل کر لیا جائے۔ آصف علی نے جب یہ سنا تو انہوں نے بھی اصرار کیا کہ مجھے کابینہ میں شامل ہونا چاہیے لیکن میں راضی نہ ہوا۔ میرے کئی احباب اس وقت یہ سمجھتے تھے اور اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جس نازک دور سے ہم گزر رہے ہیں، اس کا اور ملک کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ میں حکومت میں شامل ہوں۔ میں اس وقت سے اس معاملے پر اکثر غور کرتا رہتا ہوں اور اب بھی میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا فیصلہ واقعی درست تھا۔ ممکن ہے کہ میں حکومت سے الگ تھلگ رہنے کے بجائے حکومت میں شامل ہو کر ملک کی زیادہ خدمت انجام دے سکتا۔ اس وقت میرا یہ خیال تھا کہ میں حکومت سے باہر رہ کر زیادہ خدمت کر سکوں گا لیکن اب مجھے اعتراف ہے کہ اس وقت کابینہ کی رکنیت کام کے زیادہ مواقع فراہم کرتی۔

شملہ کانفرنس کے وقت میں نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ ایک پارسی کو بھی کابینہ میں شامل ہونا چاہیے۔ اب جبکہ کانگریس حکومت بنا رہی تھی، میں نے اس بات پر پھر زور دیا۔ کچھ بحث مباحثے کے بعد میرے ساتھیوں نے یہ تجویز مان لی۔ چونکہ پارسی زیادہ تر بمبئی میں رہتے تھے اس لیے ہم نے سوچا کہ پارسی نمائندے کے انتخاب میں سردار پٹیل زیادہ صحیح مشورہ دے سکتے ہیں چنانچہ ہم نے پارسی رکن کا انتخاب پٹیل پر چھوڑ دیا۔ انہوں نے کچھ دیر کے بعد مسٹر سی ایچ بھابھا کا نام تجویز کیا۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ مسٹر بھابھا سردار پٹیل کے بیٹے کے دوست ہیں اور انہیں کسی طرح بھی پارسیوں کا لیڈر یا ان کا نمائندہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا انتخاب غلط ثابت ہوا اور کچھ ہی دنوں بعد وہ کابینہ سے الگ ہو گئے۔

ہم نے یہ بھی طے کیا کہ حکومت میں کوئی تجربہ کار ماہر اقتصادیات بھی شامل ہونا چاہیے جو ہندوستان کا پہلا وزیر خزانہ ہو۔ اس کے لیے ہم نے ڈاکٹر جان متھائی کو منتخب کیا حالانکہ وہ کسی لحاظ سے بھی کانگریسی نہیں

تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ عبوری حکومت کی تشکیل کے وقت صرف پارٹی کے لوگوں کو حکومت میں شامل کرنے کی کوئی سخت پابندی نہیں تھی۔

مسلم لیگ کو صرف مایوسی ہی نہیں تھی بلکہ اس پر غصے کی کیفیت طاری تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ انگریزوں نے اسے دھوکا دیا ہے۔ اس نے دہلی اور دوسرے مقامات پر مظاہرے کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئی۔ بہرحال ملک میں ہر طرف تلخی اور بے چینی تھی اور لارڈ ویول نے محسوس کیا کہ لیگ کو عبوری حکومت میں شامل ہونے پر راضی کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ انہوں نے مسٹر جناح کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ وہ آئے اور لارڈ ویول کے ساتھ ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ آخر ۱۵ اکتوبر کو مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

اس عرصے میں لارڈ ویول سے میں کئی بار ملا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اگر لیگ عبوری حکومت میں شامل نہ ہوئی تو کیبنٹ مشن پلان پر عملدرآمد کے پروگرام میں رخنہ پڑسکتا ہے۔ انہوں نے اس جانب بھی اشارہ کیا کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے ہیں اور جب تک لیگ حکومت میں شامل نہیں ہوتی اس وقت تک یہ فسادات جاری رہیں گے۔ میں نے کہا کہ کانگریس نے حکومت میں لیگ کی شمولیت پر کبھی اعتراض نہیں کیا بلکہ میں نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ لیگ کو عبوری حکومت میں شامل ہونا چاہیے۔ جواہر لعل حکومت میں شامل ہونے سے پہلے اور بعد میں مسٹر جناح سے تعاون کی اپیل کرچکے ہیں۔

اس موقع پر میں نے ایک اور بیان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ کیبنٹ مشن کی تجاویز میں مسلم لیگ کے ان تمام اندیشوں کو، جنہیں حق بجانب کہا جاسکتا ہے، دور کردیا گیا ہے۔ مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی میں آزادی کے ساتھ کام کرسکتی اور اپنا نقطہ نظر پیش کرسکتی تھی اس لیے اس کے پاس دستور ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کے بعد جب میں لارڈ ویول سے ملا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہیں میری بات بہت پسند آئی ہے۔ انہوں نے میرے بیان کی ایک نقل اس درخواست کے ساتھ لیاقت علی کو بھیجی کہ وہ اسے مسٹر جناح کو دکھا دیں۔

اس موقع پر میں چند الفاظ ان لوگوں کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں جنہیں مسٹر جناح نے ایگزیکٹو کونسل کے لیے نامزد کیا تھا۔ لیاقت علی خان کے علاوہ بنگال کے خواجہ ناظم الدین اور یوپی کے نواب اسماعیل خان کا شمار مسلم لیگ کے اہم اور تجربہ کار لیڈروں میں ہوتا تھا۔ یہ تقریباً طے شدہ بات تھی کہ اگر مسلم لیگ نے حکومت میں شامل ہونا منظور کیا تو یہ تینوں لیگ کے نمائندوں میں شامل ہوں گے۔ شملہ کانفرنس کے دوران بھی یہی تینوں نام بار بار لیے جاتے تھے۔ اب جبکہ لیگ نے کابینہ میں شامل ہونے کا فیصلہ کرلیا تو مسٹر جناح نے ایک

عجیب حرکت کی۔ خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل خان نے کانگریس اور لیگ کے جھگڑوں میں کبھی انتہا پسندی کا رویہ اختیار نہیں کیا تھا اس لیے مسٹر جناح ان سے ناخوش تھے۔ انہوں نے سوچا کہ یہ دونوں ان کے اشارے پر چلنے سے انکار کر دیں گے چنانچہ انہوں نے ان کے نام فہرست سے خارج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر یہ بات قبل از وقت معلوم ہو جاتی تو لیگ کی کونسل میں ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا اس لیے انہوں نے کونسل سے ایک قرارداد منظور کرا لی جس کے مطابق ان کو نامزدگی کے کلی اختیارات سونپ دیے گئے۔

جب انہوں نے لارڈ ویول کو فہرست پیش کی تو اس میں لیاقت علی، آئی آئی چندریگر، عبدالرب نشتر، غضنفر علی اور جوگیندر ناتھ منڈل کے نام شامل تھے۔ جے این منڈل کے بارے میں تو میں بعد میں کچھ کہوں گا لیکن لیگ کے باقی تینوں نمائندے بالکل غیر معروف تھے۔ یہ ایسے چھپے رستم تھے جن کے بارے میں خود لیگ کے ممبر کچھ نہیں جانتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لیگ نے سیاسی جدوجہد میں کبھی شرکت نہیں کی تھی اس لیے لیگ میں قومی حیثیت کے چند ہی لیڈر تھے تاہم اس کے ممبروں میں خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل خان جیسے تجربہ کار منتظم شامل تھے۔ ان سب کو مسٹر جناح کے تین جی حضوریوں کی خاطر نظر انداز کر دیا گیا۔

عبوری حکومت کے لیے مسلم لیگ کے ارکان کے ناموں اور ان کے محکموں کا اعلان ۲۵ اکتوبر کو ہوا۔ خواجہ ناظم الدین، نواب اسماعیل خان اور مسلم لیگ کے دوسرے لیڈر امپیریل ہوٹل میں بے چینی سے اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں اور ان کے حامیوں کو پورا یقین تھا کہ انہی کے نام پیش کیے جائیں گے چنانچہ مسلم لیگ کے بہت سے ممبر ہار اور گلدستے لے کر آئے تھے۔ جب ناموں کا اعلان ہوا اور ان میں سے کسی کا نام فہرست میں شامل نہ کیا گیا تو بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی مایوسی اور غم و غصے کی کیفیت کیا ہو گی۔ مسٹر جناح نے ان کی ساری امیدوں پر پانی ہی نہیں، برف کا پانی پھیر دیا تھا۔

کانگریس نے ایگزیکٹو کونسل کے لیے ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، شیڈول کاسٹ اور عیسائی ارکان کو نامزد کیا تاہم مقررہ حدود کے اندر رہتے ہوئے شیڈول کاسٹ کے صرف ایک نمائندے کو نامزد کیا جا سکا۔ مسلم لیگ نے سوچا کہ وہ شیڈول کاسٹ کے دوسرے نمائندے کو نامزد کر کے کانگریس کو شرمسار کر دے گی اور اس طرح یہ ثابت ہو جائے گا کہ کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ شیڈول کاسٹ کی زیادہ خیر خواہ ہے☆ مسٹر جناح یہ بھول گئے کہ اس طرح وہ اپنے ہی مطالبے کی تردید کر رہے ہیں کہ کانگریس کو صرف ہندو اور مسلم لیگ کو صرف مسلمان نمائندے نامزد کرنا چاہئیں۔ ان کے انتخاب پر لوگوں کو ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔

مسٹر سہروردی نے جب بنگال میں مسلم لیگ کی وزارت بنائی تو اس میں جوگیندر ناتھ منڈل تنہا غیر مسلم ممبر تھے۔

اس وقت وہ بنگال میں بالکل غیر معروف تھے اور ہندوستان کی سیاست میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ لارڈ ویول کا ردعمل کیا تھا البتہ جوگیندر ناتھ منڈل مسلم لیگ کے نامزد نمائندے تھے اور انہیں ممبر قانون بنا دیا گیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کی حکومت کے بیشتر سیکرٹری انگریز تھے۔ مسٹر منڈل کو بھی ایک انگریز سیکرٹری ملا جو برابر یہ شکایت کیا کرتا کہ مسٹر منڈل جیسے ممبر کے ساتھ کام کرنا بڑا مشکل ہے۔

اب چونکہ لیگ نے حکومت میں شامل ہونا منظور کر لیا تھا اس لیے کانگریس کو لیگ کے نمائندوں کے لیے جگہ نکالنے کی خاطر حکومت کی از سر نو تشکیل کرنا تھی۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کانگریس کے موجودہ ارکان میں سے کون حکومت سے علیحدہ ہوگا۔ یہ مناسب سمجھا گیا کہ لیگ کے نمائندوں کو جگہ دینے کے لیے مسٹر سرت چندر بوس، سر صفات احمد خان اور سید علی ظہیر کو استعفا دے دینا چاہیے۔ جہاں تک محکموں کا تعلق ہے، لارڈ ویول کی تجویز تھی کہ ایک اہم محکمہ لیگ کے نمائندے کو ملنا چاہیے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم داخلہ امور کے محکمے کو چھوڑ دیں تاہم سردار پٹیل نے، جو اس وقت امور داخلہ کے ممبر تھے، اس تجویز کی شدت سے مخالفت کی۔ میرا خیال تھا کہ امن و امان کا مسئلہ خالصتاً صوبائی ذمے داری ہے اور کیبنٹ مشن پلان میں جو خاکہ بنایا گیا تھا اس میں مرکز کا امن و امان سے متعلق معاملات میں برائے نام ہی دخل تھا اور اسی لیے مرکزی وزارت داخلہ کو نئی تنظیم میں کوئی اہم حیثیت حاصل نہیں تھی چنانچہ میں لارڈ ویول کی تجویز کو منظور کر لینے کے حق میں تھا لیکن سردار پٹیل اپنی بات پر اڑے رہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم نے اصرار کیا تو وہ حکومت سے دستبردار ہو جائیں گے مگر اس محکمے کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوں گے۔

اس کے بعد ہم نے دوسرے امکانات پر غور کیا۔ رفیع احمد قدوائی نے تجویز پیش کی کہ ہمیں مالیات کا محکمہ مسلم لیگ کو دے دینا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مالیات اہم ترین شعبوں میں سے ہے لیکن یہ ایک حد درجہ فنی محکمہ تھا اور لیگ کے پاس ایسا کوئی ممبر نہیں تھا جو اسے موثر طور پر چلا سکتا۔ قدوائی سمجھتے تھے کہ اس محکمے کی فنی نوعیت کے پیش نظر لیگ اس پیشکش کو مسترد کر دے گی۔ اگر ایسا ہوا تو کانگریس کو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ اس کے برعکس اگر لیگ کے نمائندے نے مالیات کی وزارت منظور کر لی تو اس سے بہت جلد حماقتیں سرزد ہوں گی۔ اس طرح دونوں صورتوں میں کانگریس کو فائدہ ہوگا۔

سردار پٹیل نے اس تجویز کو غنیمت سمجھا اور اس کی پرزور تائید کی۔ میں نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ مالیات کو حکومت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اگر یہ محکمہ لیگ کو دے دیا گیا تو ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سردار پٹیل نے یہ کہہ کر میری مخالفت کی کہ چونکہ لیگ اس شعبے کو سنبھال ہی نہیں سکے گی اس لیے وہ اسے منظور نہیں کرے گی۔ میں اس فیصلے پر خوش نہیں تھا لیکن چونکہ سب متفق تھے اس لیے میں خاموش ہوگیا۔

بعد میں وائسرائے کو اطلاع دے دی گئی کہ کانگریس مالیات کا شعبہ مسلم لیگ کے نمائندے کو دینے پر تیار ہے۔

لارڈ ویول نے مسٹر جناح کو یہ بتا دیا اور انہوں نے کہا کہ وہ اس بارے میں اپنا جواب اگلے روز دیں گے۔ غالباً شروع میں مسٹر جناح کو یہ پیشکش قبول کرنے میں تامل تھا۔ انہوں نے لیاقت علی کو کابینہ میں لیگ کا خصوصی نمائندہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن انہیں شک تھا کہ لیاقت علی مالیات کے کام کو مناسب طریقے سے کر بھی سکیں گے۔ محکمہ مالیات کے بعض مسلمان افسروں نے یہ خبر سنی اور انہوں نے مسٹر جناح کے ساتھ رابطہ کر لیا۔ انہوں نے مسٹر جناح کو بتایا کہ کانگریس کی یہ پیشکش ایک غیر متوقع نعمت اور لیگ کے لیے بہت بڑی فتح ہے۔ انہیں ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ کانگریس مالیات کا محکمہ لیگ کو سونپنے پر تیار ہو جائے گی۔ مالیات کا محکمہ لیگ کے ہاتھ میں ہوا تو اس کا حکومت کے ہر محکمے میں عمل دخل ہو جائے گا۔ انہوں نے مسٹر جناح کو یقین دلایا کہ ڈرنے کی قطعی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ مسٹر لیاقت علی کو پوری مدد دیں گے اور اس کے ذمے دار ہوں گے کہ وہ اپنے فرائض موثر طور پر انجام دے سکیں۔ مسٹر جناح نے یہ تجویز قبول کر لی اور لیاقت علی مالیات کے ممبر بن گئے۔ کانگریس نے جلد ہی یہ محسوس کر لیا کہ اس نے مالیات کا محکمہ مسلم لیگ کو دے کر سنگین غلطی کی ہے۔

دنیا بھر کے ملکوں میں وزیر مالیات کی حکومت میں بنیادی حیثیت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی کیونکہ برطانوی حکومت وزیر مالیات کو اپنے مفادات کا امین سمجھتی تھی۔ یہ ایک ایسا محکمہ تھا جو ہمیشہ انگریزوں کے ہاتھ میں رہا جنہیں خاص طور پر اس کام کے لیے لایا جاتا تھا۔ وزیر مالیات ہر محکمے میں مداخلت کر سکتا تھا اور وہی اس کی پالیسی طے کرتا تھا۔ جب لیاقت علی مالیات کے ممبر ہو گئے تو حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ ہر شعبے کی ہر تجویز چھان بین کے لیے ان کے محکمے کے پاس آتی تھی۔ اس کے علاوہ انہیں ویٹو کا حق بھی حاصل تھا۔ ان کے محکمے کی منظوری کے بغیر ایک چپڑاسی بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

سردار پٹیل امور داخلہ اپنے پاس رکھنے پر مصر تھے۔ اب انہوں نے محسوس کر لیا کہ لیگ کو محکمہ مالیات دے کر انہوں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا ہے۔ لیاقت علی ان کی ہر تجویز کو یا تو مسترد کر دیتے یا اس میں اس قدر ترمیمیں کر دیتے کہ وہ اصل سے بالکل مختلف ہو جاتی۔ ان کی اس مسلسل مداخلت کی وجہ سے کانگریسی ممبروں کے لیے موثر طریقے سے کام کرنا ناممکن ہو گیا۔ حکومت کے اندر اختلافات پیدا ہونے لگے جو روز بروز بڑھتے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ عبوری حکومت نے اس وقت جنم لیا جب کانگریس اور لیگ کو ایک دوسرے پر ذرا بھی اعتماد اور اعتبار نہیں تھا۔ لیگ کے عبوری حکومت میں شریک ہونے سے پہلے ہی وہ شبہات، جو لیگ کو کانگریس کی طرف سے تھے، نئی کونسل کی تشکیل پر اثر انداز ہونے لگے۔ ستمبر ۱۹۴۶ میں جب پہلی مرتبہ کونسل کی تشکیل

ہوئی تو یہ سوال اٹھایا گیا کہ محکمہ دفاع کا انچارج کون ہوگا؟ آپ کو یاد ہوگا کہ دفاع کے معاملے میں اختلاف کرپس مشن کی ناکامی کا ایک بڑا سبب تھا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ محکمہ دفاع اس کے کسی معتمد شخص کے پاس ہو لیکن لارڈ ویول کا کہنا تھا کہ اس کی وجہ سے مشکلات پیدا ہوں گی۔ وہ دفاع کو فرقہ وارانہ سیاست سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ اگر کانگریس کا کوئی ممبر دفاع کا انچارج بن جائے تو اس سے مسلم لیگ کو بے بنیاد الزامات تراشنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر لیگ حکومت میں شامل ہوئی تو بھی وہ دفاع کا محکمہ لیگ کے نمائندے کو سونپنے پر رضامند نہیں ہوں گے۔ ان کی تجویز تھی کہ دفاع کا ممبر نہ تو ہندو ہونا چاہیے نہ مسلمان۔ بلدیو سنگھ اس وقت پنجاب کے ایک وزیر تھے اور ہم نے لارڈ ویول کی یہ تجویز مان لی کہ انہیں دفاع کا ممبر بنا دیا جائے۔

اس موقع پر میں ایک اور چھوٹے سے واقعے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ مسلم لیگ کے نمائندوں کے دماغ میں کس قدر شکوک وشبہات موجود تھے۔ عبوری حکومت کے قیام کے بعد یہ طے پایا تھا کہ کابینہ کے رسمی اجلاسوں سے پہلے تمام ممبروں کی غیر رسمی میٹنگ ہوا کرے گی۔ خیال تھا کہ اگر تمام ممبر غیر رسمی طور پر تبادلہ خیال کریں گے تو یہ روایت قائم ہو جائے گی کہ وائسرائے کی حیثیت محض ایک آئینی سربراہ کی ہے۔ یہ اجلاس کونسل کے مختلف ارکان کے کمروں میں باری باری منعقد ہوتے تھے لیکن جواہر لعل اکثر ممبروں کو چائے پر مدعو کیا کرتے تھے۔ یہ دعوت نامے عام طور پر جواہر لعل کا پرائیویٹ سیکرٹری بھیجتا تھا۔ مسلم لیگ کی حکومت میں شمولیت کے بعد پرائیویٹ سیکرٹری نے دوسرے ممبروں کے ساتھ مسلم لیگ کے نمائندوں کو بھی دعوت نامے بھیج دیے۔ لیاقت علی نے اس پر سخت اعتراض کیا اور کہا کہ جواہر لعل کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے انہیں چائے کی دعوت دینے سے ان کی توہین ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ وہ سمجھتے تھے کہ جواہر لعل کو کونسل کے نائب صدر کی حیثیت سے اس قسم کے غیر رسمی اجلاس بلانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگرچہ انہوں نے جواہر لعل کو یہ حق نہیں دیا لیکن وہ خود مسلم لیگ کے نمائندوں کے ایسے ہی اجلاس اپنے یہاں کرنے لگے۔ یہ ایک معمولی واقعہ ہے لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے نمائندے کانگریس کے ساتھ عدم تعاون پر کس حد تک تلے ہوئے تھے۔

آخری نصف اکتوبر میں جواہر لعل نے ایک ایسا قدم اٹھایا جو غیر ضروری تھا اور جس کی میں نے اس وقت مخالفت کی تھی۔ ان کی طبیعت کچھ ایسی ہے کہ وہ اکثر باتیں جذبات سے مغلوب ہو کر کر ڈالتے ہیں۔ عام طور پر وہ دوسروں کی رائے سننے پر آمادہ رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کیے بغیر کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں اور اس پر عمل کرتے وقت اس کی پروا نہیں کرتے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

شمال مغربی سرحدی صوبے میں مسلمان بہت بھاری اکثریت میں تھے۔ ۱۹۳۷ اور ۱۹۴۶ میں

وہاں جو حکومتیں بنیں ان پر کانگریس کا غلبہ تھا۔ یہ خوش آئند صورت حال خان عبدالغفار خان اور ان کے خدائی خدمتگاروں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم صوبہ سرحد کے ہر معاملے میں خان عبدالغفار خان اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب پر بھروسا کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ گاندھی جی بعض اوقات ہنسی مذاق میں یہ کہتے تھے کہ خان برادران صوبہ سرحد کے معاملوں میں ان کے ضمیر کے پاسبان ہیں۔

عبوری حکومت قائم ہونے کے فوراً بعد جواہر لعل نے جنوبی وزیرستان کے قبائیلوں پر فضائی بمباری بند کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ اسی اثنا میں انہیں سرکاری اطلاعات مل رہی تھیں کہ صوبہ سرحد کا بہت بڑا طبقہ کانگریس اور خان برادران کے خلاف ہے۔ مقامی عہدیداروں نے بار بار کہا کہ کانگریس مقامی لوگوں کی حمایت سے محروم ہو گئی ہے اور بہت سے لوگ کانگریس کے بجائے لیگ کے وفادار بن گئے ہیں۔ جواہر لعل کا خیال تھا کہ یہ اطلاعات غلط اور ان انگریز افسروں کی اختراع ہیں جو کانگریس کے خلاف تھے۔ لارڈ ویول جواہر لعل سے متفق نہیں تھے لیکن ساتھ ہی وہ ان سرکاری اطلاعات کو حرف بہ حرف صحیح بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ صوبہ سرحد میں خان برادران اور مسلم لیگ کی مقبولیت تقریباً برابر ہے البتہ کانگریسی حلقے یہ سمجھتے تھے کہ صوبہ سرحد کی بہت بڑی اکثریت خان بھائیوں کے ساتھ ہے۔ جواہر لعل نے کہا کہ وہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے خود صوبہ سرحد کا دورہ کریں گے۔

مجھے جب یہ معلوم ہوا تو میں نے جواہر لعل سے کہا کہ انہیں عجلت میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ صوبہ سرحد کی صحیح صورت حال کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ تقریباً ہر صوبے میں گروہ بندی ہے اور صوبہ سرحد میں بھی خان بھائیوں کے خلاف کوئی گروپ یقیناً موجود ہوگا۔ جواہر لعل نے ابھی ابھی نیا منصب سنبھالا تھا اور ان کی پوزیشن ابھی مضبوط نہیں ہوئی تھی۔ اس مرحلے پر ان کے صوبہ سرحد کے دورے سے باغی عناصر کو کانگریس کے خلاف منظم ہونے کا موقع مل جائے گا۔ چونکہ سرکاری افسروں کی اکثریت بھی کانگریس کے خلاف ہے اس لیے یہ لوگ مخالف عناصر کی اگر عملاً مدد نہیں کریں گے تو ان سے ہمدردی ضرور کریں گے۔ مناسب ہے کہ وہ اپنا دورہ آئندہ کسی موزوں وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ گاندھی جی نے بھی میرے خیالات کی تائید کی لیکن جواہر لعل اپنے فیصلے پر قائم رہے اور کہنے لگے کہ نتیجہ چاہے جو بھی ہو، وہ ہر صورت میں سرحد کا دورہ کریں گے۔

خان برادران کا یہ دعویٰ بھی غلط نہیں تھا کہ صوبہ سرحد کے عوام کی اکثریت ان کی حامی ہے البتہ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ کا اندازہ کرنے میں مبالغے سے کام لیا تھا۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کیونکہ لوگ عموماً اپنی طاقت کو حقیقت سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ غالباً وہ ہمیں یہ بھی جتانا چاہتے تھے کہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں اختلافات ہیں لیکن صوبہ سرحد مکمل طور پر کانگریس کے ساتھ ہے۔ بہر کیف حقیقت یہ تھی کہ سرحد کا ایک طاقتور

گروپ خان برادران کے خلاف تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب صوبے کے وزیراعلیٰ تھے تو ان کے مخالف عناصر کو مزید طاقت پیدا کرنے کا موقع مل گیا۔ ڈاکٹر خان صاحب کو پورے صوبے کی حمایت حاصل کرنے کا موقع ملا تھا لیکن ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے ان کے مخالفوں کے ہاتھ اور مضبوط ہو گئے۔

ان میں بعض غلطیاں خالصتاً ذاتی اور سماجی نوعیت کی تھیں۔ سرحد کا پٹھان بہت مہمان نواز واقع ہوا ہے۔ وہ اپنی روٹی کے آخری ٹکڑے میں بھی مہمان کو خوشی سے شریک کرتا ہے اور اس کا دسترخوان ہر شخص کے لیے بچھا رہتا ہے۔ وہ دوسرے لوگوں خاص طور پر معاشرے میں اعلیٰ حیثیت رکھنے والوں سے بھی ایسی ہی تواضع کی توقع رکھتا ہے۔ کنجوسی اور اخلاق کی کمی پٹھانوں کو بہت جلد برگشتہ کر دیتی ہے۔ بدقسمتی سے اس معاملے میں خان بھائی اپنے حامیوں کی توقعات کسی طور پوری نہ کر سکے۔

خان بھائی امیر لوگ تھے لیکن افسوس کہ وہ مزاج کے اعتبار سے بہت کنجوس تھے۔ انہوں نے شاید ہی کسی کو کھانے پر بلایا ہو۔ اگر اتفاق سے کوئی شخص کھانے یا چائے کے وقت آ جاتا تو اس سے بھی کھانے پینے کے لیے نہ کہا جاتا۔ وہ دوسروں سے وصول ہونے والے فنڈز کے معاملے میں بھی بہت کنجوسی سے کام لیتے رہے۔ عام انتخابات کے دوران خان برادران کو کانگریس کی طرف سے خاصی بڑی رقم دی گئی لیکن انہوں نے اس فنڈ سے بھی کم سے کم خرچ کیا۔ بہت سے امیدوار فنڈز نہ ہونے کی وجہ سے ہار گئے۔ بعد میں جب انہیں پتا چلا کہ فنڈز خان برادران کے پاس بیکار پڑے رہے ہیں تو یہ لوگ خان بھائیوں کے کٹر دشمن ہو گئے۔

ایک بار پشاور سے کچھ لوگ الیکشن فنڈ کے سلسلے میں مجھ سے ملاقات کے لیے کلکتہ آئے۔ چونکہ یہ چائے کا وقت تھا اس لیے میں نے انہیں چائے اور بسکٹ پیش کیے۔ ان میں سے کچھ لوگ بسکٹوں کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ ایک شخص نے بسکٹ ہاتھ میں لے کر مجھ سے ان کا نام پوچھا، معلوم ہوتا تھا انہیں یہ بسکٹ بہت پسند آئے ہیں۔ بعد میں انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے ایسے ہی بسکٹ ڈاکٹر خان صاحب کے گھر پر دیکھے تھے لیکن انہوں نے کسی کو کبھی یہ بسکٹ یا ایک پیالی چائے تک پیش نہیں کی۔

۱۹۴۶ میں اصل صورت حال یہ تھی کہ خان بھائیوں کو سرحد کے اتنے لوگوں کی حمایت حاصل نہیں تھی جتنی کہ دہلی میں ہم سب سمجھتے تھے۔ جواہر لعل جب پشاور پہنچے تو انہیں یہ حقیقت معلوم ہوئی اور انہیں ایک ناخوشگوار صدمہ پہنچا۔ ڈاکٹر خان صاحب اس وقت صوبے کے وزیراعلیٰ تھے اور وزارت کانگریس کی تھی۔ میں پہلے بھی یہ کہہ چکا ہوں کہ انگریز افسر کانگریس کے خلاف تھے اور انہوں نے لوگوں کو وزارت کے خلاف کافی اکسا رکھا تھا۔ چنانچہ جواہر لعل جب پشاور کے ہوائی اڈے پر اترے تو ہزاروں پٹھانوں نے مخالفانہ نعروں اور کالی جھنڈیوں سے ان کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر خان صاحب اور دوسرے وزراء جو جواہر لعل کا خیر مقدم کرنے کے لیے

آئے تھے، خود پولیس کی حفاظت میں تھے اور ان کی موجودگی بالکل بے اثر ثابت ہوئی۔ جواہر لعل جیسے ہی باہر آئے ان کے خلاف نعرے شروع ہو گئے اور مجمعے میں سے کچھ لوگوں نے ان کی کار پر حملہ کرنا چاہا۔ ڈاکٹر خان صاحب اس قدر پریشان ہو گئے کہ انہوں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور گولی چلانے کی دھمکی دے دی۔ صرف اس دھمکی سے ڈر کر لوگوں نے راستہ دے دیا اور کاروں کو پولیس کی حفاظت میں جانا پڑا۔

جواہر لعل اگلے ہی روز پشاور سے قبائلی علاقوں کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ انہوں نے ہر جگہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا مخالف پایا۔ ان کے خلاف جو مظاہرے کیے گئے، ان کے ذمے دار بڑی حد تک وزیرستان کے ملک تھے۔ بعض مقامات پر تو ان کی کار پر پتھر پھینکے گئے اور ایک پتھر جواہر لعل کی پیشانی پر لگا۔ ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے ساتھی مکمل طور پر بے بس معلوم ہوتے تھے اور جواہر لعل کو حالات پر قابو پانے کی تدبیریں خود کرنا پڑیں۔ انہوں نے نہ تو کمزوری دکھائی اور نہ خوف بلکہ بڑی جرأت سے کام لیا اور پٹھان ان کی مردانہ ہمت سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی واپسی پر لارڈ ویول نے ان واقعات پر افسوس کا اظہار کیا۔ وہ افسروں کے رویے کے بارے میں باضابطہ تحقیقات کرنا چاہتے تھے لیکن جواہر لعل ان افسروں کے خلاف کارروائی کرنے پر متفق نہ ہوئے۔ لارڈ ویول اس سے بہت متاثر ہوئے اور میں نے بھی جواہر لعل کے موقف کو سراہا۔

☆مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان مختصر اور طویل المیعاد دونوں انتظامات کو منظور کیا تھا۔ غالباً مسٹر جناح کا خیال تھا کہ چونکہ کانگریس نے عبوری حکومت کی دونوں تجویزیں مسترد اور مسلم لیگ نے منظور کر لی تھیں اس لیے انہیں حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی۔ چنانچہ وائسرائے نے جب یہ بیان جاری کیا کہ نمائندہ عبوری حکومت کے قیام کے لیے مذاکرات ناکام ہونے کے بعد وہ سرکاری حکام پر مشتمل عارضی نگران حکومت قائم کریں گے اور عبوری حکومت کے معاملے پر گفت وشنید دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کے بعد دوبارہ شروع کی جائے گی تو مسٹر جناح اس بیان پر سیخ پا ہو گئے۔ وائسرائے نے مزید کہا کہ دونوں بڑی پارٹیوں اور ریاستوں کی رضامندی سے دستور سازی کا کام جاری رکھا جا سکتا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اس کے فوراً بعد جواہر لعل نے بمبئی میں ایک بیان جاری کر دیا تھا جس کی بنیاد پر مسٹر جناح کو کیبنٹ مشن پلان کو کلی طور پر مسترد کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں لیگ کے ارکان نے دستور ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ لیگ عام طور پر کانگریس کے ہر کام کی مخالفت کرتی تھی☆

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے شروع میں کیبنٹ مشن کے پلان کو تسلیم کر لیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں جماعتوں نے دستور ساز اسمبلی کو منظور کر لیا ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلق تھا، وہ اب بھی کیبنٹ مشن پلان کے حق میں تھی۔ اس کی طرف سے صرف ایک اعتراض آسام کے بعض لیڈروں نے اٹھایا تھا۔ ان کے

ذہن میں بنگالیوں کا خوف طاری تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر بنگال اور آسام کو ایک ہی گروپ میں شامل کیا گیا تو اس پورے علاقے پر مسلمانوں کا تسلط ہو جائے گا۔ آسام کے لیڈروں نے یہ اعتراض کیبنٹ مشن پلان کا اعلان ہوتے ہی کیا تھا۔ گاندھی جی نے شروع میں کیبنٹ مشن پلان کو منظور کر لیا تھا اور کہا تھا کہ اس پلان میں اس بدقسمت خطۂ ارضی کو مصائب اور آلام سے نجات دلانے کے امکانات موجود ہیں۔ انہوں نے ہریجن میں یہاں تک لکھا تھا کہ کیبنٹ مشن کے پلان اور برطانوی حکومت کی جانب سے جاری ہونے والے وائسرائے کے بیان پر چار روز تک غور کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ موجودہ حالات میں برطانوی حکومت اس سے بہتر دستاویز تیار نہیں کر سکتی تھی۔ آسام کے وزیراعلیٰ گوپی ناتھ باردولی پلان کی مخالفت پر قائم رہے اور انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے ایک یادداشت پیش کی جس میں کیبنٹ مشن کے بیان کی رو سے آسام اور بنگال کو ایک ہی گروپ میں شامل کرنے کی تجویز کی مخالفت کی گئی تھی۔

ورکنگ کمیٹی میں ہم لوگوں کا خیال تھا کہ ہمیں گروپوں کے مسئلے کو دوبارہ نہیں اٹھانا چاہیے۔ ہم نے اپنے آسام کے ساتھیوں کے اعتراض کو ایک حد تک دور کرنے اور اصول کی بنیاد پر دستور ساز اسمبلی کے الیکشن میں یورپی ممبروں کی شرکت کا سوال اٹھایا۔ میں نے وائسرائے کو لکھا کہ اگر بنگال اور آسام کی قانون ساز اسمبلیوں کے یورپی ممبروں نے دستور ساز اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لیا یا وہ امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے تو کانگریس کیبنٹ مشن کی تجویزوں کو مسترد کر سکتی ہے۔ یہ اعتراض اس طرح ختم ہوا کہ بنگال اسمبلی کے یورپی ممبروں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ مجوزہ دستور ساز اسمبلی میں اپنی نمائندگی نہیں چاہیں گے۔ لیکن اسی اثنا میں گاندھی جی کے خیالات بدل گئے اور وہ باردولی کی پوری حمایت کرنے لگے۔ جواہر لعل مجھ سے متفق تھے کہ آسام کے لیڈروں کے اندیشے بلا جواز ہیں۔ انہوں نے ان لیڈروں کو سمجھانے کی بھی پوری کوشش کی۔ بدقسمتی سے یہ لوگ جواہر لعل یا میری بات سننے پر راضی نہ ہوئے۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی تھی کہ گاندھی جی اب ان کے ساتھ تھے اور ان کی حمایت میں بیان جاری کر رہے تھے۔ بہرحال جواہر لعل ثابت قدم رہے اور انہوں نے میری مکمل حمایت کی۔

میں کہہ چکا ہوں کہ لیگ کی طرف سے کیبنٹ مشن پلان کو مسترد کرنے کے بعد ہم بہت متفکر تھے۔ لیگ کے اعتراضات رفع کرنے کے لیے ورکنگ کمیٹی نے جو اقدام اٹھایا اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ہم نے ۱۰ اگست کو ایک قرارداد منظور کی جس میں واضح کر دیا گیا تھا کہ اگرچہ ہم کیبنٹ مشن پلان کی بعض تجویزوں سے مطمئن نہیں ہیں اس کے باوجود ہم نے پوری اسکیم کو منظور کر لیا ہے ☆ مسٹر جناح ہماری اس قرارداد سے مطمئن نہ ہوئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ورکنگ کمیٹی نے اب بھی صاف الفاظ میں اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ صوبے

اسی گروپ میں شامل ہوں گے جس میں شامل ہونا کیبنٹ مشن پلان میں مدنظر تھا☆ برطانوی حکومت اور لارڈ ویول دونوں اس خاص نکتے پر لیگ کے ہم خیال تھے۔

☆ آج جب میں دس سال پہلے کے واقعات پر دوبارہ نظر ڈالتا ہوں تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ مسٹر جناح کا موقف جاندار تھا۔ کانگریس اور لیگ دونوں سمجھوتے کی فریق تھیں اور لیگ نے مرکز، صوبوں اور گروپوں کی تقسیم کی بنیاد پر پلان کو تسلیم کیا تھا۔ کانگریس نے شکوک وشبہات پیدا کر کے دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا تھا اور نہ ہی اس کا طرز عمل درست تھا۔ اگر وہ ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتی تھی تو اسے پلان کو واضح طور پر منظور کرنا چاہیے تھا۔ تذبذب اور شش و پنج کی کیفیت سے مسٹر جناح کو ہندوستان تقسیم کرنے کا موقع مل سکتا تھا☆

اس عرصے میں میں اختلافات کو بات چیت کے ذریعے ختم کرنے کی برابر کوشش کرتا رہا اور لارڈ ویول نے اس سلسلے میں میری پوری حمایت کی۔ اسی وجہ سے وہ مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے اس ضمن میں جو بیان جاری کیا، لارڈ ویول نے اس کا خیر مقدم کیا۔ انہیں دل سے اس بات کا یقین تھا کہ ہندوستان کے مسائل کا کیبنٹ مشن کے پلان سے بہتر حل ناممکن ہے۔ وہ مجھے بار بار یہ کہتے رہے کہ مسلم لیگ کے نقطہ نظر سے بھی اس سے بہتر حل ممکن نہیں۔ چونکہ کیبنٹ مشن پلان زیادہ تر میرے ۱۵ اپریل کے بیان پر مبنی تھا اس لیے ان سے اتفاق کرنا ایک فطری بات تھی۔

مسٹر اٹیلی ہندوستان میں رونما ہونے والے واقعات میں ذاتی دلچسپی لے رہے تھے۔ انہوں نے تعطل کو دور کرنے کے لیے لارڈ ویول اور کانگریس اور لیگ کے نمائندوں کو ۲۶ نومبر ۱۹۴۶ کو لندن بلایا۔ شروع میں کانگریس اس دعوت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ درحقیقت جواہر لعل نے لارڈ ویول سے کہہ بھی دیا کہ مزید گفتگو کے لیے لندن جانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ سارے متعلقہ مسائل پر بار بار گفتگو ہو چکی ہے اور ان کو دوبارہ اٹھانے سے فائدے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔

لارڈ ویول نے جواہر لعل سے اتفاق نہ کیا اور انہوں نے میرے ساتھ اس سلسلے میں تفصیلی بات چیت کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر مسلم لیگ کا یہی رویہ برقرار رہا تو اس کا اثر صرف انتظامی امور پر ہی نہیں پڑے گا بلکہ ہندوستان کے مسئلے کا پرامن حل زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ لندن میں گفتگو کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ وہاں لیڈروں کو زیادہ معروضی انداز میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع مل جائے گا۔ وہ مقامی دباؤ اور اپنے حامیوں کی مسلسل مداخلت سے آزاد ہوں گے۔ لارڈ ویول نے اس نکتے پر بھی زور دیا کہ مسٹر اٹیلی ہندوستان کے دوست رہے ہیں اور گفتگو میں ان کی شرکت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

میں لارڈ ویول کی دلیلوں سے بہت متاثر ہوا اور میں نے اپنے ساتھیوں کو نقطہ نظر تبدیل کرنے پر آمادہ

کرلیا۔ اس کے بعد یہ طے پایا کہ جواہر لعل کو کانگریس کی نمائندگی کرنے کے لیے لندن جانا چاہیے۔ مسٹر جناح اور لیاقت علی نے لیگ جبکہ بلدیو سنگھ نے سکھوں کی ترجمانی کی۔ یہ مذاکرات ۳ سے ۶ دسمبر تک جاری رہے لیکن ان سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

بڑے اختلافات کیبنٹ مشن پلان کی ان شقوں کی تشریح اور پلان کی مجوزہ گروپ بندی سے متعلق تھے۔ مسٹر جناح کا موقف یہ تھا کہ دستور ساز اسمبلی کو پلان کے ڈھانچے میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا حق نہیں ہے۔ گروپ بندی پلان کا لازمی حصہ ہے اور اگر اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گئی تو معاہدے کی بنیاد ہی ہل جائے گی۔ پلان میں یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ جب گروپ ملک کا دستور بنالیں گے تو کسی بھی صوبے کو اس سے الگ ہونے کا اختیار ہوگا۔ مسٹر جناح کے خیال میں ان صوبوں کو، جو اپنے گروپ سے الگ ہونا چاہتے تھے، خاصا تحفظ فراہم کر دیا گیا تھا۔ اس کے برعکس آسام کے کانگریسی لیڈروں کا یہ نظریہ تھا کہ اگر کوئی صوبہ چاہے تو شروع سے ہی اپنے مجوزہ گروپ سے الگ رہ سکتا ہے۔ اسے کسی گروپ میں شامل ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں اور وہ خود اپنا دستور تیار کر سکتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ صوبوں کو پہلے اپنے اپنے گروپ میں شامل ہونا چاہیے اور بعد میں اگر ان کی خواہش ہو تو وہ الگ ہو سکتے ہیں۔ آسام کے کانگریسی لیڈروں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ صوبے شروع سے ہی علیحدہ یونٹ کی حیثیت سے الگ رہ سکتے ہیں اور اگر وہ بعد میں چاہیں تو گروپ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ کیبنٹ مشن پلان نے یہ قرار دیا کہ اس نکتے پر لیگ کی تشریح درست ہے۔ مسٹر جناح نے یہ دلیل پیش کی کہ انہوں نے مرکز، صوبوں اور گروپوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کی بنیاد پر ہی لیگ کو یہ پلان منظور کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ آسام کے کانگریسی لیڈر اس سے متفق نہیں تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، گاندھی جی بھی تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد آسامی لیڈروں کی تشریح کی حمایت کرنے لگے تھے۔ میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ اس نکتے پر مسٹر جناح کا موقف مجموعی طور پر بالکل درست تھا۔ انصاف اور مصلحت اندیشی دونوں کا تقاضا تھا کہ کانگریس واضح اور غیر مبہم الفاظ میں پلان کو منظور کر لیتی۔

۶ دسمبر کو برطانوی کابینہ نے ایک بیان جاری کیا جس میں گروپ بندی کے بارے میں مسلم لیگ کے نظریے کو درست قرار دیا گیا لیکن اس سے کانگریس اور لیگ کے درمیان اختلاف کم نہ ہوا۔ دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ۱۱ دسمبر ۱۹۴۶ کو منعقد ہوا۔ اس موقع پر یہ سوال اٹھا کہ کس شخص کو اسمبلی کا صدر ہونا چاہیے؟ جواہر لعل اور سردار پٹیل دونوں کا یہ خیال تھا کہ کسی ایسے آدمی کو صدر منتخب کیا جائے جو حکومت میں شامل نہ ہو۔ ان دونوں نے مجھ پر زور دیا کہ میں اس عہدے کو قبول کر لوں لیکن میرا دل اس طرف مائل نہ ہوا۔ اس کے بعد کئی اور ناموں پر غور ہوا لیکن کسی پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ آخر ڈاکٹر راجندر پرشاد کو صدر منتخب کر لیا گیا حالانکہ وہ حکومت کے رکن تھے۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ ستمبر ۱۹۴۶ میں جب عبوری حکومت بنی تو گاندھی جی اور میرے ساتھیوں نے اصرار کیا کہ میں اس میں شریک ہو جاؤں لیکن میرا خیال تھا کہ کانگریس کے لیڈروں میں کم سے کم ایک سینئر رہنما کو حکومت سے باہر رہنا چاہیے۔ میں سمجھتا تھا کہ اس طرح میں صورت حال کا معروضی انداز میں صحیح جائزہ لے سکوں گا چنانچہ میں نے آصف علی کو حکومت میں شامل کر دیا۔ عبوری حکومت میں لیگ کی شرکت کے بعد ایگزیکٹو کونسل میں نئی مشکلات پیدا ہو گئیں اور اس طرح حکومت میں میری شمولیت کا سوال پھر اٹھ گیا۔ گاندھی جی اب پہلے سے بھی زیادہ مصر تھے کہ مجھے حکومت میں شامل ہو جانا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میری رائے یا ذاتی احساسات جو بھی ہوں، ملک کے مفاد کی خاطر وزارت میں شامل ہونا میرا فرض ہے۔ ان کا خیال تھا کہ میرا حکومت میں شامل نہ ہونا نقصان دہ ہے۔ جواہر لعل کا بھی یہی خیال تھا۔ انہوں نے مجھ پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ میں حکومت میں شامل ہو جاؤں۔ گاندھی جی کی رائے تھی کہ تعلیم کا محکمہ میرے لیے مناسب رہے گا اور ملک کا حقیقی مفاد بھی اسی میں ہے۔ انہوں نے کہا کہ آزاد ہندوستان کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ مستقبل میں تعلیم کا نظام کیا ہو؟ چنانچہ ۱۵ جنوری ۱۹۴۷ کو میں نے راج گوپال آچاری سے، جو اس وقت تک ممبر ایجوکیشن تھے، محکمہ تعلیم کا چارج لے لیا۔

میں نے تعلیم کی ذمے داریاں سنبھالنے کے بعد اس شعبے میں جس پالیسی اور پروگرام پر عمل کیا وہ ایک الگ کتاب کا موضوع ہوگا۔ تعلیم سے متعلق مختلف معاملات کے بارے میں میرے خیالات کو یک جا کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے اس لیے میں اس کتاب میں اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں یہاں پر صرف ملک کی عمومی سیاسی صورت حال پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں جو کانگریس اور لیگ کے اختلاف کی وجہ سے روز بروز نازک اور مشکل تر ہوتی جا رہی تھی۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ ایگزیکٹو کونسل کے لیگی ارکان قدم قدم پر ہمارے لیے رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے۔ یہ لوگ حکومت میں شامل تھے اور حکومت کی مخالفت بھی کر رہے تھے۔ اصل صورت حال کچھ ایسی تھی کہ وہ ہماری ہر کارروائی کو سبوتاژ کر سکتے تھے۔ وزیر مالیات کے اختیارات انتہا تک پہنچ چکے تھے اور جب لیاقت علی نے اگلے سال کا بجٹ پیش کیا تو ہمیں ایک نیا صدمہ پہنچا۔

کانگریس کی یہ علانیہ پالیسی تھی کہ معاشی ناہمواریاں ہر قیمت پر دور ہونی چاہئیں اور سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ رفتہ رفتہ ایک سوشلسٹ نظام قائم کیا جائے۔ کانگریس نے اپنے انتخابی منشور میں بھی یہی موقف اختیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ جنگ کے زمانے میں تاجروں اور صنعت کاروں نے جو منافع کمایا تھا، جواہر لعل اور میں نے اس کے بارے میں بیان بھی جاری کیے تھے۔ یہ بات عام طور پر معلوم تھی کہ اس رقم کا کچھ حصہ زیر زمین چلا گیا

اور اس پر انکم ٹیکس ادا نہیں کیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ حکومت اس بڑی رقم سے محروم ہو گئی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہندوستان کی حکومت کو ان واجب الادا ٹیکسوں کی وصولی کے لیے سخت کارروائی کرنی چاہیے۔

لیاقت علی نے جو بجٹ تیار کیا وہ بظاہر کانگریس کے اعلانات کے مطابق تھا لیکن دراصل یہ کانگریس کو بدنام کرنے کی عیارانہ کوشش تھی۔ انہوں نے کانگریس کے دونوں مطالبات کو بالکل ناقابل عمل صورت میں پیش کر دیا اور ایسے ٹیکس اقدامات تجویز کیے جن سے ملک کا دولت مند طبقہ مفلس بن جاتا اور صنعت اور تجارت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے واجب الادا ٹیکس کے بارے میں تحقیقات کرنے اور ان کی وصولی کے لیے ایک کمیشن قائم کرنے کی بھی تجویز پیش کر دی۔

یہ تو ہم سب چاہتے تھے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو اور ان سب لوگوں کا مواخذہ کیا جائے جنہوں نے ٹیکس بچائے تھے۔ اس طرح ہم اصولی طور پر لیاقت علی کی تجویز کے خلاف نہیں تھے۔ جب لیاقت علی نے کابینہ میں یہ سوال اٹھایا تو انہوں نے اس کا اعتراف کیا کہ ان کی تجویزیں کانگریس کے ذمے دار لیڈروں کے بیانات پر مبنی ہیں۔ انہوں نے یہ اقرار تو کر لیا لیکن جواہر لعل اور میرے بیانات کا تذکرہ نہ کیا اور نہ ہی بجٹ کی تفصیلات ظاہر کیں۔ اس طرح ہم نے اصولی طور پر ان سے اتفاق کر لیا۔ کابینہ کی منظوری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ایسی تجاویز کی بنا پر بجٹ مرتب کرنا شروع کر دیا جس میں صرف انتہا پسندی ہی نہیں تھی بلکہ اس میں قومی معیشت کو نقصان پہنچانے کی دانستہ کوشش کی گئی تھی۔

ہمارے بعض ساتھیوں کو لیاقت علی کی تجاویز پر سخت حیرت ہوئی۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود تھے جو صنعت کاروں کے ساتھ خفیہ طور پر ہمدردی رکھتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو ایمانداری سے یہ سمجھتے تھے کہ لیاقت علی کی بعض مخصوص بجٹ تجاویز سیاسی مقاصد کے تحت پیش کی گئی ہیں اور ان کا مقصد معاشی مسائل کو حل کرنا نہیں۔ سردار پٹیل اور راجا گوپال آچاری تو اس بجٹ کے شدید مخالف تھے کیونکہ ان کے خیال میں لیاقت علی ملکی مفاد سے زیادہ صنعت کاروں اور تاجروں کو نقصان پہنچانے کے درپے تھے اور ان کی اصل نیت بھی یہ تھی کہ کاروباری طبقے کو زک پہنچائی جائے کیونکہ اس طبقے کی اکثریت ہندو تھی۔ راجا جی نے کابینہ میں لیاقت علی کی تجویزوں کی علانیہ مخالفت کی اور اس جانب اشارہ کیا کہ اس میں فرقہ واریت کی بو آتی ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ یہ تجاویز کانگریس کی اعلان کردہ پالیسی کے مطابق ہیں اس لیے ہم اصولی طور پر ان کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ ہمیں چاہیے کہ ان تجاویز کو الگ الگ جانچیں اور ان میں سے جو ہمارے اصولوں کے مطابق ہیں ان کی حمایت کریں۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے صورت حال بہت مشکل اور بڑی نازک تھی۔ مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو پہلے منظور اور پھر نامنظور کر دیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس جاری تھا لیکن لیگ نے اس حقیقت کے باوجود

کہ پورا ملک آزادی کے مطالبے پر متفق اور متحد تھا، اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا۔ ایک طرف لوگ آزادی حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے تو دوسری طرف ہماری بدقسمتی یہ تھی کہ ہمیں فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا واحد حل کیبنٹ مشن پلان تھا مگر اس کے باوجود ہم ایک دفعہ بات طے کر کے اپنے اختلافات دور نہیں کر پا رہے تھے۔

برطانیہ کی لیبر حکومت اس شش و پنج میں تھی کہ اسے موجودہ صورت حال کو جاری رکھنا چاہیے یا خود اپنی ذمے داری پر کوئی قدم اٹھانا چاہیے؟ مسٹر اٹیلی کا خیال تھا کہ معاملات ایسے مرحلے پر پہنچ گئے ہیں کہ اب تعطل بہت نقصان دہ ہوگا اس لیے ضروری ہے کہ کوئی صاف اور قطعی فیصلہ کر لیا جائے۔ چنانچہ مسٹر اٹیلی نے فیصلہ کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان سے اقتدار سے دستبردار ہونے کی ایک تاریخ مقرر کر دے۔ لارڈ ویول کو ایسی کسی تاریخ کا اعلان کرنے سے اتفاق نہیں تھا اور ان کی خواہش تھی کہ کیبنٹ مشن پلان پر قائم رہا جائے کیونکہ وہ اسی کو ہندوستان کے مسئلے کا ممکن حل تصور کرتے تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر برطانوی حکومت نے فرقہ وارانہ مسئلے کے حل ہونے سے پہلے سیاسی اقتدار منتقل کر دیا تو وہ اپنا فرض ادا کرنے میں ناکام ہو جائے گی۔ ہندوستان میں جذبات اس حد تک مشتعل ہو چکے تھے کہ ذمے دار لوگ بھی ان کی رو میں بہہ گئے۔ لارڈ ویول کا خیال تھا کہ ایسی فضا میں برطانیہ کی دستبرداری کے نتیجے میں پورے ملک میں بڑے پیمانے پر بلوے اور فسادات پھوٹ پڑیں گے۔ ان حالات میں انہوں نے موجودہ صورت حال کو برقرار رکھنے اور دونوں پارٹیوں کے درمیان موجود اختلافات کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ اگر انگریز کانگریس اور لیگ میں مفاہمت کرائے بغیر ہندوستان سے رخصت ہو گئے تو یہ ہندوستان کے لیے خطرناک ہوگا اور اس سے ان کے وقار کو بھی دھچکا لگے گا۔

مسٹر اٹیلی اس سے متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایک مرتبہ تاریخ مقرر ہو گئی تو ذمے داری ہندوستانیوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے گی اور جب تک یہ نہیں کیا جائے گا، یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہو سکے گا۔ مسٹر اٹیلی کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر صورت حال جوں کی توں رہی تو ہندوستانیوں کو برطانیہ پر اعتماد نہیں رہے گا۔ ہندوستان کے حالات ایسے تھے کہ برطانوی اقتدار خاصی کوشش کے بغیر قائم نہیں رکھا جا سکتا تھا اور برطانوی قوم اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ انگریزوں کے پاس واحد متبادل طریقہ یہ تھا کہ وہ سختی کے ساتھ حکومت کر کے ہنگاموں کو دبا دیں یا پھر اقتدار کو ہندوستانیوں کے حوالے کر دیں۔ ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت برقرار رکھی جا سکتی تھی لیکن اس کے لیے جس جدوجہد کی ضرورت تھی، اس سے برطانیہ کی تعمیر نو کے منصوبوں میں خلل پڑ سکتا تھا۔ دوسرا متبادل طریقہ یہ تھا کہ اقتدار کی منتقلی کے لیے تاریخ مقرر کر کے پوری ذمے داری ہندوستانیوں کے کندھوں پر ڈال دی جاتی۔

لارڈ ویول اس سے قائل نہ ہوئے۔ ان کا اب بھی یہی موقف تھا کہ اگر فرقہ وارانہ مسائل کی وجہ سے تشدد ہوا تو تاریخ برطانیہ کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ انگریز سو برسوں سے زیادہ عرصے تک ہندوستان پر حکومت کر چکے تھے اور اب اگر ان کی واپسی کے نتیجے میں کسی قسم کی بے چینی، تشدد یا گڑبڑ ہوئی تو اس کا ذمے دار انہیں ہی ٹھہرایا جائے گا۔ لارڈ ویول نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ مسٹر اٹیلی کو قائل نہیں کر سکے تو انہوں نے اپنا استعفا پیش کر دیا۔

اب دس سال بعد جب میں پیچھے کی طرف مڑ کر ان واقعات پر غور کرتا ہوں تو بھی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کا موقف درست تھا؟ معاملات اس قدر پیچیدہ اور حالت اتنی نازک تھی کہ کوئی قطعی فیصلہ دینا مشکل ہے۔ مسٹر اٹیلی کے فیصلے کا محرک یہ عزم تھا کہ ہندوستان کو آزاد ہونے میں مدد دینی چاہیے۔ اگر کسی شخص کی ذرا سی سامراجی ذہنیت ہوتی تو وہ ہندوستان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ برطانوی حکومت ہندو مسلم اختلافات سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتی رہی ہے اور یہی اختلافات ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کے خلاف سب سے بڑی ڈھال تھے۔ مسٹر اٹیلی یہ عہد کر چکے تھے کہ لیبر حکومت ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گی جس سے اس پر حرف گیری ہو سکے۔

ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اگر ان کی نیت صاف نہ ہوتی اور وہ ہندو مسلم اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ ایسا کر سکتے تھے۔ انگریز ہماری مخالفت کے باوجود مزید دس سال تک اس ملک پر حکومت کر سکتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عرصے میں ہنگامے اور تصادم ہوتے رہتے۔ ہندوستانیوں کے جذبات اس قدر برانگیختہ ہو چکے تھے کہ برطانوی اقتدار کا قدم قدم پر مقابلہ کیا جاتا۔ لیکن اگر انگریز چاہتے تو ہمارے اختلافات کی آڑ لے کر ابھی چند سال تک حکومت کر سکتے تھے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ فرانس برطانیہ کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہوئے بھی ہند چینی پر دس سال تک حکومت کرتا رہا ہے اس لیے ہمیں لیبر حکومت کی نیک نیتی کو تسلیم کرنا چاہیے کیونکہ اس نے ہماری کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس فیصلے پر تاریخ میں لیبر حکومت کی ہمیشہ عزت کی جائے گی اور ہمیں بھی کسی قسم کے ذہنی تحفظات کے بغیر اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے۔

دوسری طرف یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ لارڈ ویول غلطی پر تھے۔ انہیں مستقبل میں جو خطرات نظر آ رہے تھے وہ حقیقی تھے اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ حالات کے بارے میں ان کا تجزیہ بالکل درست تھا۔ بہر حال یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان کے لیے وہ شکل بہتر تھی جو لارڈ ویول نے تجویز کی تھی یا وہ جو مسٹر اٹیلی نے اختیار کی۔ اگر لارڈ ویول کی تجویز پر عمل کیا گیا ہوتا اور ہندوستان کے مسئلے کا حل ایک یا دو سال کے لیے اٹھا رکھا جاتا تو ممکن ہے کہ مسلم لیگ مخالفت سے عاجز آ کر مصالحت کر لیتی۔ اگر مسلم لیگ زیادہ مثبت رویہ اختیار نہ کرتی تو غالباً ہندوستان کے مسلمان مسلم لیگ کے منفی رویے سے دلبرداشتہ ہو کر اسے مسترد کر

دیتے۔ ہوسکتا ہے کہ اس طرح ہندوستان کی تقسیم کا المیہ پیش نہ آتا۔ اس بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن قوموں کی تاریخ میں ایک دو برس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ فیصلہ شاید تاریخ ہی کرے گی کہ لارڈ ویول کی پالیسی پر عمل کرنا زیادہ دانشمندانہ تھا۔

جب یہ معلوم ہوا کہ لارڈ ویول مستعفی ہو رہے ہیں تو میں نے ایک بیان جاری کیا جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے بارے میں میری رائے کیا تھی؟ میں جانتا تھا کہ جواہر لعل اور میرے دوسرے ساتھی اس بارے میں مجھ سے متفق نہیں ہیں۔ وہ لارڈ ویول کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن میں نے اسے اپنا فرض سمجھا کہ لارڈ ویول کے کام کے بارے میں اپنی رائے عوام کے سامنے رکھ دوں۔ میں نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا:

☆ ہندوستان کے بارے میں مسٹر اٹیلی کے بیان نے میرے دل میں ملے جلے احساسات پیدا کیے ہیں۔ مجھے ایک طرف یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے جون ۱۹۴۵ میں حالات کا جو اندازہ لگایا تھا آنے والے واقعات نے اسے صحیح ثابت کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ لارڈ ویول، جنھوں نے ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان تعلقات کی تاریخ کا ایک نیا باب کھولا تھا، میدان سے کنارہ کش ہو رہے ہیں۔

☆ شملہ کانفرنس کے موقع پر برطانیہ کی نیت کے بارے میں ہر طرف شکوک وشبہات اور عدم اعتماد کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ خود میں بھی بدظن تھا۔ پچھلے تین برسوں کے واقعات کی تلخی کا اثر میرے دل و دماغ میں باقی تھا۔ اسی ذہنی کیفیت کے ساتھ میں شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا لیکن لارڈ ویول سے ملنے کے بعد میرے خیالات اچانک بدل گئے۔ میں نے انھیں ایک پرعزم اور کھرا سپاہی پایا جو بات کو طول دینا نہیں جانتا تھا اور انداز گفتگو میں بالکل سیدھا تھا۔ ان میں سیاستدانوں کی پرکاری نہیں تھی۔ وہ فوراً معاملے پر آ گئے اور میرے دل پر ان کے خلوص کا نقش بیٹھ گیا۔ میں نے ملک کو یہ مشورہ دینا اپنا فرض سمجھا کہ اسے اپنے سیاسی نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے تعمیری رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس وقت سے آج تک شبہات اور اختلافات کی فضا کے باوجود میں اپنی راہ سے نہیں ہٹا ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ شملہ کانفرنس کے بعد کم از کم چار مرتبہ خارجی اور اندرونی دباؤ ڈال کر یہ کوشش کی گئی کہ کانگریس راست اقدام اٹھانے پر مجبور ہو جائے اور عملی احتجاج کا طریقہ اختیار کرے لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ برطانوی حکومت کے مصالحانہ رویے کے پیش نظر یہ راستہ غلط ہوگا۔

☆ میں نے کانگریس کو استقلال کے ساتھ ایک راہ پر چلانے کے لیے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کیا اور آج مجھے اطمینان ہے کہ میں نے حالات کا جو تجزیہ کیا وہ غلط نہیں تھا۔ شملہ کانفرنس ناکام ہو گئی لیکن اس کے بعد جلد ہی انگلستان میں عام انتخابات ہوئے اور لیبر پارٹی برسراقتدار آ گئی۔ لیبر پارٹی کی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ اس نے ہندوستان کے بارے میں جو وعدے کیے تھے وہ انھیں پورا کرے گی۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کا اعلان خلوص نیت پر مبنی تھا۔

☆ مجھے نہیں معلوم کہ پچھلے تین ہفتوں میں لارڈ ویول اور حکومت برطانیہ کے درمیان کیا گفت وشنید ہوئی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں ایسے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جن کی بنا پر لارڈ ویول کو استعفا دینا پڑا۔ حالات کے بارے

میں ان کی جو رائے ہے، ہمیں اس سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے خلوص اور نیک نیتی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں یہ بھی نہیں بھول سکتا کہ آج ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کی جو فضا بدلی ہے وہ دراصل اس جرأت مندانہ قدم کی مرہون منت ہے جو لارڈ ویول نے جون ۱۹۴۵ میں اٹھایا تھا۔ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد چرچل کی حکومت نے ہندوستان کے مسئلے کو جنگ کے زمانے میں سرد خانے میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ خود ہندوستانیوں کو کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ۱۹۴۲ کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے تلخی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اس بند دروازے کو کھولنے کا سہرا بھی لارڈ ویول ہی کے سر ہے۔ انہوں نے ابتدا میں مخلوط برطانوی حکومت کی مخالفت کے باوجود اسے ہندوستان کے سامنے ایک نئی پیشکش رکھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ شملہ کانفرنس کی صورت میں برآمد ہوا۔ یہ کانفرنس کامیاب نہ ہوئی لیکن اس کے بعد سے آج تک جو کچھ ہوا، وہ اسی دلیرانہ اقدام کا منطقی نتیجہ ہے۔

☆ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان لارڈ ویول کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کرے گا۔ اور جب آزاد ہندوستان کا مورخ ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کا جائزہ لے گا تو وہ لارڈ ویول کو اس بنا پر تعریف کا سزاوار قرار دے گا کہ انہوں نے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کا ایک نیا باب کھولا تھا۔

اس شام لارڈ ویول کو الوداع کہنے کے لیے ڈنر کی تقریب ہوئی جس میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں نے انہیں الوداع کہی۔ ظاہر ہے کہ میرے بیان کا ان پر گہرا اثر ہوا تھا اور انہوں نے ایک دوست سے کہا: "مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان میں کم سے کم ایک ایسا شخص موجود ہے جس نے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے"۔

روانگی سے ایک روز پہلے انہوں نے کابینہ کے اجلاس کی آخری مرتبہ صدارت کی۔ کارروائی ختم ہونے پر انہوں نے مختصر بیان دیا جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ لارڈ ویول نے کہا: "میں ایک بہت ہی مشکل اور نازک وقت میں وائسرائے بنا، میں نے اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے کی امکان بھر کوشش کی۔ اب ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ مجھے مستعفی ہونا پڑا۔ تاریخ یہ فیصلہ کرے گی کہ آیا میں نے اس ایشو پر استعفا دے کر صحیح فیصلہ کیا تھا یا نہیں؟ بہر حال میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔ آپ سب لوگوں نے میرے ساتھ جو تعاون کیا، اس پر میں آپ کا شکر گزار ہوں"۔

یہ کہہ کر لارڈ ویول نے جلدی جلدی اپنے کاغذات سمیٹے اور ہمیں کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ اگلے دن وہ دہلی سے لندن روانہ ہو گئے۔

چودھواں باب

ماؤنٹ بیٹن مشن

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دوسری عالمگیر جنگ کے دوران شہرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے چند ماہ ہندوستان میں گزارے اور اس کے بعد اپنا ہیڈ کوارٹرز سیلون منتقل کر لیا۔ لارڈ ویول کے مستعفی ہونے کے بعد انہیں ہندوستان کا وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا۔ ہندوستان آنے سے پہلے لیبر حکومت نے انہیں تمام مسائل کے بارے میں اپنی رائے اور خواہش سے پوری طرح آگاہ کر دیا اور مسٹر ایٹلی نے انہیں ہدایت کی کہ اقتدار ۳۰ جون ۱۹۴۸ سے پہلے ہر صورت میں منتقل ہو جانا چاہیے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۲۲ مارچ کو دہلی پہنچے اور ۲۴ مارچ کو انہوں نے ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل کا حلف اٹھا لیا۔ حلف برداری کی تقریب کے فوراً بعد انہوں نے ایک مختصر تقریر کی جس میں انہوں نے اگلے چند مہینوں میں مسائل کا کوئی حل تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

اس کے فوراً بعد میں پہلی بار ان سے ملا۔ انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے کہا کہ برطانوی حکومت اقتدار منتقل کرنے کا قطعی ارادہ کر چکی ہے لیکن اس سے پہلے فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل نکالنا ضروری ہے اور ان کی خواہش ہے کہ اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے آخری اور فیصلہ کن کوشش ہونی چاہیے۔ انہوں نے اس معاملے میں مجھ سے پورا اتفاق کیا کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان اختلافات بہت کم ہو گئے ہیں۔ کیبنٹ مشن پلان میں آسام اور بنگال ایک ہی گروپ میں رکھے گئے تھے۔ کانگریس کا موقف یہ تھا کہ کسی صوبے کو کسی گروپ میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے اور ہر صوبہ یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ کسی گروپ میں شامل ہوگا یا نہیں؟ لیگ کا کہنا تھا کہ اس نے کیبنٹ مشن پلان کو اس بنیاد پر تسلیم کیا ہے کہ گروپ بحیثیت مجموعی ووٹ دے گا اور کوئی بھی صوبہ دستور بن جانے کے بعد ہی گروپ سے الگ ہو سکتا ہے۔ لیگ کا استدلال یہ تھا کہ پلان کی تجویزوں میں کسی قسم کا رد و بدل کرنے سے پورا معاہدہ منسوخ ہو جائے گا۔ اسی بنیاد پر لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو مسترد کر دیا تھا۔

یہ کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ لیگ نے آسام کے مسئلے پر اتنا زور کیوں دیا حالانکہ آسام مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ بھی نہیں تھا۔ خود لیگ کے نظریے کے مطابق آسام کو بنگال کے ساتھ شامل ہونے پر مجبور کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ قاعدے کے مطابق لیگ کا موقف جائز تھا لیکن اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے اس کا دعویٰ

کمزور تھا۔ میں نے کئی موقعوں پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اس مسئلے پر تبادلہ خیال کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ کانگریس اور لیگ کے اختلافات اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں کسی تیسرے فریق کی وساطت کے بغیر مصالحت ممکن نہیں۔ میری رائے یہ تھی کہ ہمیں یہ معاملہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کانگریس اور لیگ کو چاہیے کہ وہ یہ مسئلہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے رکھیں اور ان کی ثالثی قبول کر لیں۔ جواہر لعل اور سردار پٹیل نے میری اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ وہ دونوں اس قومی مسئلے کو کسی ثالث پر چھوڑنے کے خلاف تھے چنانچہ میں نے بھی اس نکتے پر مزید زور نہ دیا۔

اسی اثنا میں صورت حال روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ کلکتے کے بعد نواکھلی اور بہار میں فسادات پھوٹ پڑے۔ اس کے بعد بمبئی میں گڑبڑ شروع ہو گئی۔ پنجاب اب تک خاموش تھا لیکن اب وہاں بھی بے چینی اور کشیدگی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ ملک خضر حیات خان نے ۲ مارچ کو پنجاب کے وزیراعظم کے عہدے سے استعفا دے دیا۔ ۴ مارچ کو لاہور میں پاکستان کے خلاف مظاہرے ہوئے جن میں ۱۳ افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے۔ فسادات کی آگ آہستہ آہستہ صوبے کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل گئی اور امرتسر، ٹیکسلا اور راولپنڈی میں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے۔

ایک طرف فرقہ وارانہ منافرت تیز ہو رہی تھی اور دوسری طرف انتظامیہ غفلت اور لاپروائی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ یورپی سرکاری ملازمین کا اب کام میں جی نہیں لگ رہا تھا اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اقتدار جلد ہی ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گا۔ اب انہیں کام میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور وہ صرف وقت گزار رہے تھے۔ وہ لوگوں کو علانیہ کہتے تھے کہ اب وہ انتظامی امور کے ذمے دار نہیں ہیں۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں مزید بے چینی اور بے اطمینانی پھیل رہی تھی اور حکومت پر لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔

ایگزیکٹو کونسل میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان عدم تعاون کی وجہ سے حالات اور بھی خراب ہو گئے تھے۔ مرکزی حکومت کے ارکان ایک دوسرے کے دست بگریبان تھے چنانچہ حکومت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ مالیات کا محکمہ لیگ کے پاس تھا جس کی وجہ سے حکومت کی چابی اس کی جیب میں تھی۔ یاد رہے کہ اس صورت حال کی تمام تر ذمے داری سردار پٹیل پر تھی جنھوں نے امور داخلہ کو اپنے پاس رکھنے کی فکر میں مالیات کا محکمہ مسلم لیگ کو پیش کر دیا تھا۔ محکمہ مالیات میں کئی بہت ہی قابل اور سینئر مسلمان افسر موجود تھے جنھوں نے لیاقت علی کی ہر ممکن طریقے سے معاونت کی۔ ان کے مشورے سے وہ کونسل کے کانگریسی ارکان کی طرف سے پیش کی جانے والی ہر تجویز کو مسترد یا موخر کر سکتے تھے۔ سردار پٹیل نے دیکھا کہ وہ وزیر داخلہ ہوتے ہوئے لیاقت علی کی منظوری کے بغیر ایک چپڑاسی بھی بھرتی نہیں کر سکتے۔ غرض کانگریس کے ارکان کونسل پوری طرح بے بس ہو گئے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں۔

کانگریس نے مسلم لیگ کو مالیات کا محکمہ دینے کا جو احمقانہ اقدام کیا، اس کی وجہ سے سنگین صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس صورت حال کا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس عدم مفاہمت اور کونسل کے ارکان میں اختلافات کے باعث انہوں نے رفتہ رفتہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ گو بظاہر وہ ایک آئینی گورنر جنرل تھے لیکن حقیقت میں انہوں نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کانگریس اور لیگ کے ارکان پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ انہوں نے سیاسی مسئلے کو ایک نیا رخ دیا اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں پارٹیوں کے ارکان کو قائل کرنے کی کوشش شروع کر دی کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہو چکا ہے۔ انہوں نے پاکستان کی حمایت میں دلائل پیش کیے اور ایگزیکٹو کونسل کے کانگریسی ارکان کے ذہن میں تقسیم کے بیج بونا شروع کر دیے۔

میں یہ بات ریکارڈ پر لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں ماؤنٹ بیٹن کے دام خیال میں سب سے پہلے سردار پٹیل گرفتار ہوئے۔ مسٹر جناح کے لیے پاکستان بالکل آخر تک سودا کرنے کے لیے ایک مال تھا لیکن پاکستان کے لیے جدوجہد میں وہ حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ ان کے اقدام سے سردار پٹیل اس قدر ناراض اور مشتعل ہو گئے کہ انہوں نے تقسیم کے نظریے کو قبول کر لیا۔ وہ مالیات کا محکمہ مسلم لیگ کے سپرد کرنے کے ذمے دار تھے اس لیے انہیں لیاقت علی کے سامنے اپنی مجبوری پر اور بھی جھنجلاہٹ ہوتی تھی۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جب یہ تجویز کیا کہ ملک کی تقسیم ہی موجودہ مشکلات کا بہترین حل ہے تو انہوں نے سردار پٹیل کو ذہنی طور اس کے لیے آمادہ پایا۔ واقعہ یہ ہے کہ سردار پٹیل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے منظر عام پر آنے سے پہلے بھی تقسیم کے پچاس فی صد حامی تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام نہیں کر سکتے۔ وہ کھلم کھلا کہتے تھے کہ اگر انہیں مسلم لیگ سے نجات مل جائے تو وہ ہندوستان کا صرف ایک حصہ لینے کو تیار ہیں۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ولبھ بھائی پٹیل ہندوستان کی تقسیم کے بانی تھے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن بہت ہی ذہین آدمی تھے اور اپنے تمام ہندوستانی ساتھیوں کے دل کا حال معلوم کر لیتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ سردار پٹیل ان کا نظریہ قبول کرنے پر آمادہ ہیں تو انہوں نے اپنی شخصیت کی ساری دلفریبی اور طاقت سردار پٹیل کو مٹھی میں کرنے پر صرف کر دی۔ وہ اپنی نجی گفتگو میں پٹیل کو اخروٹ سے تشبیہ دیتے جس کا چھلکا بہت سخت ہوتا ہے لیکن اگر اسے ایک مرتبہ توڑ دیں تو اندر سے نرم گودا نکلتا ہے۔ بعض اوقات وہ مجھے مزاحیہ انداز میں بتاتے کہ میں نے اخروٹ سے بات کی ہے اور اخروٹ نے عام مسئلوں پر مجھ سے اتفاق کیا ہے۔

سردار پٹیل کی تسخیر کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن جواہر لعل کی طرف متوجہ ہوئے۔ پہلے تو جواہر لعل تقسیم کی بات بھی سننا نہیں چاہتے تھے اور اس نظریے کے بارے میں انہوں نے شدید ردعمل ظاہر کیا لیکن

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی کوششیں جاری رکھیں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ جواہر لعل کی مخالفت کا زور ٹوٹ گیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان آنے کے ایک ماہ کے اندر وہی جواہر لعل، جو تقسیم کے شدید مخالف تھے، اگر پوری طرح اس کے حامی نہیں بن گئے تو کم از کم اس خیال کو گوارا کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔

مجھے اکثر تعجب ہوتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواہر لعل کو کس طرح تسخیر کر لیا۔ جواہر لعل با اصول آدمی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ جذباتی بھی ہیں اور شخصیات کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے خیالات میں تبدیلی کی ایک وجہ لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی شخصیت بھی تھی۔ وہ نہایت ذہین خاتون ہیں اور ان کی طبیعت اور انداز میں بڑی دلکشی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی بڑی مداح تھیں اور بعض اوقات ان لوگوں کے سامنے اپنے شوہر کے خیالات کی ترجمانی کرتی تھیں جو شروع میں ان سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔

جواہر لعل کے خیالات میں تبدیلی کی ذمے دار ایک اور شخصیت کرشنا مینن کی تھی جو ۱۹۲۰ کے عشرے کے اوائل سے لندن میں رہتے تھے۔ جواہر لعل کی ان سے پہلی ملاقات ۱۹۲۰ کی دہائی کے آخری برسوں میں ہوئی۔ کرشنا مینن اپنے آپ کو جواہر لعل کا بڑا مداح ظاہر کرتے تھے۔ ☆ ہم سب اپنے مداحوں کو بہت پسند کرتے ہیں لیکن غالباً جواہر لعل میں خوشامد پسندی کا جوہر دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ ۱۹۳۰ کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں لیبر پارٹی نے مس ایلن ولکنسن کی قیادت میں ایک وفد کو ہندوستان بھیجا۔ کرشنا مینن کو اس وفد سے منسلک کر دیا گیا اور وہ بھی وفد کے ہمراہ ہندوستان آ گئے۔ وہ لندن میں انڈیا لیگ کی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی لیتے رہے تھے۔ اس عرصے میں ان کے کمیونسٹوں کے ساتھ روابط قائم ہو گئے۔ جواہر لعل جب دوبارہ لندن گئے تو کرشنا مینن نے ان سے پھر رابطہ کیا اور جواہر لعل کے ساتھ وفاداری کی تجدید کی۔

جنگ شروع ہوئی تو کرشنا مینن نے یہ تجویز پیش کی کہ انہیں لندن میں ہندوستان کے حق میں پروپیگنڈے کے لیے فنڈز مہیا کیے جائیں۔ جب ہٹلر نے روس پر حملہ کیا تو انہوں نے لندن میں روسی سفارت خانے کے ساتھ رابطہ کر لیا۔ انہوں نے ہمیں کئی پیغامات بھیجے کہ وہ جواہر لعل کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے روسی سفیر کے ساتھ ملاقاتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کے لیے حمایت حاصل کرنے کی غرض سے مختلف تجویزیں بھی بھیجیں اور کئی اسکیمیں تیار کیں جن پر عملدرآمد کے لیے کانگریس سے مالی امداد کا مطالبہ کیا۔ جواہر لعل اس سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ میں انہیں کچھ رقم دے دوں۔ میں نے یہ رقم بھجوا دی اور یہ معاملہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھ دیا۔ گاندھی جی اور سردار پٹیل نے صاف صاف لفظوں میں مجھ سے کہا کہ وہ میرے اس اقدام کو پسند نہیں کرتے۔ لیکن چونکہ میں نے یہ رقم نیک نیتی سے بھجوائی ہے اس لیے وہ کچھ نہیں کہیں گے البتہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آئندہ کوئی رقم نہ بھیجوں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ

لندن میں مقیم ہندوستانیوں کی کرشنا مینن کے بارے میں رائے اچھی نہیں۔ ان کے حامیوں کی تعداد بہت مختصر ہے لیکن ان کے مخالفین بہت زیادہ ہیں جو اُن پر ہر طرح کے الزامات عائد کرتے ہیں۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان کا طرز عمل قابل ملامت ہے چنانچہ میں ان پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ بعد میں رونما ہونے والے واقعات سے ثابت ہو گیا کہ کرشنا مینن کے بارے میں گاندھی جی اور سردار پٹیل کے شکوک و شبہات درست تھے۔ ان کی گزر اوقات خیرات پر تھی۔ وہ ایک ناقابل اعتبار شخص تھے اور انہیں عوامی فنڈز کے بے دریغ استعمال پر کوئی تشویش نہیں ہوتی تھی۔ بیشتر لوگ تو ان کے بارے میں اس سے بھی بری رائے رکھتے تھے اور انہیں کھلم کھلا ایک بددیانت شخص قرار دیتے تھے۔

جب عبوری حکومت قائم ہوئی تو جواہر لعل کرشنا مینن کو لندن میں ہائی کمشنر مقرر کرنا چاہتے تھے لیکن لارڈ ویول رضامند نہ ہوئے۔ برطانوی حکومت نے یہ ہدایت بھی کی کہ چونکہ وہ کمیونسٹ ہیں اس لیے ان کا تقرر مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے فوراً بعد لارڈ ویول جب ہندوستان سے چلے گئے تو کرشنا مینن ہندوستان آ گئے اور جواہر لعل کے ہاں ٹھہرے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے فوری طور پر بھانپ لیا کہ کرشنا مینن جواہر لعل کی کمزوری ہیں جس سے فائدہ اٹھا کر وہ جواہر لعل کو زیر دام لا سکتے ہیں۔ لارڈ ویول نے کرشنا مینن کے تقرر کی مخالفت کی تھی لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان کا سرپرست بننے کا فیصلہ کر لیا اور کئی مواقع پر وائسرائے ہاؤس میں انہیں مدعو کیا۔ کرشنا مینن کمیونسٹ رجحانات رکھتے تھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا رویہ دوستانہ ہے اور وہ انہیں کوئی منصب دلا سکتے ہیں تو وہ راتوں رات برطانیہ کے حامی بن گئے۔ انہوں نے برطانیہ کے بارے میں جن دوستانہ جذبات کا اظہار کیا اس سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن بہت متاثر ہوئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے محسوس کیا کہ جواہر لعل کو اپنی ہندوستان کی تقسیم کی اسکیم منوانے میں کرشنا مینن مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس سوال پر کرشنا مینن نے جواہر لعل پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا ہوگا۔ کچھ عرصے کے بعد جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کرشنا مینن کو لندن میں ہائی کمشنر مقرر کرنے کے سلسلے میں جواہر لعل کو امداد کی پیشکش کی تھی تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی ☆

جب مجھے معلوم ہوا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا خیال ہندوستان کی تقسیم کی طرف جا رہا ہے اور انہوں نے جواہر لعل اور پٹیل کو راضی کر لیا ہے تو میں بہت پریشان ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ ملک کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ پیدا ہو رہا ہے کیونکہ ہندوستان کی تقسیم نہ صرف مسلمانوں بلکہ پورے ملک کے لیے مضرت رساں تھی۔ میں پہلے بھی یہی سمجھتا تھا اور مجھے اب بھی یقین ہے کہ کیبنٹ مشن کا پلان ہر لحاظ سے ہمارے مسائل کا بہترین حل تھا۔ اس سے ہندوستان کا اتحاد بھی قائم رہتا اور ہر طبقے کو آزادی اور عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع بھی

ملتا۔ صرف مسلمانوں کے مفاد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بھی اس سے بہتر صورت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ جن صوبوں میں ان کی اکثریت تھی وہاں انہیں مکمل داخلی خود مختاری حاصل ہوتی اور مرکز میں تناسب سے زیادہ نمائندگی ملتی۔ جب تک فرقہ وارانہ رقابتیں اور شکوک و شبہات قائم رہتے اس وقت تک کے لیے ان کے حقوق کے تحفظ کا کافی انتظام کیا گیا تھا۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ اگر آزاد ہندوستان کا دستور ان خطوط پر تیار ہوا اور کچھ دیر تک اس پر ایمانداری سے عملدرآمد ہوا تو فرقہ وارانہ شبہات اور بے اعتمادی کی فضا بہت جلد چھٹ جائے گی۔ ملک کے حقیقی مسائل معاشی تھے نہ کہ فرقہ وارانہ۔ اختلافات جماعتوں کے درمیان نہیں بلکہ طبقوں کے درمیان تھے۔ ملک کے آزاد ہونے کے بعد ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کو اپنے اصلی مسائل کا ادراک ہو جاتا اور فرقہ وارانہ اختلافات دور ہو جاتے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ میرے ساتھی اس معاملے میں آخری قدم نہ اٹھائیں۔ میں نے دیکھا کہ سردار پٹیل اس حد تک تقسیم پر تلے ہوئے ہیں کہ وہ کوئی اور رائے سننے کو تیار نہیں ہیں۔ میں کوئی دو گھنٹے تک ان سے بحث کرتا رہا۔ میں نے کہا کہ اگر ہم نے تقسیم کو مان لیا تو اس سے ہندوستان کے لیے ایک مستقل مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ تقسیم سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ فرقہ واریت ملک کی ایک دائمی خصوصیت بن جائے گی۔ مسٹر جناح نے دو قوموں کا نعرہ لگایا تھا اور تقسیم پر راضی ہو جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اس نظریے کو درست مان لیا ہے۔ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں کی بنیاد پر ملک کو تقسیم کرنے پر کس طرح رضامند ہو سکتی ہے؟ تقسیم سے فرقہ وارانہ خوف دور نہیں ہوگا بلکہ فرقہ وارانہ منافرت کی بنیاد پر دو ریاستوں کو وجود میں لا کر خوف کی یہ کیفیت ہمیشہ کے لیے قائم ہو جائے گی۔ جب ایک مرتبہ نفرت کی بنیاد پر دو الگ ریاستیں بنا دی گئیں تو پھر کوئی نہیں جانتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

سردار پٹیل کا یہ جواب سن کر مجھے تعجب بھی ہوا اور تکلیف بھی کہ چاہے ہم پسند کریں یا نہ کریں لیکن ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ اب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر کے ایک قوم نہیں بنایا جا سکتا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور صرف اسی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی لڑائی ختم ہو سکتی ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ اگر دو بھائی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تو وہ الگ ہو جاتے ہیں۔ جب الگ ہونے پر انہیں اپنا اپنا حصہ مل جاتا ہے تو وہ دوست بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر انہیں اکٹھے رہنے پر مجبور کیا جائے تو وہ ہر روز ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں۔ آئے دن کی ٹو ٹو مَیں مَیں سے بہتر ہے کہ ایک ہی مرتبہ کھل کر لڑ لیا جائے اور پھر علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پٹیل اب مسٹر جناح کے مقابلے میں دو قومی نظریے کے بڑے حامی بن گئے ہیں۔ مسٹر جناح نے تو تقسیم کا پرچم بلند کیا تھا لیکن پٹیل تو اس نظریے کے حقیقی علمبردار بن گئے تھے۔

اب میں نے جواہر لعل کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے تقسیم کی حمایت میں پٹیل کی طرح باتیں نہ کیں۔ اصل میں انہوں نے اعتراف کیا کہ تقسیم فی نفسہٖ غلط ہے لیکن ایگزیکٹو کونسل میں لیگ کے ممبروں نے جس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے اشتراک عمل کی تمام امیدیں دم توڑ گئی ہیں۔ کانگریس اور لیگ دونوں پارٹیوں کے ارکان میں کسی بات پر اتفاق نہیں اور وہ آئے دن جھگڑتے رہتے ہیں۔ جواہر لعل نے کامل مایوسی کے ساتھ مجھ سے سوال کیا کہ ایسی صورت میں تقسیم کی متبادل صورت کیا ہو سکتی ہے؟

جواہر لعل گفتگو کے دوران رنجیدہ تھے لیکن مجھے اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ ان کا ذہن کس طرح کام کر رہا تھا۔ انہیں تقسیم کے خیال سے سخت نفرت تھی، اس کے باوجود وہ روز بروز اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ تقسیم کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ وہ مانتے تھے کہ تقسیم بہترین حل نہیں اور واقعہً بھی یہی ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا یہ بہتر حل نہیں تھا لیکن ان کا خیال تھا کہ حالات ہمیں مجبور کر کے اسی کی طرف لیے جا رہے ہیں۔

کچھ دنوں بعد جواہر لعل دوبارہ ملنے کے لیے میرے ہاں آئے۔ انہوں نے گفتگو کا آغاز ایک لمبی تمہید سے کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ہمیں خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے بجائے حقائق کا سامنا کرنا چاہیے۔ پھر وہ اصل مطلب پر آ گئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ میں تقسیم کی مخالفت چھوڑ دوں۔ انہوں نے کہا کہ ان کے خیال میں تقسیم ناگزیر ہے اور دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ جو بات ہونے والی ہے، اس کی مخالفت نہ کی جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس مسئلے میں میری طرف سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مخالفت کرنا مصلحت کے خلاف ہوگا۔

میں نے جواہر لعل سے کہا کہ میں ان کی بات ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں بالکل صاف صاف دیکھ رہا ہوں کہ ہم یکے بعد دیگرے غلط فیصلے کر رہے ہیں۔ ہم اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنے کے بجائے دلدل میں مزید پھنستے چلے جا رہے ہیں۔ مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو تسلیم کر لیا تھا اور ہندوستان کے مسئلے کا اطمینان بخش حل سامنے نظر آ رہا تھا۔ عین اس مرحلے پر جواہر لعل نے بمبئی میں پریس کانفرنس کے دوران ایک افسوسناک اعلان کر دیا۔ انہوں نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے جب یہ اعلان کیا کہ کانگریس نے صرف دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کو منظور کیا ہے تو انہوں نے مسٹر جناح کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ لیگ کی جانب سے پلان کو تسلیم کرنے کے فیصلے کو واپس لے لیں۔

میں نے کہا ہم نے دوسری غلطی اس وقت کی جب لارڈ ویول نے تجویز کیا کہ داخلہ امور کا محکمہ مسلم لیگ کو دے دیا جائے۔ اس سے ہمارے لیے مشکلات کا کوئی پہاڑ کھڑا نہ ہو جاتا لیکن چونکہ پٹیل اس محکمے کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اس لیے ہم نے مالیات کا محکمہ خود مسلم لیگ کو دے دیا۔ ہماری موجودہ مشکلات کا اصل سبب یہی ہے۔ اب ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ ہم تقسیم کے مسٹر جناح سے بڑے حامی بنتے جا

رہے ہیں۔ میں نے جواہر لعل کو خبردار کیا کہ اگر ہم تقسیم پر راضی ہو گئے تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ تاریخ یہ فیصلہ دے گی کہ ہندوستان کو مسلم لیگ نے نہیں، کانگریس نے تقسیم کیا تھا۔

اب جبکہ سردار پٹیل بلکہ جواہر لعل بھی تقسیم کے حامی ہو گئے تھے اس لیے میری آخری امید گاندھی جی تھے۔ اس وقت گاندھی جی پٹنہ میں مقیم تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے چند مہینے نواکھلی میں گزارے تھے جہاں کے مقامی مسلمان ان سے بہت متاثر ہوئے اور ہندو مسلم اتحاد کی ایک نئی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے لیے دہلی آئیں گے چنانچہ وہ ۳۱ مارچ کو دہلی پہنچ گئے۔ میں فوراً ان سے ملنے گیا تو پہلے جملے جو انہوں نے مجھ سے کہے وہ یہ تھے: ''تقسیم اب واقعی ایک خطرہ بن گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ولبھ بھائی بلکہ جواہر لعل تک نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اب آپ کیا کریں گے؟ کیا آپ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل گئے ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''میں تقسیم کا مخالف رہا ہوں اور اب بھی اس کے خلاف ہوں، میں تو یہ کہوں گا کہ میں تقسیم کا جتنا سخت مخالف آج ہوں اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔ مگر میں اس بات سے سخت پریشان ہوں کہ جواہر لعل اور پٹیل نے بھی ہار مان لی ہے یا جیسا کہ آپ نے کہا ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اب مجھے جو امید ہے صرف آپ سے ہے۔ اگر آپ نے استقلال کے ساتھ تقسیم کی مخالفت کی تو ہم اب بھی بچ سکتے ہیں لیکن اگر آپ بھی مان گئے تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہندوستان ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

گاندھی جی نے کہا: ''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! اگر کانگریس نے تقسیم کو منظور کیا تو وہ صرف میری لاش کو روند کر ہی ایسا کر سکتی ہے۔ جب تک میرے جسم میں جان ہے، میں ہندوستان کی تقسیم پر ہرگز راضی نہیں ہوں گا اور اگر میرا بس چلا تو کانگریس کو بھی راضی نہیں ہونے دوں گا''۔

اسی روز بعد میں گاندھی جی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ انہوں نے اگلے دن اور پھر ۲ اپریل کو بھی ان سے ملاقاتیں کیں۔ پہلی ملاقات سے واپسی کے فوراً بعد سردار پٹیل گاندھی جی کے پاس آئے اور دو گھنٹے سے زیادہ تخلیے میں گفتگو کرتے رہے۔ اس ملاقات کے دوران دونوں میں کیا باتیں ہوئیں، مجھے ان کے بارے میں کوئی علم نہیں لیکن جب اس کے بعد میں گاندھی جی سے ملا تو مجھے یہ جان کر زندگی کا سب سے بڑا صدمہ پہنچا کہ گاندھی جی بھی بدل گئے ہیں۔ اب وہ کھلم کھلا تقسیم کی حمایت تو نہیں کر رہے تھے البتہ ان کی مخالفت میں پہلے جیسی شدت نہیں رہی تھی۔ مجھے اس سے بھی زیادہ حیرت اور دکھ اس بات سے ہوا کہ اب وہ بھی وہی دلیلیں پیش کرنے لگے تھے جو میں سردار پٹیل کی زبانی پہلے ہی سن چکا تھا۔ میں دو گھنٹے تک ان سے بحث کرتا رہا لیکن میری دلیلوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

آخر ناامید ہو کر میں نے کہا: "اگر آپ کے خیالات بھی یہی ہیں تو مجھے ہندوستان کو تباہی سے بچانے کی کوئی امید نظر نہیں آتی"۔

گاندھی جی نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پھر کہنے لگے میں پہلے ہی یہ تجویز کر چکا ہوں کہ ہمیں جناح کو حکومت بنانے اور کابینہ کے ارکان منتخب کرنے کی دعوت دینی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھی یہ بات کہہ چکے ہیں اور ماؤنٹ بیٹن اس سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہی ہوا ہے۔ گاندھی جی کی اس ملاقات کے دوسرے روز جب میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر کانگریس گاندھی جی کی تجویز مان لے تو تقسیم سے بچنا اب بھی ممکن ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس سے متفق تھے کہ مسلم لیگ کانگریس کی اس پیشکش سے مطمئن ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ مسٹر جناح کو بھی اعتماد ہو جائے۔ بدقسمتی سے جواہر لعل اور سردار پٹیل کی شدید مخالفت کے باعث یہ بات بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں نے گاندھی جی پر زور دیا کہ وہ اپنی تجویز واپس لے لیں۔

گاندھی جی نے اس بات کو یاد دلاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ اب صورت حال ایسی ہے کہ تقسیم ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ اب صرف یہ طے کرنا ہے کہ تقسیم کی صورت کیا ہو؟ یہ وہ مسئلہ تھا جس پر گاندھی جی کے کیمپ میں دن رات بحث ہونے لگی تھی۔

میں نے اس سارے معاملے پر بہت غور و خوض کیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر گاندھی جی نے اپنی رائے اتنی جلدی کیسے بدل دی؟ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ سردار پٹیل کے اثر کا نتیجہ تھا۔ پٹیل کھلے بندوں یہ کہہ رہے تھے کہ تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تجربے سے ثابت ہو گیا ہے کہ مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ غالباً ایک اور بات بھی سردار پٹیل کے پیش نظر تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کہتے تھے کہ کانگریس صرف لیگ کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے مرکز کو کمزور رکھنے پر رضا مند ہوئی تھی اور اسی وجہ سے صوبوں کو مکمل خود مختاری دی گئی تھی۔ لیکن ایک ایسے ملک میں، جو زبان، مذہب اور ثقافت کی وجہ سے کئی حصوں میں منقسم ہو، وہاں کمزور مرکزی حکومت سے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے رجحانات کو تقویت مل سکتی ہے۔ اگر مسلم لیگ نہ ہو تو ایک مضبوط مرکزی حکومت کا انتظام کیا جا سکتا ہے اور ایک ایسا دستور مرتب ہو سکتا ہے جو ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مشورہ دیا کہ شمال مغرب اور شمال مشرق کے چند چھوٹے ٹکڑوں کو دے کر باقی ہندوستان کو ایک مضبوط اور مستحکم ریاست بنایا جا سکتا ہے۔ سردار پٹیل پر اس دلیل کا گہرا اثر ہوا کہ مسلم لیگ کے ساتھ اشتراک سے ہندوستان کا اتحاد اور استحکام خطرے میں پڑ جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ صرف سردار پٹیل ہی نہیں، جواہر لعل بھی ان دلیلوں سے متاثر تھے۔ سردار پٹیل اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جب ان دلیلوں کو دہرایا تو گاندھی جی تقسیم کی مخالفت کرنے میں کمزور پڑ گئے۔

شروع سے آخر تک میری یہ کوشش رہی کہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس بات پر آمادہ کروں کہ وہ کیبنٹ مشن پلان کے بارے میں ٹھوس موقف اختیار کریں۔ جب تک گاندھی جی کا یہ خیال رہا، اس وقت تک میں مایوس نہیں ہوا تھا۔ اب جو اُن کا نظریہ بدل گیا تو میں سمجھ گیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن میری تجویز سے اتفاق نہیں کریں گے۔ ممکن ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو کیبنٹ مشن پلان سے زیادہ لگاؤ اس لیے نہ رہا ہو کیونکہ وہ ان کے دماغ کی تخلیق نہیں تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ تاریخ میں ان کا نام ایک ایسے شخص کی حیثیت سے یاد رکھا جائے جس نے ہندوستان کا مسئلہ حل کیا ہو۔ اگر ہندوستان کے مسئلے کا ان کے پلان کے مطابق حل تلاش کر لیا جاتا ہے تو اس سے ان کی عظمت میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا، اس لیے اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ جیسے ہی انہوں نے یہ دیکھا کہ لوگ کیبنٹ مشن پلان کے خلاف ہیں تو انہوں نے تقسیم کے پلان کو، جو اُن کے خیالات کے مطابق تھا، اس کی جگہ پیش کر دیا۔

اب جبکہ لوگ عام طور سے تقسیم پر راضی معلوم ہوتے تھے، بنگال اور پنجاب کے مسئلے کو ایک نئی اہمیت حاصل ہو گئی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ چونکہ تقسیم کی بنیاد مسلمانوں کے اکثریتی علاقے تھے اور چونکہ بنگال اور پنجاب دونوں میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی، اس لیے ان دونوں صوبوں کو بھی تقسیم ہونا چاہیے البتہ انہوں نے کانگریس کے لیڈروں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ فی الحال اس سوال کو نہ اٹھائیں۔ انہوں نے یقین دلایا کہ وہ اس مسئلے کو مناسب موقعے پر خود اٹھائیں گے۔

گاندھی جی کی پٹنہ روانگی سے پہلے میں نے ان سے ایک آخری اپیل کی۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ حالات کی موجودہ شکل کو دو سال تک برقرار رکھا جائے۔ اس وقت اقتدار عملاً ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے اور اگر قانونی منتقلی کو دو سال کے لیے موخر کر دیا جائے تو ممکن ہے کہ کانگریس اور لیگ مصالحت پر آمادہ ہو جائیں۔ خود گاندھی جی نے چند ماہ پیشتر یہی تجویز پیش کی تھی۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ قوموں کی تاریخ میں دو سال کی میعاد کوئی لمبی مدت نہیں ہوا کرتی۔ اگر ہم نے دو سال تک انتظار کر لیا تو مسلم لیگ سمجھوتا کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اگر اس وقت کوئی فیصلہ کر لیا گیا تو ملک کی تقسیم ناگزیر ہو جائے گی۔ ایک دو سال میں کسی بہتر حل کی توقع کی جا سکتی ہے۔ گاندھی جی نے میری تجویز کو مسترد نہ کیا تاہم انہوں نے اس تجویز کے بارے میں جوش و خروش کا مظاہرہ بھی نہ کیا۔

اس اثنا میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم سے متعلق اپنی تجویزیں مرتب کر لی تھیں۔ اب انہوں نے برطانوی حکومت سے صلاح مشورہ کرنے اور اس کی منظوری حاصل کرنے کے لیے لندن جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ اپنے منصوبے کے لیے کنزرویٹو پارٹی کی تائید بھی حاصل کر لیں گے۔

کنزرویٹو پارٹی نے اس بنیاد پر کیبنٹ مشن پلان کی مخالفت کی تھی کہ اس سے مسلم لیگ کا ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ پورا نہیں ہوتا تھا۔ اب جبکہ ماؤنٹ بیٹن کی تجویز کی اساس ہی ملک کی تقسیم پر رکھی گئی تھی اس لیے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ مسٹر چرچل اس کی حمایت کریں گے۔

۸مئی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد میں شملہ چلا گیا۔ چند روز بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی وہاں آ گئے۔ وہ لندن جانے سے پہلے چند روز آرام کرنا چاہتے تھے۔ پروگرام کے مطابق انہیں ۱۵مئی کو واپس دہلی اور ۱۸ کو لندن روانہ ہونا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیبنٹ مشن پلان کو بچانے کی آخری کوشش کر لوں چنانچہ ۱۴مئی کی رات میں نے وائسریگل لاج میں ان سے ملاقات کی۔

ہماری گفتگو ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک جاری رہی۔ میں نے ان سے اپیل کی کہ وہ کیبنٹ مشن پلان کو دفن نہ کریں۔ میں نے کہا کہ ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے کیونکہ اس پلان کی کامیابی کی امید اب بھی باقی ہے۔ اگر ہم نے عجلت سے تقسیم کو منظور کر لیا تو اس سے ہندوستان کو ایک مستقل نقصان پہنچے گا۔ ایک بار ملک تقسیم ہو گیا تو پھر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے اور ایک مرتبہ اٹھے ہوئے قدم کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یہ بھی بتایا کہ غالباً مسٹر اٹیلی اور ان کے ساتھی کیبنٹ مشن پلان کو آسانی سے ترک نہیں کریں گے کیونکہ اسے ان لوگوں نے نہایت عرق ریزی کے بعد تیار کیا تھا۔ اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی اس سے اتفاق کیا اور احتیاط سے کام لینے پر زور دیا تو ممکن ہے کہ کابینہ اس پر اعتراض نہ کرے۔ اب تک کانگریس ہی ہندوستان کی فوری آزادی کا مطالبہ کرتی رہی ہے۔ اب خود کانگریس ہی یہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا حل ایک یا دو سال کے لیے ملتوی رکھا جائے۔ اگر برطانیہ کانگریس کی درخواست پر عمل کرے تو اس پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی توجہ معاملے کے ایک اور پہلو کی طرف بھی مبذول کرائی۔ اگر اب برطانیہ نے ہندوستان کو آزادی دینے میں جلد بازی سے کام لیا تو آزاد اور غیر جانبدار مبصر یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ برطانیہ ہندوستان کو ایسے حالات میں آزاد کرنا چاہتا تھا جب وہ اس سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ہندوستان کی خواہش کے خلاف تقسیم پر اصرار کرنے سے یہ شبہ پیدا ہو گا کہ برطانیہ کی نیت صاف نہیں تھی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھے یقین دلایا کہ وہ برطانوی کابینہ کے سامنے مکمل اور صحیح تصویر پیش کریں گے اور وہ سب کچھ بیان کر دیں گے جو انہوں نے پچھلے دو مہینوں میں دیکھا یا سنا ہے۔ وہ برطانوی کابینہ کو یہ بھی بتائیں گے کہ کانگریس کا ایک اہم طبقہ یہ چاہتا ہے کہ اس مسئلے کو ایک یا دو سال کے لیے ملتوی رکھا جائے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مسٹر اٹیلی اور سر اسٹیفرڈ کرپس کو یہ بتا دیں گے کہ اس معاملے میں میری رائے کیا ہے۔ برطانوی حکومت قطعی فیصلے پر پہنچنے کے لیے سارے مواد کو سامنے رکھے گی۔

میں نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ وہ ملک کی تقسیم کے ممکنہ نتائج کو بھی ذہن میں رکھیں۔ کلکتے، نوا کھلی، بہار، بمبئی اور پنجاب میں تقسیم کے بغیر ہی فسادات ہوئے ہیں اور ہندوؤں نے مسلمانوں اور مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملے کیے ہیں۔ اس فضا میں اگر ملک تقسیم ہوا تو ملک کے مختلف حصوں میں خون کی ندیاں بہیں گی اور اس خون خرابے کی ذمے داری انگریزوں پر ہوگی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک لمحے کے لیے توقف کیے بغیر فوراً جواب دیا: "میں کم سے کم ایک معاملے میں تو آپ کو پورا یقین دلاتا ہوں کہ میں خوں ریزی اور فسادات بالکل نہیں ہونے دوں گا۔ میں ایک سپاہی ہوں، سویلین نہیں۔ ایک بار جب تقسیم اصولاً مان لی جائے گی تو میں یہ حکم جاری کر دوں گا کہ ملک میں کہیں فرقہ وارانہ فسادات نہ ہونے پائیں۔ اگر اس قسم کی کوئی معمولی تحریک بھی ہوئی تو میں سخت سے سخت قدم اٹھاؤں گا اور فسادات کو ابتدا ہی میں دبا دوں گا۔ اس کام کے لیے میں مسلح پولیس پر بھی بھروسا نہیں کروں گا بلکہ فوج اور ائر فورس کو کارروائی کا حکم دوں گا اور انہیں کہوں گا کہ وہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے شرارت کرنے والوں کو کچل ڈالیں"۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھے یہ تاثر دیا کہ وہ ذہن میں تقسیم کا کوئی خاص نقشہ لے کر لندن نہیں جا رہے اور انہوں نے کیبنٹ مشن پلان کو مکمل طور پر ترک نہیں کیا۔ بعد کے واقعات نے مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے بعد میں جس طریقے سے عمل کیا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے اور برطانوی کابینہ کو تقسیم کا پلان منظور کرنے پر آمادہ کرنے کی غرض سے لندن جا رہے تھے۔

ساری دنیا جانتی ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس دلیرانہ اعلان کا انجام کیا ہوا؟ جب ملک کی تقسیم عمل میں آئی تو ملک کے بیشتر حصوں میں خون کی ندیاں بہہ گئیں، بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام ہوا، ہندوستان کی فوج تقسیم کر دی گئی اور بے گناہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتل کو روکنے کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہو سکی۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

میرے دل میں ایک موہوم سی امید اب بھی باقی تھی کہ برطانیہ کی لیبر کابینہ کیبنٹ مشن پلان کو آسانی سے مسترد نہ ہونے دے گی۔ اس پلان کی تشکیل کابینہ کے ان تین ارکان نے کی تھی جو لیبر حکومت کے بھی اہم ممبر تھے۔ یہ درست ہے کہ اس وقت تک لارڈ پیتھک لارنس ہندوستان کے وزیر خارجہ کے عہدے سے مستعفی ہو چکے تھے لیکن سر اسٹیفرڈ کرپس اور مسٹر الیگزینڈر اب بھی برطانوی کابینہ کے رکن تھے۔ مجھے پوری امید تھی کہ وہ اس پلان کو بچانے کی آخری کوشش کریں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے لندن پہنچنے کے فوراً بعد مجھے یہ سن کر بہت دکھ ہوا کہ برطانوی کابینہ نے ان کی مجوزہ اسکیم منظور کر لی ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پلان کی تفصیلات ابھی تک شائع نہیں ہوئی تھیں لیکن مجھے پتا تھا کہ اس میں ہندوستان کی تقسیم تجویز کی گئی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن ۳۰ مئی کو دہلی واپس آ گئے۔ انہوں نے ۲ جون کو کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کے ساتھ گفت و شنید کی۔ ۳ جون کو ایک وائٹ پیپر شائع کیا گیا جس میں اس پلان کی پوری تفصیل دی گئی تھی۔ برطانوی حکومت نے اس سلسلے میں جو بیان جاری کیا وہ ضمیمہ نمبر ۵ میں درج ہے۔ یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے بدترین اندیشے درست ثابت ہو چکے تھے۔ اس اعلان کا مثبت پہلو صرف یہ تھا کہ اقتدار ۳۰ جون ۱۹۴۸ تک ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل کر دیا جائے گا۔ لیکن مسٹر اٹیلی پہلے یہ اعلان کر چکے تھے اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ آزادی کی قیمت ملک کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنا طے پا گئی تھی۔

اس بیان کے شائع ہونے کے ساتھ ہی ہندوستان کو متحد رکھنے کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کیبنٹ مشن پلان کو بالائے طاق رکھ کر ملک کی تقسیم کو سرکاری طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ جب میں نے لیبر حکومت کے رویے میں تبدیلی کی تشریح کرنے کی کوشش کی تو میں اس تکلیف دہ نتیجے پر پہنچا کہ برطانوی حکومت کے اس فیصلے میں ہندوستان کے مقابلے میں برطانیہ کے مفادات کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ لیبر پارٹی نے ہمیشہ کانگریس اور اس کے لیڈروں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور کئی بار کھلم کھلا یہ اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگ ایک رجعت پسند جماعت ہے۔ اب اسی مسلم لیگ کے مطالبات کے آگے ہتھیار ڈالنے کا مطلب میری رائے میں مسلم لیگ کو خوش کرنے سے زیادہ برطانوی مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔ اگر کیبنٹ مشن پلان کے تحت متحدہ ہندوستان کو آزادی ملتی تو برطانیہ کے لیے ہندوستان کی اقتصادی اور صنعتی زندگی میں پہلے جیسے عمل دخل کا امکان

ختم ہو جاتا۔ اس کے برعکس ہندوستان کی تقسیم اور مسلم اکثریت کے صوبوں پر مشتمل ایک الگ اور خودمختار ریاست کے قیام سے برطانیہ کی طرف سے ہندوستانی زندگی کو اپنی گرفت میں رکھنے کی پوزیشن برقرار رہتی۔ ایک ایسی ریاست، جس میں مسلم لیگ برسراقتدار ہو، مستقل طور پر برطانیہ کے حلقہ اثر میں رکھی جا سکتی تھی۔ اس کا اثر ہندوستان کے رویے پر بھی پڑ سکتا تھا۔ ہندوستان کو یہ دیکھ کر کہ اس کی سرحدوں پر برطانیہ کا اڈہ ہے، برطانوی مفادات کا لحاظ رکھنا پڑے گا۔ شاید اور کسی صورت میں وہ اتنا لحاظ نہ کرتا۔

یہ سوال ایک عرصے سے زیر بحث تھا کہ آیا آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستان دولت مشترکہ کا رکن رہے گا یا نہیں؟ کیبنٹ مشن پلان میں یہ فیصلہ آزاد ہندوستان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں نے اس وقت سراسٹیفرڈ کرپس سے کہا تھا کہ ممکن ہے خود ہندوستان آزادانہ طور پر دولت مشترکہ میں ہی رہنا پسند کرے لیکن ہندوستان کی تقسیم سے جو صورت حال پیدا ہو رہی تھی، وہ برطانیہ کے حق میں تھی۔ مسلم لیگ کے مطالبے پر قائم ہونے والی ایک نئی ریاست کا دولت مشترکہ میں رہنا یقینی تھا۔ اگر پاکستان کامن ویلتھ میں شامل ہوا تو ہندوستان کو بھی مجبوراً یہی راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ لیبر حکومت نے ان تمام عوامل کا یقیناً جائزہ لیا ہوگا۔ انہوں نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا عہد کیا تھا لیکن وہ یہ بھی نہیں بھول سکتے تھے کہ سیاسی جدوجہد کے دوران کانگریس نے ہمیشہ برطانیہ کی مخالفت اور لیگ نے اس کی حمایت کی تھی۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کو تقسیم کرنے اور مسلم لیگ کو مطمئن کرنے کے لیے ایک نئی ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تو انہوں نے لیبر کابینہ کے بہت سے ارکان کو اپنا ہم خیال پایا۔

میرا خیال ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کنزرویٹو پارٹی کے ساتھ ملاقات میں بھی اس نکتے پر زور دیا ہو گا۔ مسٹر چرچل کیبنٹ مشن پلان کے کبھی حامی نہیں رہے تھے اس لیے انہیں ماؤنٹ بیٹن پلان زیادہ قابل قبول معلوم ہوا ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنا سارا وزن اس پلان کے پلڑے میں ڈال دیا۔ لیبر حکومت نے غالباً مسئلے کے اس پہلو کا بھی لحاظ رکھا ہو گا کہ کنزرویٹو پارٹی کی تائید سے ہندوستان کی آزادی کا بل زیادہ آسانی کے ساتھ منظور کرایا جا سکے گا۔

نئی صورت حال پر غور کے لیے ۳ جون کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ سب سے پہلے شمال مغربی سرحدی صوبے کے مستقبل کا مسئلہ زیرغور آیا۔ ماؤنٹ بیٹن پلان نے صوبہ سرحد کو ایک عجیب صورت حال سے دوچار کر دیا تھا۔ خان عبدالغفار خان اور ان کی پارٹی نے ہمیشہ کانگریس کی حمایت اور مسلم لیگ کی مخالفت کی تھی۔ لیگ خان برادران کو اپنا جانی دشمن سمجھتی تھی۔ لیگ کی مخالفت کے باوجود خان بھائیوں نے سرحد میں کانگریس کی حکومت بنائی تھی اور یہ حکومت اب تک برسراقتدار تھی۔ تقسیم کی وجہ سے خان برادران اور کانگریس پارٹی ایک تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہو سکتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خان بھائیوں اور ان کی پارٹی خدائی خدمتگاروں کو لیگ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

میں یہ ذکر کر چکا ہوں کہ گاندھی جی کے ساتھ ماؤنٹ بیٹن پلان پر گفتگو کر کے مجھے تعجب اور افسوس ہوا تھا۔ اب انہوں نے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں تقسیم کی کھلم کھلا حمایت کر دی لیکن چونکہ مجھے پہلے ہی ان کے خیالات کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے ان کی تقریر میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی البتہ خان عبدالغفار خان کے ردعمل کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کے ہوش وحواس بالکل گم ہو گئے ہیں اور چند منٹ تک ان کے منہ سے ایک بات نہ نکل سکی۔ پھر انہوں نے ورکنگ کمیٹی سے اپیل کی اور اسے یاد دلایا کہ انہوں نے ہمیشہ کانگریس کی حمایت کی ہے اور اب اگر کانگریس نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو سرحد میں اس کا خوفناک ردعمل ظاہر ہو گا۔ ان کے دشمن ان کی ہنسی اڑائیں گے اور ان کے دوست بھی یہ کہیں گے کہ جب تک کانگریس کو صوبہ سرحد کی ضرورت تھی، اس نے خدائی خدمت گاروں کی حمایت کی لیکن جب اسے لیگ کے ساتھ مصالحت کی خواہش ہوئی تو اس نے سرحد اور اس کے لیڈروں کے ساتھ مشورہ کیے بغیر تقسیم کی مخالفت کرنا چھوڑ دیا۔ خان عبدالغفار خان نے بار بار کہا کہ اگر کانگریس نے خدائی خدمت گاروں کو بھیڑیوں کے سامنے دبوچنے کے لیے ڈال دیا تو یہ صوبہ سرحد کے ساتھ غداری ہو گی۔

گاندھی جی کے دل پر اس اپیل کا گہرا اثر ہوا اور انہوں نے کہا کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اس مسئلے پر گفتگو کریں گے۔ وہ وائسرائے سے ملے اور اس مسئلے کو اٹھاتے ہوئے کہا کہ وہ اس وقت تک ملک کو تقسیم کرنے کی حمایت نہیں کریں گے جب تک انہیں یہ اطمینان نہیں دلایا جاتا کہ مسلم لیگ خدائی خدمت گاروں کے ساتھ انصاف سے پیش آئے گی۔ جن لوگوں نے مشکلوں اور مصیبتوں کے زمانے میں ساتھ دیا، ان کی طرف سے وہ کیسے منہ موڑ سکتے ہیں؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں مسٹر جناح سے گفتگو کریں گے۔ ان کی گفتگو کے نتیجے میں مسٹر جناح نے خان عبدالغفار سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان دونوں کی دہلی میں ملاقات ہوئی لیکن بات چیت بے نتیجہ رہی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ جب کانگریس نے تقسیم کو تسلیم کر لیا تھا تو خان عبدالغفار خان اور ان کی پارٹی کا مستقبل کیا ہو سکتا تھا؟ ماؤنٹ بیٹن پلان کی بنیاد ہی یہ تھی کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو الگ کر کے ان کی ایک ریاست بنائی جائے گی۔ صوبہ سرحد میں چونکہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی اس لیے اسے بہ ہر حال پاکستان میں شامل ہونا تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی صوبہ سرحد پاکستان کے مجوزہ علاقوں کے حدود کے اندر آتا تھا۔ اس کی اور ہندوستان کی سرحدیں کہیں بھی نہیں ملتیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ صوبوں کو دونوں ریاستوں میں سے کسی میں شامل ہونے کا حق ہو گا۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ صوبہ سرحد کو حق خود اختیاری کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ چنانچہ انہوں

نے تجویز کیا کہ صوبہ سرحد کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے وہاں ریفرنڈم کرایا جائے کہ آیا وہاں کے لوگ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں؟ ڈاکٹر خان صاحب، جو اس وقت تک سرحد کے وزیراعلیٰ تھے، ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ان کے ساتھ اپنے پلان کے بارے میں گفتگو کر چکے تھے اور ان سے پوچھ چکے تھے کہ انہیں استصواب رائے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ ڈاکٹر خان صاحب صوبے کے وزیراعلیٰ تھے اس لیے ان کا دعویٰ تھا کہ انہیں اکثریت کی حمایت حاصل ہے۔ اس دعوے کی بنا پر وہ استصواب رائے کی تجویز کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے البتہ انہوں نے ایک اور سوال اٹھایا۔ انہوں نے کہا کہ اگر استصواب رائے ہو تو پٹھانوں کو یہ حق بھی ہونا چاہیے کہ وہ پختونستان کے نام سے اپنی الگ ریاست کے لیے بھی رائے دے سکیں۔

واقعہ یہ ہے کہ صوبہ سرحد میں خان بھائیوں کی طاقت اتنی نہیں تھی جتنی کانگریس سمجھتی تھی۔ تقسیم کی تحریک کے بعد ان کا اثر و رسوخ اور بھی گھٹ گیا تھا۔ اب چونکہ پاکستان کی منزل قریب نظر آ رہی تھی اور مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں ایک خود مختار ریاست بنانے کا موقع دیا جائے گا اس لیے سرحد کے عوام جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ پاکستان کی تحریک کو برطانوی افسروں سے بھی بہت تقویت پہنچی۔ یہ لوگ علانیہ پاکستان کی حمایت کرتے تھے اور انہوں نے سرحد کے بیشتر قبائلی سرداروں کو مسلم لیگ کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔

ڈاکٹر خان صاحب نے دیکھا کہ وہ صرف پختونستان کا مطالبہ پیش کر کے ہی صوبہ سرحد میں اپنی قیادت برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ بہت سے پٹھان پنجاب کے غلبے کے اندیشے کی بنا پر اپنی الگ ریاست کو خواہ وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو، ترجیح دیں گے لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کسی نئے مطالبے کو سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی اسکیم پر جلد از جلد عملدرآمد کرنا چاہتے تھے اس لیے پختونستان کے سوال پر تفصیلی بحث بھی نہ کی گئی۔

کانگریس کے اجلاسوں میں خان برادران کی چونکہ یہ آخری شرکت تھی اس لیے میں یہاں یہ مختصراً بیان کر دوں کہ تقسیم سے فوراً پہلے اور بعد میں ان پر کیا گزری۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کانگریس نے تقسیم کو منظور کر لیا ہے تو ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کریں؟ رائے شماری سے وہ انکار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انکار کا مطلب یہ اعتراف تھا کہ انہیں اپنے عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ وہ دونوں پشاور لوٹ گئے اور اپنے دوستوں سے مشورے کے بعد سرحد کی آزادی کا نعرہ بلند کر دیا۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے سرحد کانگریس کے اس فیصلے کی توثیق کر دی جس کی رو سے خان عبدالغفار خان کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ صوبے کی صورت حال کے پیش نظر جو قدم مناسب سمجھیں، اٹھائیں۔ سرحد

کانگریس نے اب پٹھانوں کی ایک ایسی آزاد ریاست کا مطالبہ کر دیا جس کا دستور جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔ خان عبدالغفار خان نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ سرحد کے پٹھانوں کی منفرد تاریخ اور ثقافت ہے جس کا تحفظ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ انہیں اپنے اداروں کو برقرار رکھنے اور انہیں ترقی دینے کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ چنانچہ انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ استصواب رائے صرف پاکستان اور بھارت میں شمولیت کے متعلق نہیں ہونا چاہیے بلکہ انہیں آزاد پختونستان کے حق میں بھی رائے دینے کا متبادل موقع دینا چاہیے۔ صرف اسی طرح استصواب رائے منصفانہ اور صحیح معنوں میں عوامی خواہشات کا آئینہ دار ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو رائے شماری بے معنی ہو گی کیونکہ اس طرح پختون پاکستان کے دوسرے عناصر میں مدغم ہو جائیں گے۔ بعض وجوہ کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر آزاد پختونستان کے ایشو کو رائے شماری میں شامل کر لیا جاتا تو سرحد کے لوگوں کی اکثریت نہیں تو بہت سے لوگ اس کے حق میں ووٹ دیتے۔ انہیں خدشہ تھا کہ پنجاب انہیں نگل لے گا۔ ممکن ہے کہ صرف اسی ایک بات سے متاثر ہو کر لوگ پاکستان کے خلاف ووٹ دے دیتے۔

اس مطالبے کو تسلیم کرنے پر نہ تو مسٹر جناح اور نہ ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن تیار تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے واضح کر دیا کہ صوبہ سرحد کو ایک الگ اور خود مختار ریاست نہیں بنایا جا سکتا بلکہ اسے بھارت میں شامل ہونا پڑے گا یا پاکستان میں۔ اس پر خان بھائیوں نے یہ اعلان کر دیا کہ ان کی پارٹی رائے شماری میں حصہ نہیں لے گی۔ انہوں نے پٹھانوں سے اپیل کی کہ وہ رائے شماری کا بائیکاٹ کریں۔ لیکن ان کی مخالفت سے کچھ نہ ہوا۔ استصواب رائے کرایا گیا اور لوگوں کی بڑی تعداد نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ اگر خان برادران نے رائے شماری کا بائیکاٹ نہ کیا ہوتا اور ان کے حامیوں نے خلوص اور تندہی سے کام کیا ہوتا تو یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا۔ بہر حال رائے شماری کا نتیجہ مسلم لیگ کے حق میں برآمد ہوا اور برطانوی حکومت نے اسے فوراً تسلیم کر لیا۔

ملک تقسیم ہو گیا تو خان بھائیوں نے حالات کے مطابق اپنا رویہ تبدیل کر لیا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ آزاد پختونستان کے مطالبے سے ان کی مراد ایک الگ ریاست کا قیام نہیں تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد کو پاکستان کے ایک یونٹ کی حیثیت سے مکمل خود مختاری حاصل ہو۔ انہوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ پاکستان کا دستور ایسا ہونا چاہیے جس میں اس کے یونٹوں کو مکمل خود مختاری کی ضمانت دی جائے۔ اس طرح پٹھانوں کی سماجی اور تہذیبی زندگی کا تحفظ ہو جائے گا۔ ایسے دستوری تحفظ کے بغیر سارے پاکستان پر پنجابیوں کا غلبہ ہو جائے گا اور وہ پٹھانوں اور دوسری اقلیتوں کو ان کے جائز حقوق سے محروم کر دیں گے۔

اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ خان برادران کا یہ مطالبہ یقیناً جائز تھا۔ یہ مطالبہ اس قرارداد سے ہم آہنگ تھا جسے خود مسلم لیگ نے لاہور میں منظور کیا تھا اور جس میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال مسٹر جناح کا خان بھائیوں پر یہ الزام بلاجواز تھا کہ وہ پاکستان سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خان عبدالغفار خان نے اس سلسلے میں مسٹر جناح سے کراچی میں کئی ملاقاتیں کیں اور ایک مرحلے پر تو ایسا لگتا تھا کہ دونوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نکل آئے گی۔ پاکستان کے بعض مبصروں کا تو یہ خیال تھا کہ مسٹر جناح خان عبدالغفار خان کے خلوص سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے خان عبدالغفار خان اور ان کی پارٹی کے لوگوں سے ملنے کے لیے خود پشاور جانے کا پروگرام بنالیا تھا لیکن یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ خان برادران کے سیاسی حریفوں نے بہت جلد مسٹر جناح کا دل ان دونوں بھائیوں کی طرف سے پھیر دیا۔ خان عبدالقیوم خان، جنہوں نے سرحد میں نئی وزارت بنائی تھی، مسٹر جناح اور خان برادران کے درمیان مصالحت کے خلاف تھے۔ انہوں نے شروع ہی سے ایسا رویہ اختیار کیا کہ مفاہمت اور مصالحت کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ ان کی حکومت نے خان بھائیوں کے ساتھ نہایت غیر مہذب اور غیر منصفانہ برتاؤ کیا اور خدائی خدمتگاروں کو ہر قسم کے غیر قانونی اور ناجائز طریقوں سے کچلنا شروع کر دیا، جمہوریت کو پامال کیا گیا اور طاقت کے استعمال کو روزمرہ کا معمول بنالیا گیا۔ خان عبدالغفار، ڈاکٹر خان صاحب اور دوسرے تمام خدائی خدمت گار لیڈروں کو کسی فرد جرم یا مقدمہ چلائے بغیر جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہ چھ برس تک جیل میں پڑے رہے۔ خان عبدالقیوم خان کی کینہ پروری نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ خود مسلم لیگ کا ایک حصہ بیزار ہو کر یہ کہنے لگا کہ خان برادران پر یا تو مقدمہ چلایا جائے یا انہیں رہا کر دیا جائے۔ بہرحال یہ کوششیں بارآور نہ ہوئیں اور قانون کے نام پر غیر قانونی ظلم کا سلسلہ جاری رہا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ۱۴ جون ۱۹۴۷ کو منعقد ہوا۔ میں اس کمیٹی کے کئی اجلاسوں میں شرکت کر چکا تھا لیکن ایسے عجیب وغریب اجلاس میں شرکت میرے لیے نہایت افسوس کا باعث تھی۔ وہی کانگریس، جس نے ہمیشہ ہندوستان کے اتحاد اور آزادی کے لیے جنگ لڑی تھی، اب ملک کو تقسیم کرنے کے بارے میں ایک باضابطہ قرارداد پر غور کر رہی تھی۔ یہ قرارداد پنڈت گوبند بلبھ پنت نے پیش کی اور سردار پٹیل اور جواہر لعل کی تقریروں کے بعد گاندھی جی کو مداخلت کرنا پڑی۔

کانگریس اپنے آپ کو اس طرح گرا کر ہتھیار ڈال دے، میرے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں صاف صاف کہا کہ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ واقعات کے ایک نہایت افسوسناک سلسلے کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان کا تقسیم ہو جانا ایک المیہ ہے۔ اس کے دفاع میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے تقسیم سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اب اس کا کوئی متبادل نہیں ہے اور اگر ہم فوری طور پر آزادی چاہتے ہیں تو

ہمیں ہندوستان کی تقسیم کے مطالبے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہوگا البتہ ہمیں یہ بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیے کہ ہماری قوم ایک ہے اور اس کی ثقافتی زندگی بھی ایک ہے اور ایک رہے گی۔ چونکہ سیاسی اعتبار سے ہم ناکام رہے ہیں اس لیے ہم ملک کو تقسیم کر رہے ہیں۔ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہم نے شکست کھائی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ ہماری تہذیب اور ثقافت تقسیم نہ ہونے پائے۔ اگر ہم پانی پر چھڑی رکھ دیں تو ایسا محسوس ہو سکتا ہے کہ پانی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے لیکن پانی جوں کا توں رہتا ہے اور چھڑی کے ہٹتے ہی ظاہری تقسیم بھی غائب ہو جاتی ہے۔

سردار پٹیل کو میری تقریر پسند نہ آئی اور انہوں نے اپنی تقریر میں سارا زور میری باتوں کی تردید کرنے میں صرف کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کو تقسیم کرنے کی قرارداد کسی کمزوری یا مجبوری کی وجہ سے پیش نہیں کی جا رہی بلکہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مسائل کا صرف یہی ایک صحیح اور مفید حل ہے۔

اس عظیم المیے کی غمگین فضا میں بھی بعض عناصر مزاحیہ کردار ادا کرتے رہے۔ کانگریس میں ایک ایسا گروپ موجود رہا ہے جو اپنے آپ کو قوم پرست ظاہر کرتا رہا تھا لیکن حقیقت میں ان کا نقطہ نظر خالص فرقہ وارانہ تھا۔ انہوں نے ہمیشہ یہ کہا کہ ہندوستان کی کوئی مشترک تہذیب نہیں ہے اور کانگریس جو بھی کہے لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ غالباً قدامت پسندوں کے اس گروپ کے سب سے پرجوش رکن شری پرشوتم داس ٹنڈن تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ دفعتاً متحدہ ہندوستان کے سب سے بڑے علمبردار بن کر پلیٹ فارم پر آ گئے۔

شری ٹنڈن نے قرارداد کی پرزور مخالفت کی اور وجہ یہ بتائی کہ ہندوستان کی ثقافتی اور قومی زندگی کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ان سے اتفاق کیا اور مجھے اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں تھا کہ جو کچھ وہ اب کہہ رہے تھے، وہ سچ ہے۔ لیکن میں یہ کیسے بھول جاتا کہ وہ اور ان کے ساتھی عمر بھر اس نظریے کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ یہ لوگ اس آخری وقت میں متحد اور ناقابل تقسیم ہندوستان کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔

پہلے دن کے مباحثے کے بعد لوگوں کا میلان ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کے خلاف ہو گیا۔ لوگوں کو قرارداد منظور کرنے پر نہ تو پنڈت پنت کا دل نشین انداز آمادہ کر سکا اور نہ سردار پٹیل کا زور خطابت۔ یہ لوگ آمادہ ہوتے بھی تو کیسے جبکہ قرارداد میں ایک طرح سے ان تمام باتوں کی تردید کی گئی تھی جو کانگریس شروع سے اب تک کہتی چلی آئی تھی۔ چنانچہ مباحثے میں گاندھی جی کی مداخلت ناگزیر ہو گئی۔ انہوں نے ارکان سے اپیل کی کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی حمایت کریں۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہمیشہ تقسیم کی مخالفت کرتے رہے ہیں اور کوئی شخص اس حقیقت کی تردید نہیں کر سکتا لیکن وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس میں تقسیم کے سوا

کوئی چارہ نہیں ہے۔ سیاسی حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن پلان کو تسلیم کر لیا جائے چنانچہ انہوں نے ممبروں سے اپیل کی کہ وہ پنڈت پنت کی پیش کردہ قرارداد کو منظور کر لیں۔

جب قرارداد پر رائے شماری کرائی گئی تو ۲۹ ممبروں نے اس کے حق میں اور ۱۵ نے اس کے خلاف ووٹ دیا۔ گاندھی جی کی اپیل بھی اس سے زیادہ لوگوں کو ملک کی تقسیم کے حق میں رائے دینے پر آمادہ نہ کر سکی۔

قرارداد تو منظور ہو گئی لیکن لوگوں کا حال کیا تھا؟ تقسیم کے خیال سے ہی دل غمگین ہو رہے تھے۔ شاید ہی ایسا کوئی شخص ہوگا جس نے ذہنی تحفظات کے بغیر اسے تسلیم کیا ہو، جن لوگوں نے تقسیم کی قرارداد کو منظور کیا تھا خود ان کے جذبات اس کے خلاف تھے۔ یہ ایک بدترین صورت حال تھی۔ اس سے بھی بدتر وہ فتنہ انگیز فرقہ وارانہ پروپیگنڈا تھا جس کا ہر طرف چرچا ہو رہا تھا۔ کانگریس کے حلقوں میں یہ علانیہ کہا جا رہا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہندوستان میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہیں اور اگر پاکستان میں ہندوؤں پر کسی طرح کا ظلم ہوا تو اس کا خمیازہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھگتنا پڑے گا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں سندھ کے ارکان نے قرارداد کی شدت سے مخالفت کی۔ انہیں ہر طرح کی یقین دہانی کرائی گئی اور اگرچہ علانیہ یہ بات نہ کہی گئی لیکن نجی گفتگوؤں میں انہیں بتایا گیا کہ اگر پاکستان میں ان کے لیے کسی طرح کی رکاوٹیں پیدا کی گئیں یا ان کی تذلیل کی گئی تو اس کا بدلہ ہندوستان کے مسلمانوں سے لیا جائے گا۔

جب یہ باتیں میرے علم میں آئیں تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے فوراً محسوس کیا کہ یہ ایک نہایت خطرناک جذبہ ہے جس کے نتائج بہت نقصان دہ ہوں گے اور نقصان کا سلسلہ بہت دور تک چلے گا۔ اس جذبے کے پیچھے یہ خیال کارفرما تھا کہ ملک کی تقسیم اس بنیاد پر تسلیم کی جا رہی ہے کہ دونوں ریاستوں میں اقلیتوں کی سلامتی کے لیے بھارت اور پاکستان اپنی اپنی طرف اقلیت کو یرغمال کے طور پر رکھیں گے۔ مجھے اقلیتوں کے تحفظ کو انتقام پر منحصر کرنے کا یہ طریقہ بہت وحشیانہ معلوم ہوا۔ بعد کے واقعات نے میرے اندیشوں کو درست ثابت کر دیا۔ تقسیم کے بعد نئی سرحدوں کے دونوں طرف خون کی جو ندیاں بہیں، وہ یرغمال رکھنے اور انتقام لینے کے جذبے ہی کا نتیجہ تھیں۔

کانگریس کے بعض ارکان یہ محسوس کرتے تھے کہ اس قسم کے نظریات کس قدر خطرناک ہیں۔ مجھے بنگال کے کانگریسی لیڈر کرن شنکر رائے خاص طور پر یاد ہیں جنھوں نے پہلی بار میری توجہ اس جانب مبذول کرائی تھی۔ انہوں نے کانگریس کے اس وقت کے صدر آچاریہ کرپلانی کے ساتھ بھی گفتگو کی اور انہیں بتایا کہ یہ نظریہ بے حد خطرناک ہے۔ اگر اس جذبے کو بڑھنے دیا گیا تو اس کے نتیجے میں پاکستان میں ہندوؤں اور بھارت میں

مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو جائے گا۔ کرن شنکر رائے کی بات کسی نے نہ سنی بلکہ بہتوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ ان لوگوں نے ان سے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہمیں یرغمالیوں کا نظریہ بھی قبول کر لینا چاہیے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کا تحفظ صرف اسی طرح ممکن ہے۔ کرشن شنکر رائے اس دلیل سے مطمئن نہ ہوئے اور میرے پاس آئے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ انہوں نے کانگریسی لیڈروں کی یقین دہانیوں کو کوئی وقعت نہ دی اور اپنی زندگی میں اپنے بدترین خدشات کو حقیقت بنتے دیکھ لیا۔

برطانوی حکومت نے انتقال اقتدار کے انتظامات مکمل کرنے کے لیے پندرہ ماہ کی میعاد مقرر کی تھی۔ مسٹر اٹیلی نے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ کو واضح طور پر کہا کہ برطانوی حکومت کا یہ قطعی ارادہ ہے کہ جون ۱۹۴۸ تک اقتدار ذمے دار ہندوستانی ہاتھوں میں سونپ دیا جائے۔ ۲۰ فروری اور ۳ جون کے درمیان بہت سے واقعات رونما ہو چکے تھے۔ چونکہ تقسیم کا پلان منظور ہو چکا تھا اس لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ ان کی اسکیم پر جلد سے جلد عملدرآمد ہونا چاہیے۔ ان کی اس خواہش میں کئی باتیں شامل تھیں۔ اول تو وہ یہ چاہتے تھے کہ اقتدار جلد سے جلد ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔ دوسری طرف انہیں غالباً یہ اندیشہ تھا کہ اس کارروائی میں تاخیر سے ان کے پلان میں نئی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی۔ انہوں نے کیبنٹ مشن پلان کا حشر دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس پلان پر عملدرآمد میں دیر ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دوبارہ سوچنے کا موقع مل گیا اور آخر نتیجہ یہ نکلا کہ اسے مسترد کر دیا گیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے طور پر ہندوستان کو تقسیم کرنے کے کام کے لیے تین ماہ کی مدت مقرر کر لی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اور میں نے کھلم کھلا اس پر شبہ ظاہر کیا کہ اتنے پیچیدہ پلان کو اتنی کم مدت میں پایہ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں ہوگا۔ مجھے یہاں اس مستعدی اور قابلیت کو خراج تحسین ادا کرنا چاہیے جس کے ساتھ انہوں نے اس کام کو انجام دیا۔ انہیں تفصیلات طے کرنے پر اس قدر عبور حاصل تھا اور وہ معاملات پر اتنی جلد قابو پا لیتے تھے کہ تین ماہ کے اندر سارے مسئلے حل ہو گئے اور اگست ۱۹۴۷ میں ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔

میں یہاں ایک مثال دے کر یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کس پھرتی اور اعتماد کے ساتھ ان پیچیدہ مسائل کو حل کیا جو دو ریاستوں کے قیام کے سلسلے میں پیدا ہو گئے تھے۔ جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان تقسیم ہونے والا ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے دعوے بڑھا چڑھا کر پیش کرنا شروع کر دیے۔ ملک میں اِکا دُکا مقامات پر فسادات شروع ہو گئے۔ ۱۹۴۶ میں کلکتے کے قتل عام کے بعد نواکھلی اور پھر بہار میں فسادات ہوئے۔ مارچ میں پنجاب فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ یہ فسادات پہلے صرف لاہور تک محدود رہے لیکن رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوتا گیا اور جلد ہی راولپنڈی اور اس کے اطراف میں خون خرابہ ہونے

لگا۔ دراصل لاہور وہ میدان جنگ تھا جسے جیتنے کے لیے فرقہ پرست ہندو اور مسلمان لڑ رہے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے نمائندوں نے کانگریس کو قائل کرنے کی پوری کوشش کی کہ لاہور کو ہندوستان میں شامل ہونا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ لاہور پنجاب کی سیاسی اور معاشی زندگی کا مرکز ہے اور اگر وہ پاکستان میں چلا گیا تو پنجاب مستقل طور پر بے دست و پا ہو جائے گا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے کانگریس پر زور دیا کہ لاہور کو ایک ایشو بنایا جائے۔ کانگریس نے ان کی تجویز سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ اس مسئلے کو وہاں کے باشندوں کی خواہش کے مطابق طے ہونا چاہیے۔

بعض مسلمانوں، ہندوؤں او سکھوں کا خیال تھا کہ لاہور کا مسئلہ تشدد کے ذریعے حل ہو سکتا ہے۔ لاہور اور اس کے گرد و نواح میں جائیدادوں کے مالک زیادہ تر ہندو تھے۔ کچھ مسلمانوں نے سمجھا کہ وہ ہندوؤں کی املاک کو تباہ کر کے اور معاشی محاذ پر حملوں کے ذریعے انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کسی امتیاز کے بغیر غیر مسلموں کی فیکٹریوں اور مکانوں کو نذر آتش کر دیا اور ان کی املاک لوٹنا شروع کر دیں۔ لاہور کے ہندوؤں کا ایک طبقہ اس کے جواب میں مسلمانوں کو قتل کرنے لگا۔ ان کے پاس دولت تھی اور ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ مسلمانوں کو لاہور سے بھگا دیں گے اور وہاں ہندوؤں کی اکثریت یقینی ہو جائے گی۔ یہ بات علانیہ کہی جاتی تھی کہ اس جنگ میں، جہاں ایک فریق کا حملہ مال پر اور دوسرے کا جان پر تھا، طرفین کے فرقہ پرست لیڈر بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ملوث ہیں۔ عام طور پر یہ کہا اور صحیح مانا جاتا تھا کہ مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی لیڈر ہندوؤں پر حملے کرنے کا انتظام کر رہے تھے۔ اسی طرح ہندو مہا سبھا کے لیڈر ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اُکسا رہے تھے۔

بالکل ایسی ہی صورت حال کلکتے میں پیدا ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ کے حامی اصرار کر رہے تھے کہ کلکتے کو پاکستان میں شامل کیا جائے جبکہ لیگ کے مخالفوں کو یہ فکر تھی کہ کلکتے کو ہندوستان میں رہنا چاہیے۔

یہ صورت حال تھی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر غور کرنے لگے۔ یہ بات طے پا چکی تھی کہ صوبائی اسمبلی رائے شماری کے ذریعے یہ فیصلہ کرے گی کہ صوبہ تقسیم کیا جائے یا جوں کا توں بھارت یا پاکستان میں شامل رہے۔ بنگال اور پنجاب دونوں کی اسمبلیوں نے تقسیم کے حق میں ووٹ دیا اس لیے ان صوبوں کی نئی سرحدوں کا تعین ضروری ہو گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک باؤنڈری کمیشن قائم کر دیا اور مسٹر ریڈ کلف سے کہا کہ وہ یہ خدمت انجام دیں۔ ریڈ کلف اس وقت شملہ میں تھے۔ انہوں نے اپنے تقرر کو منظور تو کر لیا لیکن ساتھ ہی تجویز کیا کہ وہ سروے کا کام جولائی کے شروع میں کریں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ جون کی گرمی میں پنجاب میں زمین کی پیائش اور سروے کا کام ناممکن ہو گا۔ یہ کام اگر جولائی میں شروع کیا جائے تو اس سے

صرف تین یا چار ہفتوں کی تاخیر ہوگی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں بتایا کہ وہ اس کام میں ایک دن کے توقف پر بھی راضی نہیں ہیں اس لیے تین یا چار ہفتوں کے التوا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے احکام کی تعمیل کی گئی۔ ماؤنٹ بیٹن کی مستعدی اور کارپردازی کی یہ ایک واضح مثال ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے دوسرا مسئلہ سیکرٹریٹ اور ہندوستان کی حکومت کے اثاثوں کی تقسیم کا تھا۔ جن صوبوں نے جوں کا توں کسی ایک مملکت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا، ان سے متعلق بھی بعض دشواریاں حائل تھیں۔ پاکستان میں شامل ہونے والے صوبوں کا ریکارڈ علیحدہ کر کے اسے پاکستان بھیجنا تھا۔ جو صوبے تقسیم ہوئے تھے، ان کا مسئلہ اور بھی گنجلک تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بیشتر انتظامات اپنی نگرانی میں کرائے اور اس مقصد کے لیے قائم کی جانے والی کمیٹی نے ہر مسئلے کو فوری طور پر طے کر دیا۔

مالیات اور فوج کی تقسیم کے مسئلے اور بھی مشکل تھے لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی خوش تدبیری اور قوت عمل کسی کو خاطر میں نہ لائی اور خزانے کے حد درجہ پیچیدہ مسئلے بھی معینہ مدت کے اندر طے پا گئے۔

جہاں تک فوج کا تعلق تھا، یہ فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کو ایک چوتھائی اور بھارت کو تین چوتھائی فوج ملے گی لیکن سوال یہ تھا کہ فوج کو فوری طور پر تقسیم کیا جائے یا اسے دو یا تین برسوں کے لیے متحدہ کمان کے تحت رکھا جائے۔ فوج کے کمانڈروں کا یہ مشورہ تھا کہ جنرل اسٹاف فی الحال مشترک رہے۔ میں ان کی دلیلوں سے متاثر ہوا اور میں نے ان کی حمایت کی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی دلیلوں کے علاوہ میرے ذہن میں کئی اور باتیں بھی تھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ تقسیم کے بعد ملک میں بلوے اور فسادات شروع ہو جائیں گے اور ایسی صورت میں ایک مشترکہ فوج ہندوستان کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر ہم تباہی سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں فوج کی فرقہ وارانہ تقسیم سے گریز کرنا ہوگا۔ اب تک فوج میں بھی فرقہ وارانہ جذبات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اگر اسے سیاست سے دور رکھا جاتا تو اس کے نظم و ضبط اور غیر جانبداری پر بھروسا کیا جا سکتا تھا اس لیے میں نے مشترکہ کمان کی ضرورت پر زور دیا۔ میں اس بات کو ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس معاملے میں میرے موقف کی مکمل تائید کی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر فوج ایک مشترکہ کمان کے تحت رہتی تو آزادی کے فوراً بعد خون کی ندیاں ہرگز نہ بہتیں۔

مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ میرے ساتھیوں نے مجھ سے اتفاق نہ کیا اور پوری قوت کے ساتھ میری مخالفت کی۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت ڈاکٹر راجندر پرشاد کی مخالفت پر ہوئی۔ وہ ایک پرامن انسان تھے جن کا مسلک عدم تشدد تھا۔ مگر اب وہ فوج کی تقسیم پر سب سے زیادہ اصرار کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہندوستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تو فوج کو ایک دن کے لیے بھی مشترکہ کمان کے تحت نہیں رکھنا چاہیے اور نہ اسے رکھا جا سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک خطرناک فیصلہ تھا۔ اس کی وجہ سے فوج فرقوں کی بنیاد پر تقسیم ہوگئی۔ مسلم یونٹ پاکستان چلے گئے اور ہندو اور سکھ یونٹ ہندوستان میں رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ واریت کا زہر فوج میں بھی پھیل گیا جو اَب تک اس سے محفوظ تھی۔ ۱۵ اگست کے بعد جب سرحد کے دونوں طرف بے گناہ مردوں اور عورتوں کا خون بہنے لگا تو فوج کھڑی تماشا دیکھتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ بعض مواقع پر تو فوج کے آدمی بھی اس لڑائی میں شریک ہو گئے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھ سے غصے سے زیادہ غم کے لہجے میں کہا کہ فوج کے ہندوستانی سپاہی اور افسر مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو قتل کرنے میں شریک ہونا چاہتے تھے لیکن برطانوی افسروں نے انہیں بڑی مشکل سے روکے رکھا۔ یہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی رپورٹ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ برطانوی افسروں کے بارے میں ان کا بیان کس حد تک درست ہے مگر میں اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ سابق غیر تقسیم شدہ ہندوستانی فوج کے کئی لوگوں نے پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو اور بھارت میں مسلمانوں کو قتل کیا۔ اس طرح ہندوستانی فوج کی شاندار روایت کو سخت نقصان پہنچا اور اس کے قابل فخر ریکارڈ پر ایک دھبہ لگ گیا۔

سرکاری ملازموں کے بارے میں میری تجویز تھی کہ انہیں فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم نہ کیا جائے۔ سیاسی ضرورت نے ہمیں ملک کی تقسیم کو ماننے پر مجبور کر دیا تھا لیکن سرکاری ملازمین کو ان کے علاقوں سے اکھاڑ پھینکنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میری رائے تھی کہ سرکاری اہلکاروں کو ان کے صوبوں میں ہی رہنے دیا جائے یعنی مغربی پنجاب، سندھ اور مشرقی بنگال کے ملازمین کو ان کے مذہب سے قطع نظر پاکستان میں رہنے دیا جائے۔ اسی طرح جو ملازمین ہندوستانی صوبوں میں تھے، خواہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان، ہندوستان میں رہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر ملازمتوں کو ہی فرقہ واریت سے پاک رکھا جائے تو دونوں ریاستوں کی فضا بہتر رکھی جا سکے گی، انتظامیہ فرقہ پرستی کے زہر سے محفوظ رہے گی اور دونوں ملکوں کی اقلیتوں میں سلامتی اور تحفظ کا زیادہ احساس پیدا ہوگا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ میری دلیلوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام سرکاری ملازمین کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ بھارت یا پاکستان دونوں میں سے کسی مملکت کی ملازمت کا انتخاب کر لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً سارے ہندوؤں اور سکھوں نے بھارت اور مسلمانوں نے پاکستان میں جانا پسند کیا۔

میں نے اس مسئلے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ تفصیلی گفتگو کی اور انہیں بتایا کہ فوج اور سرکاری ملازمتوں کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مجھ سے اتفاق کیا اور میرے موقف کی حمایت کی۔ فوج کے معاملے میں انہیں بالکل کامیابی نہ ہوئی لیکن سول ملازمتوں کے مسئلے میں ان کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ سرکاری اہلکاروں کو یہ حق دے دیا گیا کہ وہ مستقل یا عارضی طور پر کسی ایک ریاست کا انتخاب کر لیں۔ مستقل فیصلہ کرنے والوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن عارضی طور پر فیصلہ کرنے والوں

کو چھ ماہ کے اندر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کا اختیار دیا گیا۔ دونوں ملکوں نے یہ ضمانت دی کہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے والوں کو واپس لے لیا جائے گا۔ افسوس ہے کہ دونوں ریاستوں نے واضح یقین دہانی کے باوجود عارضی انتخاب کرنے والے بدنصیب افراد کے ساتھ منصفانہ سلوک نہ کیا۔

مجھے افسوس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ مسلم لیگ نے اس معاملے میں بھی نادانی اور کوتاہ اندیشی سے کام لیا۔ اس نے تمام مسلمانوں کو پاکستان آنے اور ہندوستان چھوڑنے پر اکسایا۔ اس وقت مرکزی سیکرٹریٹ کے بیشتر اہم عہدوں پر مسلمان تعینات تھے۔ مسلم لیگ نے ان سب پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ دیں۔ جو لوگ اس پر رضامند نہ ہوئے، انہیں افواہیں پھیلا کر ڈرایا گیا کہ جب کانگریس بلا شرکت غیرے برسراقتدار آ گئی تو ان کا حشر کیا ہوگا۔ ان افواہوں سے مسلمان سرکاری ملازمین میں کسی قدر بے چینی پیدا ہو رہی تھی اس لیے میں نے حکومت ہند پر زور دیا کہ وہ اس بارے میں ایک سرکلر جاری کر کے اپنے رویے کی وضاحت کرے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لعل نے میری مکمل تائید کی اور ایک اعلان جاری بھی ہو گیا جس میں مسلمان اور دوسری اقلیتوں کے سرکاری ملازمین کو یقین دلایا گیا کہ انہیں نہ صرف ان کے حقوق ملیں گے بلکہ ان کے ساتھ فیاضی کا سلوک کیا جائے گا۔

اس سرکلر کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرکزی سیکرٹریٹ کے کئی مسلمان افسروں کی ڈھارس بندھ گئی اور انہوں نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب مسلم لیگ کے لیڈروں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے ان افسروں کو توڑنے کی مہم شروع کر دی۔ ایک طرف تو یہ ملازمین اپنے مستقبل کے بارے میں پہلے ہی بہت پریشان تھے اور دوسری طرف انہیں یہ دھمکی دے دی گئی کہ اگر وہ ہندوستان میں رہے تو مسلم لیگ اور پاکستان کی حکومت انہیں اپنا دشمن تصور کرے گی اور انہیں ہر ممکن طریقے سے ہراساں کیا جائے گا۔

ان افسروں میں بہت سوں کا تعلق ان صوبوں سے تھا جو پاکستان کا حصہ بننے والے تھے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ مسلم لیگ کے لیڈر ان کی املاک اور رشتے داروں کو نقصان پہنچا کر بدلہ لیں گے تو وہ بہت پریشان ہو گئے۔ خود میری وزارت میں کئی مسلمان افسر اہم عہدوں پر تعینات تھے۔ انہوں نے میری یقین دہانیوں پر بھارت میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جب مسلم لیگ نے ان کی املاک اور خاندانوں کو نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دیں تو ان میں سے کئی افسر میرے پاس آئے اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگے: ''ہم نے بھارت میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن مسلم لیگ کی دھمکیوں کے بعد ہمارا یہاں رہنا ناممکن ہے۔ ہمارے خاندان مغربی پنجاب میں ہیں اور ہم یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ انہیں تکلیف پہنچے۔ ان حالات میں ہم پاکستان کا انتخاب کرنے پر مجبور ہیں۔''

مسلم لیگ کی طرف سے مسلمان افسروں کو ہندوستان سے پاکستان بھگا دینا نہ صرف بہت بڑی نادانی

بلکہ نقصان دہ فعل تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے خود مسلمانوں کو مجموعی طور پر ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ اب جو تقسیم کو منظور کیا جا چکا تھا اور پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا تھا تو یہ بات ظاہر تھی کہ اس نئی ریاست میں مسلمان ہر قسم کے فوائد حاصل کر سکیں گے۔ اگر اس کے ساتھ کچھ مسلمان بھارت کی ملازمت میں رہتے تو اس سے انہیں ذاتی طور پر فائدہ پہنچنے کے علاوہ تمام مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ کچھ صاحب اختیار مسلمانوں کی موجودگی سے ان کی جماعت میں اعتماد پیدا ہوتا اور بہت سے بے بنیاد خدشے دور ہو جاتے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ لیگ نے تقسیم پر اصرار کر کے کس قدر حماقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ مسلمان افسروں کے بارے میں لیگ کا رویہ اس نادانی کی ایک اور مثال تھی۔

یہ طے پا چکا تھا کہ بھارت ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو وجود میں آئے گا۔ مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ پاکستان کا قیام ایک روز پہلے یعنی ۱۴ اگست کو عمل میں آئے گا۔ ان دونوں مملکتوں کے قیام کے سلسلے میں ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ ہر ڈومینین اپنا گورنر جنرل خود منتخب کرتی اور بعض نے اپنے شہریوں کو اس عہدے پر مامور کیا تھا۔ اس طرح بھارت اپنے کسی شہری کو پہلا دستوری گورنر جنرل منتخب کر سکتا تھا لیکن ہم نے یہ طے کیا کہ اچانک تبدیلی کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہی کو گورنر جنرل منتخب کیا جائے تو اس سے انتظامی امور اور پالیسی میں ایک طرح کا تسلسل رہے گا۔ ہمارا خیال تھا کہ شروع میں دونوں مملکتوں کے لیے ایک ہی گورنر جنرل ہو اور جو تبدیلی مقصود ہو وہ بعد میں کی جائے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ پاکستان بھی کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان باتوں کو ملحوظ رکھے گا۔ اس بنا پر ہم نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل کے عہدے کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ ہمیں توقع تھی کہ لیگ بھی انہی کو منتخب کرے گی لیکن لیگ نے عین وقت پر یہ اعلان کر کے کہ مسٹر جناح کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل ہونا چاہیے، سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جیسے ہی یہ خبر سنی تو انہوں نے ہم سے کہا کہ اب صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ انہوں نے یہ تجویز کیا کہ ہم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں اور اس عہدے پر کسی ہندوستانی کا تقرر کر دیں لیکن ہمیں اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی اور ہم نے پھر کہہ دیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھارت کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔

تقسیم شدہ ہندوستان

ان اوراق میں جو کہانی میں بیان کرنا چاہتا تھا، یہ اس کا آخری باب ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئی ریاست پاکستان کے قیام کا افتتاح کرنے کراچی چلے گئے۔ دوسرے ہی روز وہ دہلی لوٹ آئے اور پندرہ اگست کو رات بارہ بجے بھارت کی نئی مملکت وجود میں آ گئی۔

ملک آزاد ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ عوام آزادی اور فتح کا پورا لطف اٹھاتے، اگلی صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ آزادی کے ساتھ ایک بہت المناک حادثہ پیش آ چکا ہے۔ ہم نے بھی یہ محسوس کیا کہ ہمیں آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہونے سے پہلے ایک مشکل اور سنگلاخ راستہ طے کرنا ہوگا۔

کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تقسیم کو منظور کر لیا تھا۔ چونکہ کانگریس پوری قوم کی نمائندہ جماعت تھی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کی بھاری حمایت حاصل تھی اس لیے قاعدے کے مطابق اس کا مطلب یہ ہونا چاہیے تھا کہ سارے ملک نے تقسیم کو مان لیا ہے لیکن اصل صورت حال بالکل مختلف تھی۔ جب ہم نے تقسیم سے فوراً قبل اور فوراً بعد ملک پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس فیصلے کو تسلیم کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی ایک قرارداد اور مسلم لیگ کے رجسٹر میں اس کا اندراج ہو گیا ہے۔ ہندوستان کے عوام نے تقسیم کو قبول نہیں کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے دل اور ان کی روح نے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ مسلم لیگ کو بہت سے ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی لیکن مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ایسا تھا جس نے ہمیشہ لیگ کی مخالفت کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ملک کی تقسیم کے فیصلے سے ان لوگوں کو گہرا زخم لگا۔ جہاں تک ہندوؤں اور سکھوں کا تعلق ہے، ان میں سے ہر شخص تقسیم کے خلاف تھا۔ کانگریس کی طرف سے تقسیم کو مان لینے کے باوجود ان کی مخالفت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ اب جو تقسیم ایک عملی حقیقت بن گئی تو خود مسلم لیگ کے بہت سے حامی اس کے بھیانک نتائج کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے اور کھلم کھلا یہ کہنے لگے کہ تقسیم سے ان کی مراد یہ نہیں تھی۔

آج دس برس کے بعد جب میں اس ساری صورت حال پر دوبارہ نظر دوڑاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ واقعات نے ہر اس بات کی تصدیق کی ہے جو میں نے اس وقت کہی تھی۔ مجھے اس وقت بھی صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کانگریس کے لیڈروں نے تقسیم کو کھلے دل کے ساتھ قبول نہیں کیا تھا۔ ان میں سے بعض نے محض غصے اور

جھنجلاہٹ میں اور بعضوں نے مایوسی کے عالم میں اسے مان لیا تھا۔ جب دلوں میں غم اور غصے یا خوف کا جذبہ حاوی ہو جائے تو لوگوں میں حقائق پر نظر رکھ کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ جن لوگوں کے مشتعل جذبات نے انہیں تقسیم کا حامی بنا دیا تھا وہ یہ کیسے سوچ سکتے تھے کہ ان کے عمل کے نتائج کیا ہوں گے؟

کانگریس کے لیڈروں میں سردار پٹیل تقسیم کے سب سے بڑے حامی تھے لیکن وہ بھی تقسیم کو ہندوستان کے مسئلے کا بہترین حل نہیں سمجھتے تھے۔ دراصل انہوں نے صرف جھنجلاہٹ اور احساس خودداری کو ٹھیس لگنے کی وجہ سے اپنی پوری قوت سے تقسیم کی حمایت کی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ لیاقت علی خان وزیر خزانہ کی حیثیت سے ان کی ہر تجویز رد کر کے انہیں قدم قدم پر زچ کر دیتے ہیں تو انہوں نے محض تنگ آ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر کوئی متبادل راستہ نہیں تو ملک کو تقسیم ہو جانا چاہیے۔ انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ پاکستان کی نئی مملکت میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود نہیں اور وہ زیادہ دن قائم نہ رہ سکے گی۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ پاکستان کو تسلیم کر کے وہ مسلم لیگ کو تلخ سبق سکھا سکیں گے، پاکستان کی ریاست تھوڑے ہی عرصے میں بیٹھ جائے گی اور جو صوبے ہندوستان سے الگ ہوں گے انہیں بے پناہ مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سردار پٹیل شاید یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ یہ صوبے ہندوستان میں دوبارہ شامل ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔ مجھے یہ بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ مسلم لیگ کے خلاف ان کا رویہ اس قدر تعصب پر مبنی تھا کہ انہیں لیگ کے پیروکاروں کو پہنچنے والے کسی نقصان پر کوئی صدمہ نہ ہوتا۔

ملک کی تقسیم کے بارے میں عام لوگوں کے رویے کا اصل امتحان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو قیام پاکستان سے ہوا۔ اگر ہندوستان کے عوام نے تقسیم کو بخوشی قبول کیا ہوتا تو پنجاب، سرحد، سندھ اور بنگال کے ہندو اور سکھ ویسی ہی خوشی مناتے جیسے وہاں کے مسلمان منا رہے تھے مگر ان تمام صوبوں سے جو اطلاعات موصول ہوئیں ان سے اس دعوے کا کھوکھلا پن ظاہر ہو گیا کہ کانگریس کا تقسیم کو قبول کر لینا پوری ہندوستانی قوم کے مان لینے کے برابر ہے۔

چودہ اگست پاکستان کے مسلمانوں کے لیے جشن لیکن ہندوؤں اور سکھوں کے لیے سوگ کا دن تھا۔ یہ کیفیت صرف عام لوگوں کی ہی نہیں تھی بلکہ کانگریس کے اہم لیڈر کے احساسات بھی یہی تھے۔ ان دنوں آچاریہ کرپلانی کانگریس کے صدر تھے۔ ان کا تعلق سندھ سے ہے۔ انہوں نے چودہ اگست کو یہ بیان جاری کیا کہ آج کا دن ہندوستان کے لیے تباہی اور ماتم کا دن ہے۔ پاکستان کے ہندوؤں اور سکھوں نے بھی کھلے بندوں اسی جذبے کا مظاہرہ کیا۔ یہ واقعی عجیب و غریب صورت حال تھی۔ ہماری قومی جماعت نے تقسیم کی حمایت میں فیصلہ دیا تھا لیکن پوری قوم اس فیصلے پر سوگوار تھی۔

یہاں فطری طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ اگر ہندوستانیوں کے دلوں میں تقسیم کے خیال سے غم اور غصے کے ایسے جذبات پیدا ہوئے تھے تو انہوں نے اسے منظور کیوں کیا؟ انہوں نے زیادہ شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کیوں نہ کی؟ انہوں نے عجلت میں ایسا فیصلہ کیوں کیا جسے وہ غلط سمجھتے تھے۔ اگر ۱۵ اگست تک ہندوستان کے مسئلے کا صحیح حل تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا تو ایک غلط فیصلہ کر کے اس پر پچھتاوے کے کیا معنی؟ میں بار بار کہہ چکا تھا کہ ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے جب تک اس مسئلے کا کوئی بہتر حل نہیں نکل آتا۔ میرے بس میں جو کچھ تھا وہ میں نے کیا لیکن بدقسمتی سے میرے دوستوں اور ساتھیوں نے میری حمایت نہ کی۔ ان کی طرف سے حقائق سے چشم پوشی کا ایک ہی سبب میری سمجھ میں آتا ہے اور وہ یہ کہ غصے اور مایوسی نے ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔ غالباً ۱۵ اگست کی تاریخ کے تعین نے ان پر ایسا جادو کر دیا تھا کہ انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ہر بات بلا سوچے سمجھے تسلیم کر لی۔

حالت یہ تھی کہ ٹریجڈی اور کامیڈی آپس میں خلط ملط ہو گئے تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلم لیگی لیڈروں کی کیفیت سب سے زیادہ مضحکہ خیز بن گئی۔ مسٹر جناح اپنے ساتھیوں کے لیے یہ پیغام چھوڑ کر کراچی چلے گئے کہ اب جو ملک تقسیم ہو گیا ہے تو انہیں بھارت کا وفادار شہری بن کر رہنا چاہیے۔ اس الوداعی پیغام نے ان کے اندر کمزوری اور مایوسی کا ایک عجیب احساس پیدا کر دیا۔ ۱۴ اگست کے بعد ان میں سے بہت سے لیڈر مجھے ملنے آئے۔ ان کی حالت پر رحم آتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے سخت افسوس اور غصے کے ساتھ مجھ سے کہا کہ جناح نے انہیں دھوکا دیا ہے اور عین وقت پر ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

شروع میں میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان کے یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ جناح نے انہیں دھوکا دیا ہے۔ جناح نے تو مسلم اکثریت کے صوبوں کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کا کھلے بندوں مطالبہ کیا تھا۔ تقسیم اب حقیقت بن چکی تھی اور مغرب اور مشرق میں مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان میں شامل ہو گئے تھے۔ اب آخر مسلم لیگ کے یہ ترجمان یہ کیوں کہہ رہے تھے کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے؟

ان لوگوں سے گفتگو کرتے وقت مجھے محسوس ہوا کہ انہوں نے اپنے ذہن میں تقسیم کے بارے میں ایک ایسی تصویر بنا رکھی تھی جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ پاکستان بننے کے حقیقی نتائج کا صحیح ادراک نہیں کر سکتے تھے۔ اگر مسلم اکثریت کے صوبے پاکستان میں شامل ہو جاتے تو ظاہر ہے کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے، بھارت میں شامل رہتے۔ یوپی اور بہار کے مسلمان اقلیت میں تھے اس لیے انہیں تقسیم کے بعد بھارت ہی میں رہنا تھا۔ یہ بات تو عجیب ہے لیکن واقعہ یہی ہے کہ مسلم لیگ کے ان لیڈروں نے حماقت میں اپنے دل میں یہ سمجھ لیا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد تمام مسلمان، چاہے وہ اکثریت کے صوبے میں ہوں یا

اقلیت کے صوبے میں، ایک الگ قوم تصور کیے جائیں گے اور انہیں اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا حق ہوگا۔ اب جو مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے ہندوستان سے باہر چلے گئے اور بنگال اور پنجاب بھی تقسیم ہو گئے اور مسٹر جناح کراچی چلے گئے تو ان احمقوں کو پتا چلا کہ ہندوستان کی تقسیم سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اس کی وجہ سے وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھے ہیں۔ مسٹر جناح کا الوداعی پیغام ان کے لیے آخری تنکا ثابت ہوا جس سے ان کے لیے بوجھ ناقابل برداشت ہو گیا۔ اب یہ بات ان پر واضح ہوگئی کہ تقسیم کا واحد نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اقلیت کی حیثیت سے وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ کمزور ہو گئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ انہوں نے اپنی نادانی کی حرکت سے ہندوؤں کے دل میں غصہ اور رنجیدگی پیدا کر دی تھی۔

مسلم لیگ کے یہ لوگ برابر کہتے رہے کہ اب وہ ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر ہیں۔ یہ بات اس قدر آشکار اور عیاں تھی کہ ان واقعات پر وہ جو اظہار غم کر رہے تھے، اس کی وجہ سے ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوتی تھی۔ میں نے انہیں وہ بات یاد دلائی جو میں نے کیبنٹ مشن پلان کے زمانے میں کہی تھی۔ میں نے اپنے ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ کے بیان میں ہندوستانی مسلمانوں کو صاف صاف لفظوں میں خبردار کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر تقسیم حقیقت بن گئی تو ایک دن ان کی آنکھ کھلے گی اور وہ دیکھیں گے کہ مسلم اکثریت کے علاقوں کے پاکستان میں شامل ہونے کے بعد وہ ہندوستان میں رہ جائیں گے اور ان کی حیثیت ایک ادنیٰ اور حقیر اقلیت کی سی رہ جائے گی۔

آزادی کی پہلی صبح کا خیر مقدم کرنے کے لیے ۱۵ اگست کو ایک خصوصی پروگرام ترتیب دیا گیا۔ نصف شب کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ ہندوستان اب ایک آزاد اور خود مختار ملک بن گیا ہے۔ اگلے دن صبح نو بجے اسمبلی کا دوبارہ اجلاس ہوا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے افتتاحی تقریر کی۔ پورے شہر میں جشن کا سماں تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو تقسیم کے کرب کا احساس بھی مٹ گیا۔ شہر اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں سے لاکھوں افراد آزادی کو خوش آمدید کہنے کے لیے جمع ہو گئے۔ سہ پہر چار بجے آزاد ہندوستان کا پرچم بلند ہونے والا تھا۔ اگست کی تپتی ہوئی دھوپ کے باوجود لاکھوں افراد جمع ہو گئے بلکہ گھنٹوں پہلے سے بے پناہ گرمی میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ انسانوں کا ایسا اژدحام تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی کار سے باہر نکل نہ پائے اور انہیں مجبوراً کار کے اندر سے تقریر کرنا پڑی۔

خوشی سے وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی لیکن یہ حالت ۴۸ گھنٹوں سے زیادہ نہ رہی۔ اگلے روز فرقہ وارانہ فسادات کی خبریں ملنا شروع ہوئیں تو دارالحکومت کی فضا سوگوار ہو گئی اور افسردگی کے بادل چھا گئے۔ یہ خبریں قتل، موت اور وحشت کی تھیں۔ معلوم ہوا کہ مشرقی پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں کے ہجوم نے

مسلمانوں کے دیہات پر حملے کیے ہیں۔ یہ لوگ مسلمانوں کے مکان نذر آتش کر رہے تھے اور بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو اندھا دھند موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ بالکل ایسی ہی خبریں مغربی پنجاب سے آنے لگیں۔ وہاں مسلمان ہندو اور سکھ مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے تھے۔ غرض پورا پنجاب اس قتل و غارت گری کی وجہ سے تباہی اور موت کا قبرستان بنتا جا رہا تھا۔ اس قسم کی وارداتوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔ پنجاب کے وزیر یکے بعد دیگرے دہلی آنے لگے۔ اس کے بعد کانگریس کے وہ لیڈر دہلی پہنچنا شروع ہو گئے جو حکومت سے باہر تھے۔ یہ سب لوگ ملک میں رونما ہونے والے واقعات سے دہشت زدہ تھے۔ خون خرابہ اتنے بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا کہ ان کے ہوش و حواس گم ہو گئے تھے اور وہ مایوسی کے عالم میں کہہ رہے تھے کہ شاید یہ خون ریزی کسی طریقے سے بند نہیں ہو سکے گی۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ لوگوں نے فوج کو طلب کیوں نہیں کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ پنجاب میں موجود فوج قابل اعتبار نہیں رہی اور اس سے مدد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ پنجاب کے لیے فوج دہلی سے بھیجی جائے۔

شروع میں دہلی میں فسادات نہیں ہوئے لیکن جب پورے ملک میں چاروں طرف موت کے شعلے بھڑک رہے تھے، دہلی میں موجود مختصر ریزرو فوج کو وہاں سے ہٹانا مصلحت کے خلاف تھا۔ ہم نے باہر سے فوجی دستوں کو شورش زدہ علاقوں میں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس سے پہلے کہ یہ دستے وہاں پہنچتے، فسادات کی آگ خود دارالحکومت تک پہنچ گئی۔ پنجاب سے قتل کی خبریں ملیں اور ان کے پیچھے مغربی پنجاب سے پناہ گزین آنے لگے تو دہلی میں بھی تشدد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شہر پر قاتلوں کا قبضہ ہو گیا۔ فسادات صرف ان بستیوں تک محدود نہ رہے جہاں مہاجر آباد تھے یا عام لوگ رہتے تھے بلکہ وہ علاقے بھی فسادات کی لپیٹ میں آ گئے جہاں سرکاری افسر رہائش پذیر تھے۔ مغربی پنجاب میں قتل عام کی خبریں دہلی پہنچیں تو فساد پسند عناصر کی قیادت میں لوگوں کے ہجوم نے مسلمانوں پر دھاوا بول دیا۔ دہلی میں سکھوں نے ان قاتلانہ حملوں کو منظم کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کیا۔

میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ یرغمالیوں اور انتقامی کارروائیوں کے خطرناک نظریے سے میں کس قدر فکر مند اور پریشان ہو گیا تھا۔ دہلی میں ہم نے اس نظریے پر بھیانک طریقے سے عملدرآمد ہوتے دیکھا۔ اگر مغربی پنجاب کے مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے قتل کے مجرم تھے تو دہلی کے بے گناہ مسلمانوں سے اس کا بدلہ کیوں لیا جا رہا تھا؟ یرغمالیوں اور انتقام کا جذبہ اس قدر ظالمانہ ہے کہ کوئی بھی مہذب یا صحیح الدماغ انسان اس کے دفاع میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتا۔

فوج کا رویہ سنگین مسئلے کی صورت اختیار کر گیا۔ ملک کی تقسیم سے پہلے فوج فرقہ وارانہ منافرت سے پاک تھی لیکن جب ملک فرقہ واریت کی بنیاد پر تقسیم ہو گیا تو منافرت کے جراثیم فوج میں بھی داخل ہو گئے۔ دہلی

میں موجود فوج کی اکثریت ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔ چند ہی روز کے اندر یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اگر شہر میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے سخت کارروائی کی ضرورت پڑی تو اس صورت میں فوج پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ہم نے جنوب سے تیزی کے ساتھ فوج بلانے کے لیے اقدامات شروع کر دیے۔ جنوب کے فوجیوں پر ملک کی تقسیم کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا اور ان میں سپاہیانہ نظم و ضبط کا جذبہ برقرار تھا۔ ان سپاہیوں نے دارالحکومت میں صورت حال کو کنٹرول کرنے اور امن و امان بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

خاص شہر کے علاوہ قرول باغ، لودھی کالونی، سبزی منڈی اور صدر بازار کے علاقوں میں، جہاں مسلمان بڑی تعداد میں آباد تھے، جان و مال محفوظ نہیں رہے تھے اور ان حالات میں فوج کے ذریعے مکمل حفاظت کا انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک مرحلے پر نوبت یہاں تک آ گئی کہ سنگین صورت حال کی وجہ سے کوئی مسلمان رات کو اس یقین کے ساتھ نہیں سو سکتا تھا کہ اگلی صبح وہ صحیح سلامت نیند سے بیدار ہوگا۔

قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے ان دنوں میں میں نے فوجی افسروں کے ساتھ دہلی کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے حوصلے مکمل طور پر پست ہو گئے ہیں اور ان کے دل میں کامل بے بسی کا احساس سرایت کر گیا ہے۔ بہتوں نے میرے مکان میں پناہ مانگی۔ شہر کے کئی امیر اور مشہور خاندانوں کے لوگ محتاجی اور بے کسی کے اس عالم میں میرے پاس آئے کہ تن کے کپڑوں کے سوا ان کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ان میں سے بہت سے تو دن کی روشنی میں نکلتے ڈرتے تھے اور وہ نصف شب یا صبح تڑکے فوج کے پہرے میں میرے گھر تک لائے گئے۔ جب میرا مکان ان لوگوں سے بھر گیا تو میں نے صحن میں خیمے لگوا دیے۔ مرد، عورتیں، امیر، غریب، نوجوان اور بوڑھے ...... غرض ہر قسم کے لوگ موت کے خوف سے ہاتھ پاؤں سمیٹ کر انبوہ کی صورت میں وہاں جمع ہو گئے تھے۔

یہ بات جلد ہی معلوم ہوگئی کہ امن و امان بحال کرنے میں کافی وقت لگے گا۔ شہر کے مختلف حصوں میں دور دور پھیلے ہوئے مکانوں کی حفاظت ناممکن تھی۔ اگر ہم ایک علاقے میں پہرے کا انتظام کرتے تو کسی دوسرے علاقے میں حملے ہونے لگتے۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ سارے مسلمانوں کو اکٹھا کر کے انہیں محفوظ کیمپوں میں رکھا جائے۔ ایک کیمپ پرانے قلعے میں قائم کیا گیا۔ یہاں اب کوئی عمارت نہیں ہے اور صرف برجیاں رہ گئی ہیں۔ جلد ہی یہ برجیاں بھر گئیں۔ مسلمان بڑی تعداد میں قلعے میں جمع ہو گئے اور انہوں نے تقریباً پوری سردیاں انہی برجیوں میں گزاریں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کو عمل میں لانے کے لیے جو کچھ کیا اس پر میں انہیں مورد الزام ٹھہرا چکا ہوں لیکن جس بحران کا ہمیں سامنا تھا، اس پر انہوں نے جس انداز سے قابو پایا، اس پر میں انہیں

خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے جس سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ ہندوستان کی تقسیم کے پیچیدہ اور مشکل منصوبے پر عملدرآمد کیا اس جانب میں پہلے ہی اشارہ کر چکا ہوں۔ اب وہ ملک میں امن و امان بحال کرنے کے لیے زیادہ مستعد اور سرگرم ہو گئے۔ ان کی فوجی تربیت اس آڑے وقت میں ہمارے کام آئی۔ ان کی قیادت اور عسکری حربوں کے تجربے کے بغیر ہم حالات پر اتنی جلدی اور اتنے موثر طریقے سے قابو نہیں پا سکتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ یہ حالت بالکل جنگ کی سی ہے اور اس میں جنگی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔ جنگ کے زمانے میں ہنگامی کونسلیں دن رات کام کرتی ہیں، ہمیں بھی ایک کونسل آف ایکشن بنانی چاہیے جو ہر معاملے کے پیش ہوتے ہی موقع پر فیصلہ کرے اور ان فیصلوں پر عملدرآمد کو یقینی بنائے۔ چنانچہ ایک ہنگامی بورڈ قائم کر دیا گیا جس میں کابینہ کے بعض ارکان اور کئی اعلیٰ فوجی اور سول افسر شامل کیے گئے۔ اس بورڈ کا اجلاس روزانہ صبح ساڑھے نو بجے گورنر ہاؤس کے کیبنٹ روم میں منعقد ہوتا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اجلاس کی صدارت کرتے۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں جو احکام جاری ہوتے ہم ان پر عملدرآمد کا جائزہ لیتے۔ جب تک پوری طرح امن بحال نہیں ہوا اس وقت تک یہ بورڈ برابر کام کرتا رہا۔ بورڈ کے سامنے ہر روز صبح کو جو رپورٹیں پیش کی جاتیں، ان سے ہمیں صورت حال کی نزاکت اور خطرے کا اندازہ ہو جاتا تھا۔

اس پوری مدت میں گاندھی جی شدید ذہنی کرب میں مبتلا رہے۔ انہوں نے دونوں طبقوں کے درمیان بہتر فضا پیدا کرنے اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے سر توڑ کوششیں کیں لیکن جب ان کی کوششوں کو توقع کے مطابق کامیابی نصیب نہ ہوئی تو انہیں بڑی پریشانی اور تکلیف ہوئی۔ وہ اکثر جواہر لعل، سردار پٹیل اور مجھے بلا بھیجتے اور شہر کا حال دریافت کرتے۔ انہیں یہ دیکھ کر اور بھی رنج ہوتا کہ خود ہم لوگ اس بارے میں متفق نہیں ہیں کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ سردار پٹیل کا رویہ جواہر لعل اور مجھ سے مختلف تھا۔ اس اختلاف کا اثر مقامی انتظامیہ پر بھی پڑ رہا تھا اور یہ بات واضح ہوتی جا رہی تھی۔ ان افسروں میں بھی دو گروہ بن گئے تھے۔ بڑا گروہ سردار پٹیل کی طرف دیکھتا اور وہی کرنا چاہتا تھا جس سے وہ خوش ہوں۔ دوسرے چھوٹے گروپ کی نظریں جواہر لعل اور میری طرف اٹھتی تھیں اور وہ جواہر لعل کے احکامات پر عمل کرنے کی کوشش کرتا۔ دہلی کا چیف کمشنر ایک مسلمان افسر صاحبزادہ آفتاب احمد کا بیٹا خورشید احمد تھا۔ بحیثیت افسر وہ کوئی مضبوط آدمی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ اگر اس نے کوئی سخت کارروائی کی تو اس پر مسلمانوں کی طرفداری کا الزام لگایا جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انتظامیہ کا برائے نام سربراہ تھا اور ڈپٹی کمشنر ساری کارروائیاں اپنی صوابدید کے مطابق کرتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر رندھاوا نامی سکھ تھا لیکن سکھوں کے رسم و رواج کی بہت سی باتوں پر عمل نہیں کرتا تھا۔ اس نے داڑھی منڈوا رکھی

تھی اور بال ترشواتا تھا۔ ۱۵ اگست سے پہلے یہ تجویز تھی کہ چونکہ وہ اپنی ملازمت کی میعاد پوری کر چکا ہے اس لیے اسے واپس پنجاب بھیج دیا جائے۔ دہلی کے کئی ممتاز شہریوں خاص طور پر مسلمانوں کے ایک بڑے حصے نے اس تجویز کے خلاف درخواست دے دی۔ ان کا کہنا تھا کہ رندھاوا ایک غیر جانبدار اور مضبوط افسر ہے اور اس کٹھن زمانے میں اس کا متبادل ملنا مشکل ہوگا۔

رندھاوا کو دہلی ہی میں رہنے دیا گیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کی فرقہ وارانہ کشمکش کے اثر میں آ کر وہ اپنے پچھلے رویے پر قائم نہ رہ سکا۔ مجھ تک کئی شکایتیں پہنچیں کہ وہ شر پسندوں کے خلاف سخت کارروائی نہیں کر رہا۔ وہی مسلمان، جنہوں نے سال بھر قبل اس کو دہلی میں رکھنے کی کوشش کی تھی، اب آ کر یہ شکایت کرنے لگے کہ رندھاوا دہلی کے مسلمانوں کی حفاظت کے لیے معقول انتظام نہیں کر رہا۔ سردار پٹیل تک یہ شکایت پہنچائی گئی لیکن انہوں نے اس قسم کی شکایتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔

سردار پٹیل وزیر داخلہ تھے اور اس حیثیت سے دہلی کے انتظامی امور براہ راست ان کے تحت تھے۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی وارداتوں کی فہرست طول کھینچنے لگی تو گاندھی جی نے سردار پٹیل کو بلا کر ان سے دریافت کیا کہ وہ اس کشت و خون کی روک تھام کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ سردار پٹیل نے یہ کہہ کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو خبریں ان تک پہنچ رہی ہیں وہ نہایت مبالغہ آمیز ہیں۔ انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ مسلمانوں کے ڈرنے یا شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک واقعہ مجھے خاص طور پر یاد ہے۔ جب ہم تینوں گاندھی جی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو جواہر لعل نے انتہائی دکھ اور کرب کے ساتھ کہا کہ دہلی کی صورت حال ان کے لیے ناقابل برداشت ہے جہاں مسلمان بلیوں اور کتوں کی طرح مارے جا رہے ہیں۔ انہیں اپنی بے بسی پر شرم آتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کا ضمیر انہیں ہر وقت ستاتا رہتا ہے اس لیے کہ جب لوگ ان کے پاس ہولناک وارداتوں کی شکایتیں لے کر آتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو کیا جواب دیں؟ جواہر لعل نے اس بات کو کئی مرتبہ دہرایا کہ یہ صورت حال ان کے لیے ناقابل برداشت ہے اور ان کا ضمیر انہیں ایک لمحے کے لیے بھی چین سے نہیں رہنے دیتا۔

اس پر سردار پٹیل نے جو جواب دیا اس پر ہم ششدر رہ گئے۔ ایسے وقت میں، جب دہلی میں مسلمان دن دہاڑے مارے جا رہے تھے، سردار پٹیل نے نہایت اطمینان کے ساتھ گاندھی جی سے کہا کہ جواہر لعل کی شکایتیں ان کی سمجھ سے بالا ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اِکا دُکا وارداتیں ہوئی ہوں لیکن حکومت مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ سردار پٹیل نے الٹا اس بات پر ناگواری ظاہر کی کہ جواہر لعل وزیر اعظم ہوتے ہوئے اپنی ہی حکومت پر ایسے اعتراض کر رہے ہیں۔

جواہر لعل چند لمحوں تک خاموش بیٹھے رہے اور پھر نہایت دل شکستہ انداز میں گاندھی جی کی طرف دیکھ کر کہنے لگے کہ اگر سردار پٹیل کے یہی خیالات ہیں تو پھر انہیں کچھ نہیں کہنا ہے۔

اس زمانے میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سردار پٹیل کا ذہن کس طرح کام کر رہا تھا۔ غالباً انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں پر روزانہ جو حملے ہو رہے تھے ان کا کوئی جواز ہونا چاہیے چنانچہ انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ شہر میں مسلمانوں کے علاقوں سے مہلک ہتھیار برآمد ہوئے ہیں جو دہلی کے مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کرنے کے لیے جمع کیے تھے اور اگر ہندوؤں نے حملوں میں پہل نہیں کی ہوتی تو مسلمان انہیں تباہ کر دیتے۔ پولیس نے قرول باغ اور سبزی منڈی کے علاقوں سے کچھ ہتھیار برآمد بھی کیے جو سردار پٹیل کے حکم سے گورنمنٹ ہاؤس میں لا کر ہمارے معائنے کے لیے کیبنٹ روم سے ملحق ایک کمرے میں سجا دیے گئے۔ صبح کو جب ہم سب اپنے روزانہ کے اجلاس کے لیے جمع ہوئے تو سردار پٹیل نے کہا کہ پہلے ہم برآمد شدہ ہتھیاروں کا معائنہ کر لیں۔ وہاں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ایک میز پر باورچی خانے کی درجنوں زنگ آلود چھریاں، جیبی اور قلم و پنسل بنانے کے چاقو، جن میں سے بعض کے دستے لگے ہوئے تھے اور بعض کے غائب تھے، لوہے کی کچھ سلاخیں جو پرانے مکانوں کے جنگلوں سے نکالی گئی تھیں اور کچھ پائپ کے ٹکڑے وہاں پڑے تھے۔ سردار پٹیل کے مطابق یہی وہ ہتھیار تھے جنہیں مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے جمع کیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان میں سے ایک یا دو چاقو اٹھا لیے اور مسکراتے ہوئے کہا کہ جن لوگوں نے اس خیال سے یہ سامان حرب جمع کیا تھا کہ وہ اس سے دہلی کا شہر فتح کر لیں گے، ان کا عسکری حربوں کے بارے میں نظریہ بڑا حیرت انگیز تھا۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ دہلی کے زیادہ تر مسلمانوں کو پرانے قلعے میں لا کر رکھا گیا تھا۔ اب سردیاں سر پر آ گئی تھیں۔ ہزاروں افراد کھلے آسمان تلے رہ رہے تھے اور ان کے لیے سردی ناقابل برداشت تھی۔ ان کے لیے کھانے کا معقول انتظام تھا اور نہ پینے کے لیے پانی۔ وہاں سے گندگی ہٹانے کا اول تو کوئی انتظام تھا ہی نہیں اور جو تھا وہ بھی بالکل ناکافی تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک صبح ایمرجنسی بورڈ کے سامنے شہادت دیتے ہوئے پرانے قلعے میں رہنے والوں کی دلگداز حالت بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ ان غریب مردوں اور عورتوں کو موت کے منہ سے نکال کر زندہ درگور کر دیا گیا ہے۔ بورڈ نے مجھ سے کہا کہ میں وہاں جا کر انتظامات کا معائنہ کروں اور ضروری اقدامات تجویز کروں۔ بورڈ نے اپنے اگلے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا کہ پینے کے پانی اور صفائی کے فوری انتظامات کیے جائیں۔ ساتھ ہی فوج سے کہا کہ وہ جس قدر زیادہ خیمے دے سکتی ہے، فراہم کرے تا کہ لوگوں کو کم سے کم خیموں کے نیچے ہی پناہ مل سکے۔

گاندھی جی کی اذیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے پوری قوم ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش کو پورا کرنے پر تیار رہتی تھی لیکن اب حالت یہ تھی کہ وہ منتیں اور التجائیں کر رہے تھے اور لوگوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔ آخر حالات ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے اور انہوں نے مجھے بلا کر کہا کہ ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی ہتھیار نہیں رہا کہ دہلی میں امن بحال ہونے تک مرن برت رکھ لیں۔ یہ خبر سن کر کہ گاندھی جی دہلی میں امن قائم ہونے تک برت رکھنے والے ہیں، بہت سے لوگ جو اَب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے، شرمسار ہو کر سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ گاندھی جی کو اس عمر میں اور صحت کی اس حالت میں برت رکھنے سے روکنا چاہیے۔ ان لوگوں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ اپنا ارادہ ترک کر دیں لیکن گاندھی جی کا فیصلہ اٹل تھا۔

سردار پٹیل کا رویہ گاندھی جی کے دل پر سب سے بڑا بوجھ تھا۔ سردار پٹیل کا تعلق ان کے بے حد قریبی حلقے سے تھا اور وہ گاندھی جی کو بہت عزیز تھے۔ دراصل سردار پٹیل کی سیاسی حیثیت ہر لحاظ سے گاندھی جی کی مرہون منت تھی۔ کانگریس کے اہم لیڈروں میں بہت سے ایسے تھے جن کی سیاسی زندگی گاندھی جی کے سیاسی میدان میں آنے سے پہلے شروع ہو چکی تھی لیکن سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجندر پرشاد...... دو ایسی شخصیتیں تھیں جو بالکل گاندھی جی کی تخلیق تھیں۔

☆ ڈاکٹر راجندر پرشاد شاندار تعلیمی کیرئر کے مالک تھے اور بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بہار کی سیاست میں نمایاں مقام حاصل کر لیں گے لیکن انہیں صرف وکالت سے دلچسپی تھی اور غالباً وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ امام برادران یا مظہر الحق جیسے قد آور سیاستدانوں کے ہوتے ہوئے سیاست میں ان کی کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں۔ گاندھی جی بہار میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ صوبے کی سیاسی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور کوئی سربرآوردہ ہندو لیڈران کے ساتھ تعاون کے لیے تیار نہیں۔ میں نے ایک قابل اعتماد ذریعے سے سنا ہے کہ ڈاکٹر سچدا انندا سنہا نے ایک ڈنر کا انتظام کیا جس میں کئی نامور ہندوؤں کو گاندھی جی سے ملاقات کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے گاندھی جی کو بتایا کہ اگر گاندھی جی کسی ہندو کو لیڈر کے طور پر منتخب کر لیں تو وہ عدم تعاون کی تحریک میں ان کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ گاندھی جی نے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کو قیادت نہیں دے سکتے البتہ اگر کوئی اچھے کردار کا باصلاحیت ہندو لیڈر آگے آیا تو وہ اس کی حمایت کریں گے۔ اس پر بابو راجندر پرشاد کا نام تجویز کیا گیا اور وہ گاندھی جی کی امداد اور حمایت سے چند ہی برسوں میں پورے ہندوستان کی نمایاں شخصیت بن گئے۔

پٹیل کا معاملہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ ترک موالات کی تحریک سے پہلے سردار پٹیل گجرات کے

بے شمار وکیلوں میں سے ایک تھے۔ انہیں ملک کی سیاسی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی انہیں سیاسی دنیا میں کوئی حیثیت حاصل تھی۔ جب گاندھی جی نے احمد آباد کو اپنا مرکز بنایا تو انہوں نے سردار پٹیل کو چن لیا اور رفتہ رفتہ ان کی حیثیت بنائی۔ پٹیل دل و جان سے گاندھی جی کے ساتھ ہو گئے اور جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، بسا اوقات وہ صرف گاندھی جی کی خواہش کو بیان کرتے تھے۔ یہ گاندھی جی ہی تھے جنہوں نے پٹیل کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا رکن بنوایا۔ گاندھی جی ہی کی وجہ سے ۱۹۳۱ میں وہ کانگریس کے صدر بنے۔ گاندھی جی کو اس بات کا سخت صدمہ تھا کہ پٹیل اب ایک ایسی پالیسی پر عمل پیرا تھے جو اُن کے ہر اصول اور مقصد کے منافی تھی۔

گاندھی جی نے کہا کہ وہ دہلی کے مسلمانوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جب ان کا اپنا ولبھ بھائی بھارت کی حکومت کا وزیر داخلہ اور دارالحکومت میں امن وامان قائم کرنے کا ذمے دار ہے۔ پٹیل صرف مسلمانوں کی حفاظت کرنے سے قاصر نہ رہے بلکہ اس بارے میں جو شکایتیں کی جاتیں، وہ انہیں بھی لاپروائی کے ساتھ نا قابل شنوائی ٹھہرا دیتے تھے۔ گاندھی جی نے کہا کہ ان کے پاس اب آخری ہتھیار استعمال کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے اور وہ اس وقت تک برت رکھیں گے جب تک حالات تبدیل نہیں ہوتے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۲ جنوری ۱۹۴۸ سے برت شروع کر دیا۔ ایک لحاظ سے گاندھی جی کا برت سردار پٹیل کے رویے کے خلاف احتجاج تھا اور سردار پٹیل خود بھی یہی سمجھتے تھے۔

ہم نے گاندھی جی کو برت سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ برت کی پہلی شام کو جواہر لعل، سردار پٹیل اور میں گاندھی جی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ سردار پٹیل اگلی صبح بمبئی روانہ ہونے والے تھے۔ انہوں نے گاندھی جی سے رسمی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے شکایت کی کہ وہ کسی معقول وجہ کے بغیر برت رکھ رہے ہیں۔ انہوں نے شکوہ کیا کہ اس وقت برت رکھنے کا مناسب موقع اور محل نہیں ہے۔ ان کے برت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سردار پٹیل پر الزامات لگائے جائیں گے۔ انہوں نے قدرے تلخی سے کہا کہ گاندھی جی کا طرز عمل کچھ ایسا ہے گویا وہ انہیں مسلمانوں کے قتل کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔

گاندھی جی نے حسب معمول پرسکون انداز میں جواب دیا: ''میں اب چین میں نہیں، دہلی میں ہوں۔ میری آنکھیں اور کان ابھی صحیح سلامت ہیں۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی آنکھوں اور کانوں کی گواہی پر اعتبار نہ کروں اور مجھ سے کہو کہ مسلمانوں کے پاس شکایت کی کوئی وجہ نہیں ہے تو میں تمہیں قائل کر سکتا ہوں اور نہ تم مجھے۔ ہندو اور سکھ میرے بھائی ہیں۔ وہ میرے جسم کا حصہ ہیں اور اگر اس وقت وہ طیش میں آ کر اندھے ہو گئے ہیں تو میں ان پر الزام نہیں لگاؤں گا لیکن خود مجھے تکلیف اٹھا کر کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ میرے برت سے ہندوؤں اور سکھوں کی آنکھیں کھل جائیں گی اور انہیں حقیقت کا ادراک ہو جائے گا''۔

☆ سردار پٹیل گاندھی جی کے اس جواب سے ناراض ہو گئے اور ان کے ساتھ تند و تیز لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔ جواہر لعل کو اور مجھے ان کے رویے پر صدمہ اور حیرت ہوئی اور ہم خاموش نہ رہ سکے۔ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا: ''ولبھ بھائی! ہوسکتا ہے کہ آپ کو محسوس نہ ہو لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا رویہ انتہائی توہین آمیز ہے اور آپ گاندھی جی کے جذبات کو کس قدر ٹھیس پہنچا رہے ہیں۔'' ☆

سردار پٹیل ایک لفظ بھی نہ بولے اور جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ میں نے انہیں روکا اور کہا کہ انہیں اپنا پروگرام منسوخ کر کے دہلی میں رہنا چاہیے کیونکہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ واقعات کیا کروٹ لیتے ہیں۔ ایسے موقعے پر جب گاندھی جی نے برت رکھا ہے، انہیں بمبئی نہیں جانا چاہیے۔

پٹیل نے تقریباً چیخ کر جواب دیا: ''میرے یہاں ٹھہرنے سے کیا حاصل ہوگا؟ گاندھی جی میری بات سننے کو تیار نہیں، وہ تو دنیا بھر کے سامنے ہندوؤں کا منہ کالا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر ان کا رویہ ایسا ہے تو وہ میرے کام کے نہیں ہیں۔ میں اپنا پروگرام تبدیل نہیں کر سکتا اور مجھے بمبئی جانا ہے۔''

مجھے ان کے الفاظ سے زیادہ ان کے لب و لہجے پر صدمہ ہوا۔ میں نے سوچا گاندھی جی پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ پٹیل گاندھی جی کی پیداوار تھے اور ان کی حمایت کے بغیر ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ آج وہی پٹیل گاندھی جی کے ساتھ اس لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ پٹیل سے اور کچھ کہنا فضول ہے اور وہ چلے گئے۔

پٹیل نے گاندھی جی کی طرف سے اپنا دل سخت کر لیا تھا لیکن دہلی کے لوگوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس خبر کے پھیلتے ہی کہ گاندھی جی نے برت شروع کر دیا ہے، نہ صرف دہلی بلکہ پورے ہندوستان میں ہلچل مچ گئی۔ دہلی پر تو بجلی کا سا اثر ہوا۔ بہت سے گروپ، جنھوں نے اب تک گاندھی جی کی مخالفت کی تھی، اب سامنے آئے اور کہا کہ گاندھی جی کی بیش قیمت زندگی کو بچانے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔

بہت سے لوگ گاندھی جی کے پاس آئے اور انہیں یقین دلایا کہ وہ دہلی میں امن قائم کرنے کے لیے کام کریں گے لیکن گاندھی جی پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس اضطراری دوڑ دھوپ اور مشوروں میں دو دن گزر گئے۔ اس سنگین صورت حال اور گاندھی جی کو برت توڑنے پر آمادہ کرنے کی تدبیروں پر غور کرنے کے لیے تیسرے دن ایک عام جلسے کا انتظام کیا گیا۔

جلسے میں جاتے ہوئے میں گاندھی جی کے پاس گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے برت کو توڑنے کی شرطیں بتا دیں۔ یہ شرطیں ہم لوگوں کے سامنے رکھیں گے اور یہ کہیں گے کہ اگر گاندھی جی ان نکات کے بارے میں مطمئن ہو گئے تو اپنا برت توڑ دیں گے۔

گاندھی جی نے کہا: ''ہاں یہ کام کی بات ہے۔ میری پہلی شرط یہ ہے کہ ان تمام مسلمانوں کو، جو ہندوؤں

اور سکھوں کے حملوں کی وجہ سے دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں، واپس آنے کی دعوت دی جائے اور انہیں ان کے گھروں میں دوبارہ آباد کیا جائے۔"

یہ انتہائی شائستگی اور شرافت کی بات تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اس پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ تقسیم نے پنجاب کے دونوں حصوں میں زندگی کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ مغربی پنجاب سے لاکھوں پناہ گزین بھارت آ چکے تھے اور لاکھوں مشرقی پنجاب سے پاکستان جا چکے تھے۔ ہزاروں مسلمان دہلی چھوڑ چکے تھے اور مغربی پنجاب سے آنے والے پناہ گزین ان مسلمانوں کے خالی مکانوں پر قابض ہو چکے تھے۔ اگر چند سیکڑوں افراد کی بات ہوتی تو گاندھی جی کی خواہش پوری کی جا سکتی تھی۔ ان مردوں اور عورتوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی اس لیے ایسی صورت میں گاندھی جی کی شرطوں کو پورا کرنے کی کوشش سے نئے مسائل کھڑے ہو جاتے۔ مغربی پنجاب سے آنے والے ہندو اور سکھ ایک مرتبہ اجڑ چکے تھے لیکن اب انہوں نے دہلی میں رہنے کی کوئی صورت پیدا کر لی تھی۔ اب اگر انہیں موجودہ گھروں کو خالی کرنے کے لیے کہا جاتا تو وہ کہاں جاتے؟ اس کے علاوہ دہلی سے ہجرت کر کے پاکستان جانے والے مسلمان مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ اب انہیں کیسے واپس لایا جا سکتا تھا؟ غرض نہ تو مسلمانوں کو واپس لایا جا سکتا تھا اور نہ ہی ہندوؤں اور سکھوں سے وہ مکان خالی کرنے کے لیے کہا جا سکتا تھا جن پر اب وہ قابض ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کو اس طرح آباد کرنے کی کوشش کا مطلب یہ ہوتا کہ جن مکانوں سے مسلمانوں کو ایک بار نکال کر بے گھر کیا گیا تھا، ان سے اب ہندوؤں اور سکھوں کو بے گھر کیا جاتا۔

میں نے گاندھی جی کا ہاتھ پکڑ کر ان سے کہا کہ وہ یہ شرط نہ رکھیں۔ میں نے کہا اول تو یہ بات ناقابل عمل ہے اور دوسرے ہندوؤں اور سکھوں سے یہ مطالبہ کرنا نہ تو عملی ہے اور نہ اخلاقاً حق بجانب کہ دہلی میں وہ جن مکانوں میں آباد ہو چکے ہیں، انہیں خالی کر کے پھر مارے مارے پھریں۔ میں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ اس نکتے پر اصرار نہ کریں بلکہ اپنی شرط یہ رکھیں کہ کشت و خون اور غارت گری کو فوری طور پر بند کیا جائے۔ وہ یہ بھی مطالبہ کر سکتے ہیں کہ جو مسلمان اب بھی ہندوستان میں ہیں، انہیں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے دی جائے اور تمام فرقوں کے درمیان امن اور دوستانہ تعلقات بحال کیے جائیں۔ میں نے تجویز کیا کہ وہ یہ شرط بھی رکھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے جن مزاروں اور عبادت گاہوں کو گرا دیا گیا ہے، ان کی مرمت کر کے ان کی حیثیت بحال کی جائے۔ ان مقامات پر غیر مسلموں کے قبضے سے مسلمانوں میں رنج اور دہشت پیدا ہو گئی ہے۔ گاندھی جی اس یقین دہانی کا بھی مطالبہ کر سکتے ہیں کہ کسی بھی فرقے کے مقدس مقامات پر آئندہ کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا۔

گاندھی جی پہلے تو راضی نہ ہوئے اور اپنی شرطوں پر اڑے رہے لیکن آخر کار وہ نرم پڑ گئے اور مجھ سے کہا

کہ اگر میں اپنی تجویزوں سے مطمئن ہوں تو وہ بھی ان شرطوں کو مان لیں گے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے میری تجویزوں پر غور کیا اور ساتھ ہی ان سے یہ درخواست کی کہ وہ ان تجویزوں کو قبول کر لیں۔

اس کے بعد گاندھی جی نے برت توڑنے کے لیے درج ذیل شرطیں لکھوائیں:

۱۔ ہندو اور سکھ آئندہ سے مسلمانوں پر حملے بند کریں اور مسلمانوں کو یقین دلائیں کہ وہ سب بھائیوں کی طرح ساتھ رہیں گے۔

۲۔ ہندو اور سکھ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں کہ ایک بھی مسلمان اپنے جان و مال کے ڈر سے بھارت کو نہ چھوڑے۔

۳۔ چلتی گاڑیوں میں مسلمانوں پر جو حملے کیے جا رہے ہیں، وہ فوراً بند کیے جائیں اور ان ہندوؤں اور سکھوں کو، جو اِن حملوں میں حصہ لے رہے ہیں، ایسا کرنے سے روکا جائے۔

۴۔ جو مسلمان نظام الدین اولیاؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور نصیر الدین چراغ دہلویؒ جیسی درگاہوں اور مزاروں کے قرب و جوار میں رہتے تھے اور مصیبت کی وجہ سے اپنے مکان چھوڑ گئے تھے، انہیں واپس لا کر ان کے گھروں میں دوبارہ آباد کیا جائے۔

۵۔ درگاہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو جو نقصان پہنچا ہے، حکومت اس کی مرمت کروا سکتی تھی لیکن اس سے گاندھی جی کی تشفی نہیں ہو گی۔ انہیں اصرار تھا کہ ہندو اور سکھ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس درگاہ کی خود مرمت کروائیں۔

۶۔ سب سے اہم ضرورت تالیف قلوب کی تھی۔ ان تمام شرطوں کا پورا ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا اس شرط کا پورا ہونا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے لیڈر گاندھی جی کو اس بارے میں پوری طرح یقین دہانی کرائیں تاکہ انہیں مستقبل میں ایسے کسی مسئلے کی وجہ سے دوبارہ برت نہ رکھنا پڑے۔

گاندھی جی نے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ یہ میرا آخری برت ہو۔''

میں نے انہیں یقین دلایا کہ ان کی یہ ساری شرطیں پوری ہو سکتی ہیں۔ میں دو بجے جلسے میں پہنچا اور گاندھی جی کی شرطیں حاضرین کے سامنے رکھ دیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم گاندھی جی کو مطمئن کرنے اور ان سے درخواست کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں کہ وہ برت توڑ دیں۔ صرف قرار دادیں منظور کرنے سے گاندھی جی پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ دہلی کے لوگ اگر واقعی ان کی جان بچانا چاہتے ہیں تو جو شرطیں انہوں نے رکھی ہیں، انہیں پورا کرنا ہو گا۔ گاندھی جی نے یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے یہاں بھیجا ہے کہ آیا دہلی کے لوگ انہیں یہ یقین دہانی کراتے ہیں یا نہیں؟

اس جلسے میں تقریباً بیس ہزار مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ ان سب نے ایک آواز ہو کر نعرہ لگایا: ''ہم سب گاندھی جی کی خواہشات کو دل و جان سے پورا کریں گے، ہم اپنی جان کی بازی لگا دیں گے اور ایسا کوئی کام نہیں کریں گے جس سے گاندھی جی کو دکھ پہنچے۔''

میری تقریر جاری تھی کہ کچھ لوگوں نے شرطوں کی نقل کرنا اور حاضرین کے دستخط لینا شروع کر دیا۔ جلسہ ختم ہونے سے پہلے اس دستاویز پر ہزاروں افراد نے دستخط ثبت کر دیے۔ رندھاوا نے، جو ابھی تک دہلی کا

ڈپٹی کمشنر تھا، ہندوؤں اور سکھوں کے لیڈروں کو ساتھ لیا اور یہ لوگ خواجہ قطب الدین بختیار کی درگاہ کی مرمت کے لیے چل دیے۔ اس کے ساتھ ہی دہلی میں کام کرنے والی کئی تنظیموں نے سرعام یہ اعلان کیا کہ وہ گاندھی جی کی شرطوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے اپنے حلقہ اثر میں کام کریں گی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ سب ان باتوں کو عمل میں لانے کی ذمے داری لیتی ہیں۔ شام ہوتے ہوتے دہلی کے ہر علاقے سے ہر پارٹی اور ہر گروپ کے وفد میرے پاس آنے لگے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ انہیں گاندھی جی کی شرطیں منظور ہیں اور اب مجھے گاندھی جی سے برت توڑنے کی درخواست کرنی چاہیے۔

اگلی صبح میں نے دہلی کے نمائندہ لیڈروں کا ایک اجلاس بلایا۔ ہم نے یہ طے کیا کہ یہ سب خود برلا ہاؤس جا کر گاندھی جی کو اطمینان دلائیں۔ میں دس بجے برلا ہاؤس پہنچا اور گاندھی جی کو بتایا کہ اب مجھے پورا اطمینان ہے کہ ان کا مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ ان کے برت نے ہزاروں لوگوں کے دل پھیر دیے ہیں اور ان میں انصاف اور انسانیت کا جذبہ پھر سے پیدا ہو گیا ہے۔ ہزاروں آدمیوں نے اب یہ عہد کیا ہے کہ مختلف طبقوں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنا ان کا اولین مقصد ہو گا۔ میں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ ان یقین دہانیوں پر اعتبار کریں اور اپنا برت توڑ دیں۔

گاندھی جی بہت خوش ہوئے لیکن انہوں نے ہماری درخواست قبول نہ کی۔ پورا دن بحث مباحثے اور منت سماجت میں گزر گیا۔ ان کی طاقت اور وزن کافی گھٹ گیا تھا اور وہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ وہ اپنے بستر پر سیدھے لیٹے ہوئے تھے اور جو وفد ان سے ملتے، ان کی باتیں سن کر وہ یہ جانچنے کی کوشش کرتے کہ ان کے دل میں کس حد تک تبدیلی ہوئی ہے۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ وہ اگلی صبح کو جواب دیں گے۔

دوسرے روز صبح دس بجے ہم سب لوگ ان کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ جواہر لعل پہلے سے وہاں موجود تھے۔ دوسرے لوگوں کے علاوہ پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین بھی وہاں تھے جنہوں نے گاندھی جی سے ملاقات کی اجازت چاہی تھی۔ گاندھی جی نے انہیں بلا لیا اور وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ اس مجمع میں شامل ہو گئے جس میں سردار پٹیل کے سوا کابینہ کے تمام ارکان موجود تھے۔ گاندھی جی نے اشارے سے کہا کہ جو لوگ اپنے عہد کا اعادہ کرنا چاہیں، وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ دہلی کے تقریباً پچاس لیڈر، جن میں ہندوؤں اور سکھوں کے نمائندے بھی شامل تھے، ایک ایک کر کے ان کے پاس آئے اور عہد کیا کہ وہ ایمانداری سے گاندھی جی کی شرطیں پوری کریں گے۔ اس کے بعد گاندھی جی کے اشارے پر ان کے حلقوں کے مردوں اور عورتوں نے رام دھن گانا شروع کی۔ ان کی پوتی ایک گلاس میں سنگترے کا رس لے آئی۔ گاندھی جی نے اسے اشارہ کیا کہ وہ گلاس مجھے دے دے۔ میں نے گلاس لے کر گاندھی جی کے ہونٹوں سے لگایا اور انہوں نے برت توڑ دیا۔

گاندھی جی کا برت شروع ہونے کے بعد اسٹیٹسمین کے سابق ایڈیٹر مسٹر آرتھر نے بھی امپیریل ہوٹل

میں برت شروع کر دیا۔ ہندو مسلم فسادات کا ان کے دل پر گہرا اثر ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر فسادات ختم نہ ہوئے تو وہ بھی مرن برت رکھیں گے۔ وہ برسوں سے ہندوستان میں تھے اور اسے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ایک ہندوستانی کے ناتے وہ اس انسانی اذیت اور ذلت کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان پر جو مصیبت آئی ہے اسے دیکھتے رہنے سے مر جانا بہتر ہے۔ اب میں نے انہیں کہلا بھیجا کہ گاندھی جی نے برت توڑ دیا ہے اور انہیں بھی اپنا برت توڑ دینا چاہیے۔

برت توڑنے کے بعد گاندھی جی کی طاقت کئی دنوں میں رفتہ رفتہ بحال ہوئی۔ سردار پٹیل بمبئی سے واپسی پر ان سے ملنے آئے۔ میں اس وقت گاندھی جی کے پاس موجود تھا۔ گاندھی جی کی عظمت کا بہترین مظاہرہ ایسے ہی موقعوں پر ہوتا تھا۔ وہ بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ سردار پٹیل سے ملے۔ ان کے چہرے پر اور انداز میں غصے اور شکایت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ پٹیل کچھ پریشان نظر آرہے تھے اور ان کے انداز میں روکھا پن اور تکلف تھا۔ وہ گاندھی جی سے خوش نہیں تھے اور انہیں وہ باتیں پسند نہ آئی تھیں جو گاندھی جی نے مسلمانوں کے دل سے خوف اور خطرے کا احساس دور کرنے کے لیے کی تھیں۔

گاندھی جی کے برت کے بارے میں اس قسم کا رویہ رکھنے والے صرف سردار پٹیل ہی نہیں تھے بلکہ جس روز سے گاندھی جی نے پونا سے رہائی کے بعد مسٹر جناح سے مذاکرات شروع کیے تھے، ہندوؤں کا ایک گروپ ان کا شدید مخالف ہو گیا تھا اور اس بغض میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یہ لوگ یہ کہہ کر گاندھی جی کی سرعام مذمت کر رہے تھے کہ انہوں نے ہندوؤں کے جائز مفادات قربان کر دیے ہیں۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں تھی اور پورا ملک اسے جانتا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہندوؤں کی مخالفت میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں کا ایک طبقہ مہا سبھا اور راشٹریہ سویم سنگھ کی قیادت میں کھلے بندوں کہتا تھا کہ گاندھی جی ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کر رہے ہیں۔ انہوں نے گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا کی بھی مخالفت شروع کر دی تھی کیونکہ اس میں ہندو شاستروں کے اشلوکوں کے ساتھ قرآن اور انجیل بھی پڑھی جاتی تھی۔ گاندھی جی ستمبر ۱۹۴۷ میں دہلی آئے تو ان میں سے بعض لوگوں نے ان پرارتھنا سبھاؤں کے خلاف احتجاج شروع کر دیا اور کہا کہ وہ قرآن یا بائبل نہیں پڑھنے دیں گے۔ اس مقصد سے پمفلٹ اور ہینڈ بل بھی تقسیم کیے گئے۔ گاندھی جی کو ہندوؤں کا دشمن ٹھہرا کر لوگوں کو ان کے خلاف اکسایا گیا۔ ایک پمفلٹ میں تو یہ تک کہہ دیا گیا کہ اگر گاندھی جی نے اپنا طور طریق نہ بدلا تو انہیں قتل کرنے کی تدبیریں کرنی چاہئیں۔

گاندھی جی کے برت نے اس گروپ کو اور بھی برانگیختہ کر دیا اور انہوں نے گاندھی جی کے خلاف عملی قدم اٹھانے کی ٹھان لی۔ انہوں نے جیسے ہی پرارتھنا سبھاؤں کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا، ان پر ایک بم پھینکا گیا۔ خوش قسمتی سے کوئی شخص زخمی نہ ہوا البتہ اس خیال سے پورے ملک کو شدید صدمہ پہنچا کہ کوئی شخص گاندھی جی پر

ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔ پولیس نے تفتیش شروع کی لیکن تعجب ہے کہ نہ تو بم رکھنے والے کا پتا چل سکا اور نہ ہی یہ سراغ مل سکا کہ یہ لوگ برلا ہاؤس کے باغ میں کس طرح داخل ہوئے؟ عجیب بات یہ ہے کہ اس واقعے کے بعد بھی گاندھی جی کی جان کی حفاظت کے لیے کوئی معقول انتظام نہ کیا گیا۔ اس واقعے سے یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ ایک ایسا گروپ موجود ہے جو تعداد میں کم سہی لیکن گاندھی جی کی جان لینے کے در پے ہے۔ ایسی صورت میں فطری طور پر یہ امید کی جاسکتی تھی کہ دہلی کی پولیس اور سی آئی ڈی گاندھی جی کی حفاظت کے لیے خصوصی اقدامات کرے گی لیکن مجھے شرم اور رنج کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس آگہی کے بعد بھی معمولی سے معمولی احتیاطی تدبیریں بھی اختیار نہ کی گئیں۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ گاندھی جی کی طاقت آہستہ آہستہ بحال ہوئی اور انہوں نے پرارتھنا کے بعد حاضرین سے خطاب کرنا شروع کر دیا۔ پرارتھنا میں ہزاروں افراد شریک ہوتے تھے اور گاندھی جی یہ سمجھتے تھے کہ یہ جلسے ان کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کا سب سے موثر ذریعہ ہیں۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو اڑہائی بجے میں گاندھی جی سے ملنے گیا۔ ان کے ساتھ کئی اہم مسائل پر گفتگو کرنا تھی اور میں ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ اس کے بعد میں واپس چلا آیا لیکن ساڑھے پانچ بجے کے قریب مجھے اچانک یاد آیا کہ میں کچھ ضروری باتوں کے بارے میں ان کی رائے لینا بھول گیا ہوں۔ چنانچہ میں واپس برلا ہاؤس گیا۔ وہاں پہنچ کر جب میں نے دروازے بند پائے تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ ہزاروں افراد لان میں کھڑے تھے اور مجمع بڑھتے بڑھتے سڑک تک پہنچ چکا تھا۔ میں کچھ نہ سمجھ پایا کہ معاملہ کیا ہے لیکن جب ان لوگوں نے میری کار دیکھی تو اسے جانے کا راستہ دے دیا۔ میں پھاٹک کے قریب گاڑی سے اتر پڑا اور پیدل اندر چلا گیا۔ مکان کے سارے دروازے بند تھے۔ اندر سے کسی نے کھڑکی کے شیشے سے مجھے دیکھ لیا اور مجھے اندر لے جانے کے لیے آیا۔ میں اندر داخل ہوا تو کسی نے روتے ہوئے مجھ سے کہا:

''گاندھی جی کو گولی ماردی گئی ہے اور وہ بے ہوش پڑے ہیں۔''

یہ خبر اس قدر اچانک تھی اور اس سے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ کچھ دیر تک میں ان لفظوں کا مطلب سمجھ نہ پایا۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور میں لڑکھڑاتا ہوا گاندھی جی کے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ ان کے دونوں پوتے پاؤں پکڑے بیٹھے رو رہے تھے۔ مجھے معلوم ہوا جیسے خواب میں کوئی کہہ رہا ہے: ''گاندھی جی مر گئے!''

حرفِ آخر

گاندھی جی کے قتل کے ساتھ ہی ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ میں آج تک نہیں بھولا کہ ہم جدید ہندوستان کے غالباً سب سے جلیل القدر فرزند کی زندگی کی حفاظت کرنے میں کس بری طرح ناکام رہے۔ ان پر بم پھینکنے کے واقعے کے بعد یہ توقع کرنا ایک قدرتی بات تھی کہ دہلی کی پولیس اور سی آئی ڈی ان کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظامات کرے گی۔ کسی معمولی شخص پر قاتلانہ حملے کے بعد بھی پولیس اس کی حفاظت کا خاص اہتمام کرتی ہے۔ یہ اس صورت میں بھی کیا جاتا ہے جب کسی کو خطوں اور پمفلٹوں کے ذریعے دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ گاندھی جی کو خطوں اور پمفلٹوں کے ذریعے صرف اس قسم کی دھمکیاں ہی نہیں دی گئی تھیں بلکہ ان پر بم پھینکا گیا تھا۔ یہ دورِ حاضر کے ہندوستان کی عظیم ترین شخصیت کی زندگی کا سوال تھا۔ اس پر بھی کوئی موثر اقدامات نہ کیے گئے۔ ایسے اقدامات کرنا کوئی دشوار گزار کام نہیں تھا۔ گاندھی جی کی پرارتھنا کسی کھلے میدان میں نہیں بلکہ برلا ہاؤس کے لان میں چار دیواری کے اندر منعقد ہوتی تھی جہاں صرف پھاٹک سے داخلہ ممکن تھا۔ پولیس کے لیے آنے جانے والوں پر نظر رکھنا بہت آسان تھا۔

اس المناک حادثے کے بعد لوگوں کی عینی شہادت سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ قاتل نہایت مشکوک انداز میں اندر داخل ہوا تھا۔ اس کا طرزِ عمل اور اندازِ گفتگو ایسا تھا کہ سی آئی ڈی کو اس پر نظر رکھنی چاہیے تھی۔ اگر پولیس کوئی کارروائی کرتی تو اس کی نیت کا اندازہ کر کے اس سے پستول چھینی جا سکتی تھی لیکن ہوا یہ کہ وہ پستول لے کر بلا روک ٹوک اندر داخل ہو گیا۔ جب گاندھی جی پرارتھنا کے لیے آئے تو وہ اٹھا اور اس نے یہ کہہ کر گاندھی جی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا: ''آج آپ کو دیر ہو گئی۔'' گاندھی جی نے کہا: ''ہاں'' اور اس سے پہلے کہ ان کی زبان سے کوئی اور لفظ نکلتا، پستول کی تین گولیوں نے اس بیش قیمت زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

☆ ان تمام واقعات میں سب سے غور طلب بات یہ ہے کہ سردار پٹیل گاندھی جی کے شدید مخالف ہو گئے تھے۔ گاندھی جی نے جب مسلمانوں کی سلامتی کے مسئلے پر برت رکھا تو وہ گاندھی جی سے لاتعلق ہو گئے۔ پٹیل کا خیال تھا کہ یہ برت ان کی مخالفت میں رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میرے کہنے کے باوجود بمبئی چلے گئے۔ ان کے اس رویے کا مقامی پولیس پر بہت برا اثر پڑا۔ مقامی حکام کی نظریں پٹیل پر تھیں اور جب انہیں پتا چلا کہ انہوں نے گاندھی جی کی حفاظت کے لیے کوئی خصوصی احکامات جاری نہیں کیے تو انہوں نے بھی کوئی اقدامات کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

گاندھی جی کی موت سے پہلے سردار پٹیل نے ان سے قطع تعلق کر لیا تھا اور یہ بات لوگوں کے علم میں تھی۔ ☆
اس سانحے کے بعد ہر طرف غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ کچھ لوگوں نے کھلم کھلا سردار پٹیل پر نااہلی کا الزام لگایا۔ جے پرکاش نارائن نے اس مسئلے کو اٹھانے میں بڑی جرأت دکھائی۔ گاندھی جی کے انتقال پر رنج و غم کے اظہار کے لیے دہلی میں جو تعزیتی جلسہ ہوا، اس میں جے پرکاش نارائن نے صاف صاف یہ بات کہی کہ بھارتی حکومت کے وزیر داخلہ گاندھی جی کے قتل کی ذمے داری سے بچ نہیں سکتے۔ انہوں نے سردار پٹیل سے جواب طلب کیا کہ جب کھلے بندوں پروپیگنڈے کے ذریعے لوگوں کو گاندھی جی کے قتل کی ترغیب دی جا رہی تھی اور ان پر ایک بم بھی پھینکا جا چکا تھا تو آخر ان کی حفاظت کے لیے خاص اہتمام کیوں نہ کیا گیا؟
کلکتے کے مسٹر پرفلا چندر گھوش نے بھی یہی سوال اٹھایا۔ انہوں نے گاندھی جی کی قیمتی زندگی کو بچانے میں ناکامی پر بھارتی حکومت کی بھی مذمت کی اور کہا کہ سردار پٹیل کی سرکاری حیثیت گاندھی جی کی مرہون منت ہے اور وہ ایک مضبوط اور مستعد وزیر داخلہ کے طور پر مشہور ہیں۔ وہ وضاحت کریں کہ آخر وہ گاندھی جی کو بچانے میں کس طرح ناکام رہے؟
سردار پٹیل نے اپنے مخصوص انداز میں ان الزامات کی تردید کی۔ بلاشبہ انہیں اس سانحے سے شدید صدمہ پہنچا تھا لیکن لوگ جس طرح سرعام انہیں مورد الزام ٹھہرا رہے تھے، وہ بھی انہیں برا لگا۔ انہوں نے کانگریس کی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں کہا کہ کانگریس کے دشمن ان کے خلاف الزام تراشی کر کے جماعت میں نفاق ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے گاندھی جی کے ساتھ وفاداری کا اعادہ کیا اور کہا کہ پارٹی کو ان الزامات سے کوئی اثر نہیں لینا چاہیے بلکہ گاندھی جی کے انتقال سے جو خطرناک صورت حال پیدا ہوئی ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے اندر اور زیادہ استحکام اور یک جہتی پیدا کرنی چاہیے۔ کانگریس کے بہت سے ارکان نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ثابت قدمی سے ان کا ساتھ دیں گے۔
ملک کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً جو وارداتیں ہوئیں ان سے ظاہر ہو گیا کہ حالیہ برسوں میں فرقہ پرستی کا زہر کتنی دور تک سرایت کر چکا ہے۔ ملک میں مجموعی طور پر اس سانحے کا بہت گہرا اثر ہوا لیکن کئی شہروں اور قصبوں میں جشن منایا گیا اور مٹھائی بانٹی گئی۔ گوالیار اور جے پور میں خاص طور پر ایسے مظاہرے ہوئے۔ مجھے یہ سن کر بڑا افسوس ہوا کہ ان شہروں میں کھلم کھلا مٹھائی تقسیم کی گئی اور لوگوں نے سرعام خوشیاں منائیں۔ لیکن یہ مسرت اور شادمانی صرف وقتی تھی۔ مجموعی حیثیت سے قوم کو اس واقعے سے سخت صدمہ پہنچا تھا اور وہ غیظ و غضب کے عالم میں ان لوگوں پر ٹوٹ پڑے جو گاندھی جی کے دشمن سمجھے جاتے تھے۔ اس المیے کے دو یا تین ہفتوں کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ ہندو مہا سبھا یا آر ایس ایس کے لیڈر عوام کو منہ تک نہیں دکھا سکتے

تھے۔ ڈاکٹر شیام پرشاد مکر جی ان دنوں ہندو مہا سبھا کے صدر اور مرکزی حکومت کے وزیر تھے۔ وہ اپنے مکان سے باہر نکلنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے مہا سبھا سے استعفا دے دیا۔ بہر کیف آہستہ آہستہ صورت حال بہتر ہوئی اور لوگ اپنے کام کاج میں لگ گئے۔

گاندھی جی کے قاتل گوڈسے پر مقدمہ چلایا گیا لیکن مقدمے کی تیاری میں بہت دیر لگی۔ پولیس کی تفتیش میں کئی ماہ لگ گئے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کو قتل کرنے کی سازش کا جال بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ گوڈسے کی گرفتاری پر جو ردعمل ہوا، اس سے ظاہر تھا کہ ہندوؤں کے ایک طبقے میں فرقہ واریت کا زہر کتنا گہرا اثر کر چکا تھا۔ ہندوستانیوں کی اکثریت نے گوڈسے کی مذمت کی اور اسے غدار قرار دیا لیکن کچھ معزز خاندانوں کی خواتین نے اپنے ہاتھوں سے سویٹر بن کر اسے بھیجا۔ اس کی رہائی کے لیے ایک تحریک بھی چلائی گئی۔ اس کے طرفداروں نے کھل کر اس کا دفاع نہ کیا بلکہ یہ کہا کہ چونکہ گاندھی جی عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے اس لیے ان کے قاتل کو پھانسی نہیں دینی چاہیے۔ جواہر لعل کے نام بہت سے ٹیلی گرام بھیجے گئے کہ گوڈسے کو پھانسی دینا گاندھی جی کے اصولوں کے منافی ہوگا۔ بہ ہر حال قانون نے اپنا راستہ اختیار کیا اور ہائی کورٹ نے سزائے موت کی توثیق کر دی۔

گاندھی جی کے قتل کو ابھی دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ سردار پٹیل کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں یہ دورہ اس صدمے سے پڑا جو حالیہ واقعات سے انہیں پہنچا تھا۔ جب تک گاندھی جی زندہ تھے، پٹیل ان سے خفا رہے۔ جب گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا اور لوگوں نے ان پر غفلت اور نااہلی کا الزام لگایا تو انہیں بہت سخت دھچکا لگا اور انہوں نے ذلت محسوس کی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی فراموش نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی ساری عزت اور حیثیت گاندھی جی ہی کی مرہون منت تھی۔ یہ احساس بھی کچھ کم باعث ذلت نہ رہا ہوگا کہ گاندھی جی ہر حال میں ان سے محبت رکھتے تھے اور ان کا لحاظ کرتے تھے۔ یہ سب باتیں ان کے دماغ پر اثر انداز ہوتی رہیں اور انہیں پریشان کرتی رہیں یہاں تک کہ وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہو گئے۔ اس کے بعد اگرچہ وہ مزید چار سال تک زندہ رہے لیکن ان کی صحت کبھی بحال نہ ہوئی۔

اس طرح ہندوستان نے آزادی تو حاصل کر لی لیکن اپنی سالمیت کھو دی۔ پاکستان کے نام سے ایک نئی مملکت وجود میں آ گئی۔ پاکستان چونکہ مسلم لیگ کی تخلیق تھی اس لیے نئی مملکت میں اس کا برسر اقتدار آنا ایک فطری بات تھی۔ میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ مسلم لیگ کے قیام کی غرض کانگریس کی مخالفت تھی اس لیے اس کے ارکان میں شاید ہی کوئی ایسا تھا جس نے جنگ آزادی میں حصہ لیا ہو۔ انہوں نے نہ تو قربانیاں دی تھیں اور نہ ہی جدوجہد کی بدولت ان میں نظم و ضبط پیدا ہوا تھا۔ ان میں یا تو ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے یا پھر وہ لوگ جنہیں انگریزوں کی

سرپرستی پبلک زندگی کے میدان میں لے آئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب نئی ریاست کی تشکیل ہوئی تو اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گیا جن کے پاس نہ تو خدمت اور نہ ہی کسی قربانی کا کوئی ریکارڈ تھا۔ نئی مملکت کے حکمرانوں میں بہت سے خودغرض لوگ شامل تھے جو محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر پبلک زندگی میں در آئے تھے۔

پاکستان کے لیڈروں کی اکثریت یوپی، بہار اور بمبئی کے لوگوں کی تھی۔ وہ ان علاقوں کی زبان تک نہیں بول سکتے تھے جن پر اب پاکستان مشتمل تھا۔ اس طرح نئی مملکت میں حاکموں اور رعایا کے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔ ان خودساختہ لیڈروں کو خطرہ تھا کہ اگر آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہوئے تو ان میں اکثر کے منتخب ہونے کا امکان بہت کم ہے چنانچہ ان کی کوشش یہی رہی کہ انتخابات کو جہاں تک ممکن ہو، ملتوی کیا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ کر اقتدار کو طول دے سکیں۔ دس سال بیت چکے ہیں اور ابھی حال ہی میں دستور مرتب ہو پایا ہے۔ یہ آئین بھی آخری نہیں کیونکہ اس دستور میں تبدیلیوں کے لیے آئے دن تجویزیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ نئے دستور کے تحت پہلے انتخابات ہوں گے بھی یا نہیں یا کب عمل میں آئیں گے؟

پاکستان کے قیام کا صرف ایک نتیجہ نکلا ہے کہ برصغیر ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کمزور ہو گئی ہے۔ بھارت میں رہنے والے ساڑھے چار کروڑ مسلمان تو کمزور ہو ہی گئے لیکن دوسری طرف خود پاکستان میں اب تک کسی مستحکم اور مستعد حکومت کے قیام کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اگر صرف مسلمانوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاکستان کا قیام ان کے لیے نہایت نامساعد اور نامبارک قدم ثابت ہوا ہے۔ دراصل میں جتنا غور کرتا ہوں، اتنا ہی میرا یقین پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اس حد تک بگڑ چکے تھے کہ تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے بیشتر حامیوں کا یہی نظریہ تھا اور تقسیم کے بعد کانگریس کے بہت سے لیڈر بھی اس نظریے کو تسلیم کرنے لگے تھے۔ بٹوارے کے بعد میں نے جواہر لعل یا سردار پٹیل کے ساتھ جب بھی اس مسئلے پر گفتگو کی، انہوں نے اپنے فیصلے کی حمایت میں یہی دلیل پیش کی۔ بہرکیف اگر مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کا تجزیہ غلط ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے کیبنٹ مشن کے موقعے پر جو اسکیم مرتب کی تھی اور جسے مشن نے بڑی حد تک منظور بھی کر لیا تھا، اس میں ہر لحاظ سے ہمارے مسائل کا بہترین حل موجود تھا۔ اگر ہم ثابت قدم رہتے اور تقسیم کو منظور کرنے سے انکار کر دیتے تو مجھے پورا یقین ہے کہ سلامتی اور شان و شوکت ہر لحاظ سے ہمارا مستقبل بہتر ہوتا۔

کیا کوئی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ پاکستان کے قیام سے فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہیں ہوا بلکہ پاکستان نے اسے اور زیادہ شدید اور ضرر رساں بنا دیا ہے؟ پاکستان کی بنیاد ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے

درمیان عداوت پر رکھی گئی تھی۔ پاکستان کے قیام نے اسے مستقل آئینی حیثیت دے دی ہے جس سے اس مسئلے کا حل اور بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اس صورت حال کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ برصغیر دو ریاستوں میں تقسیم ہو گیا جو نفرت اور خوف کی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتی رہتی ہیں۔ پاکستان کو یقین ہے کہ بھارت اسے چین سے نہیں بیٹھنے دے گا اور جب بھی موقع ملا، اسے نیست و نابود کر دے گا۔ اسی طرح بھارت اس خوف میں مبتلا ہے کہ پاکستان کو جب بھی موقع ملا، وہ اس پر حملہ کر دے گا۔ اس خوف و ہراس نے دونوں ملکوں کو اپنے دفاعی اخراجات بڑھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ جنگ کے بعد پورے غیر منقسم ہندوستان کے دفاع پر کل ایک سو کروڑ روپے خرچ ہوتے تھے۔ خود لارڈ ویول کا خیال تھا کہ ایک سو کروڑ روپے فوج کی تینوں شاخوں کے لیے کافی ہیں۔ پھر تقسیم عمل میں آئی۔ متحدہ ہندوستان کی ایک چوتھائی فوج پاکستان چلی گئی۔ اس کے باوجود بھارت کو اپنی مسلح افواج پر اڑھائی سو کروڑ روپے خرچ کرنا پڑتے ہیں۔ اس طرح بھارتی حکومت کی تقریباً نصف آمدنی دفاع پر صرف ہو جاتی ہے۔ پاکستان کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ اس کے پاس بھارت کے مقابلے میں زمین اور فوج صرف ایک چوتھائی ہے، وہ اپنی آمدنی میں سے کم از کم ایک سو کروڑ روپے دفاع پر خرچ کر رہا ہے۔ یہ رقم اس امداد کے علاوہ ہے جو اسے امریکا سے ملتی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ قومی وسائل کا یہ کس قدر بے جا مصرف ہے۔ اگر یہی رقم معاشی نشو و نما پر خرچ کی جاتی تو ملک کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو سکتی تھی۔

مسٹر جناح اور ان کے ساتھی یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایک سمٹے ہوئے علاقے میں ان کی الگ ریاست بنانا ممکن نہیں تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے شمال مغرب اور شمال مشرق میں تھے۔ یہ دونوں علاقے کسی مقام پر بھی ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں۔ ان دونوں علاقوں کے باشندے مذہب کے سوا ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ کہنا عوام کو بہت بڑا فریب دینا ہے کہ مذہبی یگانگت دو ایسے علاقوں کو متحد کر سکتی ہے جو جغرافیائی، معاشی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ یہ درست ہے کہ اسلام نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی کوشش کی جو نسلی، لسانی، اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی حد بندیوں سے بالاتر ہو لیکن تاریخ گواہ ہے کہ شروع کے چند عشروں یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کو چھوڑ کر اسلام سارے اسلامی ملکوں کو مذہب کی بنیاد پر کبھی متحد نہیں رکھ سکا۔

یہ صورت حال اس وقت بھی تھی اور اب بھی ہے۔ کون اس کی توقع کر سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان اپنے سارے اختلافات دور کر کے ایک قوم بن جائیں گے۔ خود مغربی پاکستان کے اندر سندھ، پنجاب اور سرحد کے تین صوبے اپنے اپنے مقاصد اور مفادات کے لیے کام کر رہے ہیں۔ بہ ہر حال اب جو کچھ ہونا تھا،

ہو چکا اور پاکستان ایک حقیقت بن چکا ہے۔ اب بھارت اور پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو فروغ دیں اور اشتراک عمل سے کام لیں۔ اگر کوئی اور پالیسی بنائی گئی تو وہ بڑے مصائب و آلام کا باعث بن سکتی ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہوا وہ ناگزیر تھا۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا، وہ غلط تھا اور اس سے بچنا ممکن تھا۔ ہم آج یہ نہیں کہہ سکتے کہ دونوں میں سے کون درست ہے۔ یہ تو تاریخ ہی فیصلہ کرے گی کہ آیا ہم نے دانشمندی اور مصلحت سے کام لیا تھا؟ (ستمبر ۱۹۵۷)

ضمیمے

ضمیمہ نمبر ا

ایڈیٹرز نوٹ

مولانا آزاد کی سوانح عمری کا پہلا مسودہ تیار ہوا تو انہوں نے محسوس کیا کہ بعض شخصیتوں اور واقعات کے بارے میں ان کی آرا اور تجزیوں کی اشاعت کے لیے یہ وقت مناسب نہیں چنانچہ انہوں نے ایک نظر ثانی شدہ مسودہ تیار کیا جو درج ذیل عنوان سے شائع کیا جا رہا ہے: *India Wins Freedom,* An Auto Biographical Narrative

By Maulana Abul Kalam Azad

مولانا کا خیال تھا کہ انہیں بعض متنازع مسائل کے بارے میں اپنے تجزیوں اور آرا پر مبنی مکمل ریکارڈ تیار کرنا چاہیے جو مستقبل کے مورخ کے کام آسکے۔ یہ ریکارڈ موجودہ کتاب سے حذف کر دیا گیا ہے۔ اصل مسودے سے جو مواد حذف نہیں کیا گیا، اس میں بھی بعض معمولی فرق موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسودے کے متن پر کئی مرتبہ نظر ثانی کی گئی ہے اور ماسوائے ایک یا دو مواقع کے، بعض ہم عصروں اور ساتھیوں کے بارے میں ان کی رائے کو نرم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں جو پیرا گراف شامل نہیں کیے گئے وہ مولانا آزاد کے اصل تجزیوں پر مبنی ہیں اور انہیں نیشنل آرکائیوز میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ جن معاملوں کے بارے میں مولانا نے اپنی رائے محفوظ رکھی ہے ان کا تعلق درج ذیل امور سے ہے:

اے: مولانا آزاد یہ محسوس کرتے تھے کہ ڈاکٹر سید محمود کو بہار میں کانگریس کا پہلا وزیر اعلیٰ نامزد نہ کر کے ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ دوسری طرف ان کی پختہ رائے تھی کہ ڈاکٹر سید محمود نے قلعہ احمد نگر جیل سے رہائی حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا وہ بالکل غلط اور ناقابل دفاع تھا۔ مولانا نے ڈاکٹر محمود کے بعض ان کاموں پر بھی نکتہ چینی کی جو انہوں نے جیل سے رہائی پانے کے بعد کیے تھے۔ انہوں نے ان دونوں معاملوں کے بارے میں پیروں کو مسودے سے حذف کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

بی: مولانا سمجھتے تھے کہ سردار پٹیل کا رول کانگریس کے نصب العین کے منافی تھا۔ انہوں نے شائع شدہ مسودے میں سردار پٹیل کے بارے میں واضح انداز میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے البتہ انہوں نے بعض سخت جملوں کو حذف کر دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ قومی مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ان حصوں کی اشاعت مؤخر کر دینی چاہیے۔

سی: مولانا آزاد مسٹر کرشنا مینن کو نہ صرف ناپسند کرتے تھے بلکہ انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسٹر کرشنا مینن قابل اعتماد شخص نہیں۔ وہ اپنی سوانح حیات کی تیسری جلد میں بھارتی ہائی کمشنر کی حیثیت سے مسٹر مینن کے بعض کاموں کو تفصیل کے ساتھ زیر بحث لانا چاہتے تھے۔ مولانا کو یقین تھا کہ مسٹر مینن کے خلاف عائد کیے جانے والے الزامات کی تفتیش ہونی چاہیے تاکہ انہیں یا تو ان الزامات سے بری قرار دیا جائے یا اس کی سزا دی جائے۔ اس مسئلے پر ان کا موقف اس قدر سخت تھا کہ ۱۹۵۴ میں جب مسٹر جواہر لعل نہرو نے مسٹر مینن کو کابینہ میں شامل کرنا چاہا تو مولانا آزاد نے اپنا استعفا بھیج دیا۔ بعد میں انہیں بڑی منت سماجت کے ساتھ مسٹر مینن کی کابینہ میں شمولیت پر راضی کیا گیا۔ انہوں نے کھلے بندوں کہا کہ وہ صرف مسٹر نہرو کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس پر راضی ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اس موقعے پر اپنے خیالات کی تشہیر کرنا نہیں چاہتے کیونکہ اس سے مسٹر نہرو کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔

ڈی: مولانا آزاد مسٹر جواہر لعل نہرو کے بارے میں محبت آمیز جذبات رکھتے تھے اور ان کے مداح تھے البتہ انہیں مسٹر نہرو کے بعض اقدامات سے سخت اختلاف تھا۔ انہوں نے کتاب کے مطبوعہ مسودے میں مسٹر نہرو کے کئی فیصلوں اور کارروائیوں سے اختلاف کے واضح اشارے کیے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مسٹر نہرو میں کئی خوبیاں موجود ہیں اور ہندوستان کے لیے ان کی خدمات

اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کی چند ایک خامیوں پر زور نہیں دینا چاہیے خاص طور پر ان کی زندگی میں انہیں ہدف تنقید نہیں بنانا چاہیے۔
مولانا کا خیال تھا کہ جس بات سے مسٹر نہرو کی شخصیت کمزور ہو وہ قومی مفاد کے لیے مضرت رساں ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ مستقبل کے مؤرخ کو مسٹر نہرو کی ان ناکامیوں کا علم ہونا چاہیے۔ اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اپنی سوانح عمری میں ان خامیوں کا تذکرہ کر دیا ہے۔

مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ ان پیروں کو اس وقت ان کی سوانح حیات میں شامل کیا جائے جب نیشنل آرکائیوز میں رکھا گیا مسودہ پبلشر کو جاری کر دیا جائے۔

ہمایوں کبیر

نئی دہلی
۱۲ اپریل ۱۹۵۸

ضمیمہ نمبر ۲

حکومتِ برطانیہ کی ۲۹ مارچ ۱۹۴۲ کی تجاویز

سر اسٹیفرڈ کرپس نے برطانوی حکومت کی طرف سے درج ذیل اعلان کا مسودہ جاری کیا:

ہز میجسٹی کی حکومت نے ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں وعدوں کے ایفا کے متعلق برطانیہ اور ہندوستان میں پائی جانے والی تشویش کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ صاف اور صریح لفظوں میں یہ بیان کر دیا جائے کہ وہ ہندوستان میں جلد از جلد خود مختار حکومت قائم کرنے کی غرض سے کون سے اقدامات اٹھانا چاہتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ایک نئی انڈین یونین بنائی جائے جو ڈومینین کی حیثیت کی حامل ہو، جو تاج برطانیہ کے ماتحت برطانیہ اور دوسری خود مختار مملکتوں کے ساتھ شریک ہو مگر ہر لحاظ سے ان کے برابر درجہ رکھتی ہو اور اپنے داخلی اور خارجی معاملات میں کسی طرح بھی پابند نہ ہو۔

ہز میجسٹی کی حکومت ان حالات کے پیش نظر حسب ذیل اعلان کرتی ہے:

اے: جنگ ختم ہوتے ہی ہندوستان میں ایک منتخب شدہ ادارے کو، جس کی ترتیب کا طریق کار یہاں بیان کیا گیا ہے، بروئے کار لانے کی کارروائی کی جائے گی۔ اس ادارے کو ہندوستان کے لیے ایک نیا دستور تیار کرنے کی ذمے داری سونپی جائے گی۔

بی: دستور ساز ادارے میں ہندوستانی ریاستوں کی شرکت کا انتظام درج ذیل طریقے پر کیا جائے گا۔

سی: ہز میجسٹی کی حکومت یقین دلاتی ہے کہ اس طریقے سے جو دستور مرتب ہوگا، اسے ان شرطوں کے ساتھ فوراً منظور کر لیا جائے گا (I) برٹش انڈیا کے ہر اس صوبے کو، جو نئے دستور کو منظور کرنے پر راضی نہ ہو، یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی موجودہ آئینی حیثیت کو برقرار رکھے البتہ دستور میں یہ گنجائش رکھی جائے گی کہ اگر وہ چاہے تو بعد میں یونین میں شامل ہو جائے۔

ہز میجسٹی کی حکومت اس پر راضی ہوگی کہ ان صوبوں کے ساتھ، جو یونین میں شامل نہ ہوں، ان کی خواہش کے مطابق ایک نئے دستور کے ساتھ معاملت کرے، اس دستور کے تحت انہیں وہی حیثیت دی جائے گی جو انڈین یونین کو حاصل ہوگی۔ یہ دستور درج ذیل طریقے سے مرتب کیا جائے گا۔

(II) ایک معاہدے پر دستخط ہوں گے جس کی شرطیں ہز میجسٹی کی حکومت اور دستور ساز ادارے کے درمیان مذاکرات کے بعد مرتب ہوں گی۔ یہ معاہدہ ان تمام ضروری معاملات پر حاوی ہوگا جو اختیارات کو کلی طور پر انگریزوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کی وجہ سے پیدا ہوں گے۔ اس معاہدے میں ایسی دفعات شامل ہوں گی جن کے مطابق ہز میجسٹی کی حکومت کے ان وعدوں کی تکمیل ہوگی جو اس نے نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کی غرض سے کر رکھے ہیں البتہ اس معاہدے میں ایسی کوئی شرط شامل نہیں ہوگی جس سے انڈین یونین کے یہ طے کرنے کے اختیار میں کمی ہو جائے کہ وہ برطانوی دولت مشترکہ کے دوسرے ارکان کے ساتھ کیا تعلقات رکھے گی۔

ہندوستانی ریاستوں میں سے ہر ایک کے ساتھ، چاہے وہ دستور کے مطابق چلنا پسند کرے یا نہ کرے، مذاکرات کر کے اس پر نظر ثانی کرنا ضروری ہوگا جو اس کے ساتھ کیا جا چکا ہے، جہاں تک کہ نئی صورت حال اس کی متقاضی ہو۔

ڈی: اگر ہندوستان کے اہم طبقوں کے لیڈر جنگ کے خاتمے سے پہلے کسی اور طریقے پر متفق نہ ہو جائیں، دستور ساز ادارہ حسب ذیل صورت کے مطابق وجود میں آئے گا:

جیسے ہی صوبائی انتخابات کے نتائج معلوم ہو جائیں گے، جن کا جنگ کے خاتمے پر عمل میں آنا ضروری ہے، صوبوں کی قانون ساز اسمبلیوں کے ایوان زیریں کے جملہ ارکان واحد انتخابی ادارے کی طرح دستور ساز اسمبلی کا انتخاب متناسب نمائندگی کے اصول کی

بنیاد پر کریں گے۔ اس نئی اسمبلی کے ارکان کی تعداد انتخابی ادارے کے کل ارکان کے تقریباً دس فی صد کے برابر ہوگی۔
ہندوستانی ریاستوں کو بھی اپنے نمائندے مقرر کرنے کی دعوت دی جائے گی۔ ان نمائندوں کی تعداد کی ریاستوں کی کل آبادی کے ساتھ وہی نسبت ہوگی جو مجموعی اعتبار سے برٹش انڈیا کے نمائندوں کی ہے اور انہیں برٹش انڈیا کے نمائندوں کے برابر اختیارات حاصل ہوں گے۔

ای: ہندوستان کو درپیش موجودہ نازک صورت حال کے دوران اور نیا دستور مرتب ہونے تک ہز میجسٹی کی حکومت ہندوستان کے دفاع کی ذمے دار ہے اور وہ عالمگیر جنگ میں اپنی جدوجہد کے ایک حصے کے طور پر ہندوستان کے دفاع کو اپنے ہاتھ اور اپنے اختیار میں رکھے گی البتہ ہندوستان کے پورے فوجی، اخلاقی اور مادی وسائل کو بروئے کار لانے کا فرض ہندوستانی قوم کی اعانت کے ساتھ ہندوستان کی حکومت کے ذمے ہوگا۔ ہز میجسٹی کی حکومت چاہتی ہے کہ ہندوستانی قوم کے اہم طبقوں کے لیڈر فوراً اور موثر طریقے پر اپنے ملک، برطانوی دولت مشترکہ اور اقوام متحدہ کے مشوروں میں شریک ہوں اور وہ انہیں اس کی دعوت بھی دیتی ہے۔
اس طرح وہ ایک فرض کی انجام دہی میں، جو ہندوستان کی آنے والی آزادی کے لیے نہایت اہم اور ناگزیر ہے، سرگرمی کے ساتھ اور مفید طریقے پر مدد کرسکیں گے۔

ضمیمہ نمبر ۳

سر اسٹیفرڈ کرپس سے خط و کتابت

برلا پارک، نئی دہلی

۱۰ اپریل ۱۹۴۲ء

ڈیئر سر اسٹیفرڈ!

۲ اپریل کو میں نے آپ کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد بھیجی تھی جس میں کمیٹی نے ان تجاویز پر اظہار خیال کیا ہے جو آپ نے برطانوی حکومت کی جانب سے پیش کی ہیں۔ اس قرارداد میں ہم نے مستقبل سے متعلق کئی اہم اور دور رس تجاویز سے اختلاف کیا ہے۔ ان تجویزوں پر مزید غور و خوض کرنے سے ان کے بارے میں ہمارا یقین اور بھی پختہ ہو گیا ہے اور ہم اس بات کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ان تجاویز کو موجودہ شکل میں قبول نہیں کر سکتے۔ ان تجویزوں پر پورے طور پر غور کرنے کے بعد ہم جن نتائج پر پہنچے ہیں، ان کا اظہار ورکنگ کمیٹی کی اس قرارداد سے ہوتا ہے۔

اس قرارداد میں موجودہ صورت حال کی نزاکت پر زور دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ ہم جو بھی فیصلہ کریں گے اس کا دارو مدار ان تبدیلیوں پر ہوگا جو اس وقت عمل میں لائی جائیں گی۔ اس وقت ہم سب اور خصوصاً تمام ہندوستانیوں کے لیے جو مسئلہ سب پر حاوی ہے وہ جارحیت اور حملوں کے خلاف ملک کے دفاع کا ہے۔ مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ اگلے چند مہینوں یا برسوں میں کیا واقعات رونما ہوتے ہیں؟ چنانچہ ہم اس بات پر آمادہ تھے کہ مستقبل کے بارے میں اصرار کیے بغیر جو کچھ ہو سکتا ہے، کریں اور یہ امید کریں کہ ملک کے لیے اپنی قربانیوں کے ذریعے ہم ایک آزاد اور خود مختار ہندوستان کی ٹھوس اور مستحکم بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر ہم نے اپنی تمام تر توجہ حال پر مرکوز کر رکھی ہے۔

مجوزہ اعلان کی شق (ای) میں حال کے بارے میں آپ کی تجاویز بڑی مبہم اور نامکمل ہیں البتہ اس میں صراحت کر دی گئی ہے کہ ''ہز میجسٹی کی حکومت ہندوستان کے دفاع کی مکمل طور پر ذمے دار ہوگی۔'' دراصل اس تجویز میں ہم سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہم ''مستقبل میں ہندوستان کی آزادی'' کو یقینی بنانے کے لیے آج کی مہموں میں شریک ہو جائیں۔ آزادی آج کے لیے نہیں بلکہ ایک غیر یقینی مستقبل کے لیے تھی اور شق (ای) میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا کہ زمانہ حال میں کیا انتظامات کیے جائیں گے اور حکومت کے انتظامات میں کس قسم کی تبدیلی عمل میں لائی جائے گی۔ جب اس ابہام کی جانب توجہ دلائی گئی تو آپ نے کہا کہ ایسا عمداً کیا گیا ہے تا کہ آپ دوسروں سے مشورہ کر کے آزادی کے ساتھ ان تبدیلیوں کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔ آپ نے گفتگو کے دوران یہ تاثر دیا کہ آپ کے ذہن میں ایک ایسی قومی حکومت کا خاکہ موجود ہے جسے ماسوائے دفاع کے دوسرے تمام معاملات نمٹانے کا اختیار ہوگا۔

دفاع کا معاملہ ہر حالت میں اور خاص طور پر دوران جنگ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو قومی حکومت کا دائرہ عمل بہت محدود رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات ظاہر تھی کہ آپ کی تجویزوں اور ہماری گفتگو کا تمام تر حاصل ہندوستان پر حملے کے خطرے سے پیدا ہونے والے فوری مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔ ایسی صورت میں قومی حکومت کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دفاع کے مخصوص اقدامات پر توجہ کرے، جہاں تک ہو سکے دفاع کو عوامی منصوبہ بنائے اور ساتھ ہی پوری قوم میں حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے لیے جذبہ پیدا کرے۔ اس کا حق صرف وہی قومی حکومت ادا کر سکتی ہے جس پر اس کی ذمے داری ڈالی گئی ہو۔ عوامی مدافعت کے لیے قومی پس منظر کا ہونا ضروری ہے اور سپاہیوں اور شہریوں دونوں کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ اپنے قومی لیڈروں کی سرکردگی میں ملک کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔

یہ سوال صرف ہماری قومی آرزو پوری کرنے کا ہی نہیں رہا بلکہ درحقیقت جنگی کارروائیوں کو موثر بنانے اور ہندوستان کی سرزمین پر حملہ کرنے والے کا آخری دم تک مقابلہ کرنے کا معاملہ بن گیا ہے۔ عام اصول کے مطابق قومی حکومت وزیر دفاع کے ذریعے دفاعی معاملات کو کنٹرول کرتی ہے اور مسلح افواج ایسے کمانڈر انچیف کے ماتحت ہوتی ہیں جسے جنگ سے متعلق عملی کارروائیوں میں مصلحت سے کام لینے کا پورا اختیار ہو۔ عام دستور کے مطابق ہندوستان کی قومی حکومت کو بھی اسی طرح عمل کرنا چاہیے۔ ہم نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ کمانڈر انچیف کو مسلح افواج، جنگی کارروائیوں اور ان سے متعلق معاملات پر پورا اختیار ہو گا۔ ہم تصفیے کی خاطر وزیر دفاع کے معمول کے اختیارات کو محدود کرنے کے لیے تیار تھے۔ ہم یہ بالکل نہیں چاہتے تھے کہ جنگ کے زمانے میں موجودہ فوجی انتظامات کو تہ و بالا کر دیں۔ ہم نے یہ بھی منظور کر لیا تھا کہ جنگ کے بارے میں اعلیٰ حکمت عملی لندن کی وار کیبنٹ کے کنٹرول میں رہے جس میں ایک ہندوستانی ممبر بھی شامل ہونا چاہیے۔ ہمارا فوری مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے دفاع کو زیادہ موثر اور مستحکم بنایا جائے، اس کی بنیاد عوام کے حوصلے اور ارادے پر رکھی جائے اور سرخ فیتے، تاخیر اور سستی کو ہر طرح سے دور کیا جائے۔ فنی اور عملی معاملات میں ہماری مداخلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ ایک بات ہمارے لیے سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی یعنی ہندوستان کی سلامتی اور اس کا دفاع۔ اس بنیادی شرط کو تسلیم کر لینے کے بعد کوئی وجہ نہیں تھی کہ جس بند گلی میں ہم پھنس گئے ہیں، اس سے نکلنے کی ایسی راہ تلاش کرنے میں دشواری ہو جو عوام کی متفقہ خواہش کے مطابق ہو کیونکہ اس خواہش کو پورا کرنے کے معاملے میں ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

دفاع پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ نے اس مسئلے پر دوبارہ غور کیا اور آپ نے ۷ اپریل کو مجھے ایک خط لکھا جس میں دفاع کے بارے میں ایک فارمولا تجویز کیا گیا۔

آپ نے اس خط میں لکھا: ''جیسا کہ ورکنگ کمیٹی خود سمجھتی ہے، جنگ کے زمانے میں موجودہ دستور میں کسی قسم کی تبدیلی عمل میں لانا ممکن نہیں ہے۔'' اس بارے میں ورکنگ کمیٹی کے رویے کو سمجھنے میں فاش غلطی کی گئی ہے اور میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں گو کہ یہ معاملہ فوری طور پر زیر بحث نہیں ہے۔ کمیٹی یہ نہیں سمجھتی کہ دوران جنگ میں آئین میں تبدیلی کرنا فی نفسہٖ دشوار ہو گا۔ ہر وہ کارروائی، جس سے جنگ میں مدد مل سکتی ہو، کی جا سکتی ہے بلکہ اسے ضرور کرنا چاہیے۔ جنگ صرف اسی طرح لڑی اور جیتی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے پیچیدہ قوانین بنانے کی ضرورت نہیں ہے، آمادگی شرط ہے ورنہ ہندوستان کی آزادی اور اس کے حق خود ارادی کو تسلیم کر کے چند تبدیلیاں عمل میں لانا مشکل نہ تھا۔ باقی باتوں کو اس وقت کے لیے چھوڑا جا سکتا ہے جب اور انتظامات کیے جائیں گے اور معاملات کو ترتیب دی جائے گی۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ سقوط فرانس کے وقت خود برطانیہ کے وزیر اعظم نے برطانیہ اور فرانس کو متحد کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس سے بڑی اور اس سے اہم بنیادی تبدیلی کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور یہ تبدیلی بہت ہی شدید خطرے اور بحران کے وقت میں تجویز کی گئی تھی۔ جنگ تبدیلیوں کے عمل کو تیز کرتی ہے، اسے سکوت اور جمود کے تصورات سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

آپ نے دفاع کا جو فارمولا ہمیں بھیجا تھا، اس پر غور کرتے وقت ہم نے وہ ضمیمہ بھی سامنے رکھا جس میں محکمہ دفاع کو منتقل ہونے والے امور یا شعبوں کی فہرست موجود تھی۔ اس فہرست نے ہماری آنکھیں کھول دیں کیونکہ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ وزیر دفاع کو صرف غیر اہم معاملوں میں اختیار ہو گا۔ یہ بات ہمیں بالکل منظور نہیں تھی اور ہم نے آپ کو اس کی اطلاع دے دی تھی۔

اس کے بعد دفاع کا ایک نیا فارمولا ہمارے سامنے پیش کیا گیا جس کے ساتھ شعبوں کی کوئی فہرست نہیں تھی۔ یہ فارمولا ہمیں زیادہ معقول نظریے پر مبنی معلوم ہوا۔ ہم نے اس میں کچھ تبدیلیاں تجویز کیں اور ساتھ ہی اس جانب اشارہ کیا کہ شعبوں کی تقسیم کے بعد ہی ہم کوئی حتمی فیصلہ کر سکیں گے۔ اس فارمولے پر نظر ثانی کے بعد اسے دوبارہ ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس کے ساتھ ہی محکمہ جنگ کے فرائض کا عندیہ دیا گیا۔

اس فارمولے کو ایسے بسیط اور ہمہ گیر طریقے پر ترتیب دیا گیا تھا کہ ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا کہ محکمہ دفاع اور

محکمہ جنگ کے درمیان شعبوں کی اصل تخصیص کیا ہوگی؟ اس پر ہم نے یہ درخواست کی کہ ہمیں ان شعبوں کے فرائض کے بارے میں مکمل فہرست مہیا کی جائے تاکہ ہم اس پر غور کر سکیں۔ ایسی کوئی فہرست ہمیں نہیں بھیجی گئی۔

کل آپ سے گفتگو کے دوران اس نئے فارمولے پر تبادلہ خیال ہوا اور ہم نے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ اس سلسلے میں جو باتیں میں نے کیں، انہیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک فارمولے کی عبارت کا تعلق ہے، وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی ہم اسے اپنے راستے میں حائل ہونے دینا چاہتے ہیں تاوقتیکہ وہ کسی بنیادی اصول پر اثر انداز نہ ہو۔ لیکن فارمولے کی عبارت کے پس پشت کچھ خیالات تھے اور ہمیں یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ پچھلے چند دنوں میں ہم جن مفروضوں کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ غلط تھے۔

جب ہم نے دونوں محکموں کی تفصیلی فہرست مانگی تو آپ نے محکمہ دفاع کی اس پرانی فہرست کا حوالہ دیا جو آپ ہمیں پہلے بھیج چکے تھے اور جسے ہم منظور نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے کہا تھا کہ باقی ماندہ ذمے داریوں میں سے کچھ اور اس فہرست میں شامل کی جا سکتی ہیں لیکن عملاً اس کا کوئی امکان نہیں ہوگا کیونکہ تخصیص کا کام مکمل ہے۔ گویا آپ کا مطلب یہ تھا کہ اب نئی اور پرانی فہرست میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر واقعی ایسا تھا اور ہمیں وہیں واپس آنا تھا جہاں سے ہم نے گفتگو شروع کی تھی تو پھر ہمارے لیے کوئی نیا فارمولا تلاش کرنے کا کیا فائدہ تھا؟ پرانی بات کو نئے الفاظ میں دہرانے سے کیا فرق پڑتا ہے! ہماری گفتگو کے دوران کئی اور باتیں بھی واضح ہوگئیں جو بدقسمتی سے ہمارے لیے ناموافق ہیں۔ آپ نے نجی گفتگو اور عام بیانات میں ایک قومی حکومت اور وزراء پر مشتمل ایک کابینہ تشکیل دینے کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ الفاظ خاص معانی رکھتے تھے چنانچہ ہم نے اندازہ لگایا کہ نئی حکومت کو کابینہ کے مکمل اختیارات حاصل ہوں گے اور وائسرائے ایک آئینی سربراہ کے فرائض انجام دے گا۔ لیکن آپ نے جو نئی تصویر ہمارے سامنے رکھی ہے، وہ یہاں کی حکومت کی پرانی تصویر سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اس کی حیثیت وہی ہے صرف صورت بدل دی گئی ہے۔ نئی حکومت کو قومی حکومت کہنا ایک مبہم اور خلاف واقعہ بیان ہوگا اور وہ قومی حکومت کی حیثیت سے کام بھی نہیں کر سکے گی۔ دراصل اس میں وائسرائے ہوگا اور اس کی ایگزیکٹو کونسل اور اس میں وائسرائے کو تمام پرانے اختیارات حاصل ہوں گے۔ ہم نے کسی قانونی تبدیلی کا مطالبہ نہیں کیا تھا البتہ ہم نے اس بارے میں واضح یقین دہانی ضرور چاہی تھی کہ نئی حکومت ایک آزاد حکومت کی طرح کام کرے گی اور اس کے ارکان دستوری کابینہ کے ممبروں کی طرح کام کریں گے۔ جہاں تک جنگ اور متعلقہ معاملات کا تعلق ہے، کمانڈر انچیف کو آزادی ہوگی اور وہ وزیر جنگ کی طرح کام کرے گا۔

ہمیں یہ بتایا گیا کہ فی الحال مبہم اور عمومی طور پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ حکومت اور وائسرائے کن روایات اور ضوابط کے تحت کام کریں گے۔ اس کا امکان بہ ہرحال موجود رہے گا کہ ایگزیکٹو کونسل کے ارکان وائسرائے سے اختلاف کی صورت میں استعفا دے دیں یا استعفے کی دھمکی دیں گے۔ استعفے کو تدارک یا علاج کے لیے تو استعمال کیا ہی جا سکتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہم نئی حکومت کے بارے میں اپنے تصورات کی بنیاد شروع سے ہی محاذ آرائی اور استعفے کے امکان پر رکھیں۔

ان حالات میں حکومت کا جو نقشہ ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے وہ ماہیت کے اعتبار سے پچھلے نقشے سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ ہمارا اور یقیناً آپ کا مطمع نظر عوام میں ایک نئی ذہنیت پیدا کرنا ہے تاکہ وہ یہ باور کریں کہ ان کی اپنی قومی حکومت برسر اقتدار آگئی ہے اور وہ اپنی نئی حاصل کردہ آزادی کا دفاع کر رہے ہیں۔ عوام کے سامنے اگر پھر وہی پرانے نقشے انہی پرانی سرخیوں کے ساتھ رکھے گئے تو انہیں سخت مایوسی ہوگی۔ انڈیا آفس کا تسلسل، جو ہمارے لیے برائی کی علامت ہے، اس کی تصدیق کرے گا کہ حکومت کا نقشہ بدلا نہیں ہے۔ کچھ عرصے سے یہ تقریباً طے شدہ بات سمجھی جاتی ہے کہ انڈیا آفس کو جلد ختم کر دیا جائے گا کیونکہ یہ فرسودہ ہو چکا ہے۔ لیکن اب ہمیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ماضی کی یہ ناپسندیدہ یادگار بھی باقی رہے گی۔

حکومت کا نقشہ، جس کے اہم خدوخال سب پرانی ہی تصویر جیسے ہیں، کچھ ایسا ہے کہ ہم اس میں اپنے لیے کوئی جگہ نہیں نکال سکتے۔ معمول کے حالات میں ہم اس معاملے کو آسانی سے نمٹا سکتے تھے کیونکہ یہ اس منزل سے بہت دور ہے جہاں پہنچنے کی ہم اب

تک جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ لیکن آج کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہم ہر ایسی تجویز پر غور کرنے کو تیار ہیں جس کا نتیجہ ہندوستان کے دفاع کا موثر انتظام ہو۔ ہندوستان کو اس وقت جو خطرہ لاحق ہے، اس کا کسی غیر ملکی کے مقابلے میں ہمارے اوپر زیادہ اثر پڑتا ہے۔ ہم اس خطرے کا مقدور بھر مقابلہ کرنے اور اس پر قابو پانے کے خواہش مند بلکہ آرزومند ہیں لیکن جب تک ہمیں اپنی ذمے داریوں کا پورا حق ادا کرنے کی آزادی اور اختیار نہ دیا جائے اور جب تک وہ پرانا ماحول برقرار رہے جو قومی جدوجہد کے لیے ایک رکاوٹ بنا ہوا ہے، اس وقت تک ہم یہ ذمے داریاں قبول نہیں کر سکتے۔

گو کہ ہمیں آپ کی پیش کردہ تجویزیں منظور نہیں ہیں، اس کے باوجود ہم آپ کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر حقیقی معنوں میں ایک قومی حکومت قائم کر دی جائے تو ہم ذمے داری قبول کرنے کو تیار ہیں۔ ہم اس پر بھی آمادہ ہیں کہ فی الحال مستقبل کے بارے میں کوئی سوال نہ اٹھائیں حالانکہ جیسا کہ ہم پہلے عندیہ دے چکے ہیں کہ مستقبل کے متعلق ہمارے کچھ معین نظریات ہیں، ہمارا موقف یہ ہے کہ اس وقت جو قومی حکومت بنائی جائے وہ کابینہ کی حکومت ہونی چاہیے جسے مکمل اختیارات حاصل ہوں اور وہ محض وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا تسلسل نہ ہو۔ جہاں تک دفاع کا تعلق ہے، ہم پہلے ہی یہ کہہ چکے ہیں کہ اب اس کی شکل کیا ہونی چاہیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قومی حکومت کو موثر بنانے کے لیے کم سے کم یہ انتظام تو ہونا ہی چاہیے۔ اس کے بغیر عوام کے دلوں پر وہ اثر بھی نہیں ہوگا جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔

ہم آپ پر یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جو تجاویز ہم نے رکھی ہیں، وہ صرف ہماری ہی نہیں ہیں بلکہ انہیں ہندوستانی عوام کا مطالبہ سمجھنا چاہیے۔ اس مسئلے پر مختلف پارٹیوں اور گروپوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جو اختلاف ہے وہ بحیثیت مجموعی ہندوستانی عوام اور برطانوی حکومت کے درمیان ہے۔ خود ہندوستانیوں میں جو اختلافات ہیں، وہ مستقبل کی آئینی تبدیلیوں کے بارے میں ہیں۔ ہم اس مسئلے کو فی الحال ملتوی رکھنے پر رضامند ہیں تاکہ موجودہ بحران میں ہندوستان کے دفاع کے لیے زیادہ سے زیادہ اتحاد عمل ممکن ہو سکے۔ اس وقت جبکہ پورا ملک اس بات پر متفق ہے، اگر خود برطانوی حکومت ایک آزاد قومی حکومت کے قیام میں مانع ہوئی تو یہ ایک بہت بڑا قومی المیہ ہوگا اور اس سے صرف ہندوستان کے نصب العین کو ہی نہیں بلکہ ان وسیع تر مقاصد کو بھی نقصان پہنچے گا جس کے لیے آج لاکھوں انسان مصیبتیں اٹھا رہے اور مر رہے ہیں۔

آپ کا مخلص

ابوالکلام آزاد

دی رائٹ آنریبل سر اسٹیفرڈ کرپس
۳۔کوئین وکٹوریہ روڈ۔ نئی دہلی

۱۱ اپریل کو کرپس نے مجھے اس مضمون کا درج ذیل مفصل جواب دیا:

۳۔کوئین وکٹوریہ روڈ

نئی دہلی ۱۱ اپریل ۱۹۴۲

مائی ڈیئر مولانا صاحب!

آپ کا ۱۰ اپریل کا وہ خط پڑھ کر مجھے بے حد افسوس ہوا جس میں آپ نے بتایا ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہز میجسٹی کی حکومت کے مسودۂ اعلان کو مسترد کر دیا ہے۔

میں ان مسائل پر بحث نہیں کروں گا جن کا ورکنگ کمیٹی کی اصل قرارداد میں، جس کی نقل آپ نے مجھے بھیجی تھی، ذکر آ چکا ہے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ آپ کے فیصلے کا سبب یہ مسائل نہیں ہیں۔

میں یہ بھی ضروری نہیں سمجھتا کہ وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف بحیثیت وزیر جنگ کے درمیان اختیارات اور فرائض کی تقسیم کے بارے میں کچھ کہوں، گو آپ نے اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس تقسیم میں تمام امور ماسوائے ان کے جن کا

جنرل ہیڈ کوارٹرز، نیول ہیڈ کوارٹرز اور ائر ہیڈ کوارٹرز سے تعلق ہے اور وہ اس لحاظ سے کمانڈر انچیف کے ماتحت ہیں کہ وہ ہندوستان میں مسلح افواج کا سربراہ ہے، وزیر دفاع کے سپرد کیے گئے تھے۔

دفاع کے محدود شعبے کے ان کاموں کے سوا باقی تمام معاملات، جن کا تعلق اسی شعبے سے ہے، نمائندہ حیثیت رکھنے والے ان ہندوستانیوں کے سپرد کرنا تجویز کیا گیا تھا جو ایگزیکٹو کونسل کے رکن ہوتے۔ محکموں کی تفصیل یہ ہے:

ہوم ڈیپارٹمنٹ ...... داخلی نظم ونسق، پولیس اور پناہ گزین وغیرہ

فنانس ڈیپارٹمنٹ ...... ہندوستان میں جنگ سے متعلق تمام مالی وسائل

کمیونیکیشنز ڈیپارٹمنٹ ...... ریلویز، سڑکیں، ٹرانسپورٹ وغیرہ

سپلائی ڈیپارٹمنٹ ...... تمام افواج کے لیے ضروریات زندگی اور گولہ بارود کی سپلائی

انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ ڈیپارٹمنٹ ...... پروپیگنڈا پبلسٹی وغیرہ

سول ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ ...... اے آر پی اور سول ڈیفنس کی تمام صورتیں

لیجسلیٹو ڈیپارٹمنٹ ...... قواعد اور احکامات

لیبر ڈیپارٹمنٹ ...... افرادی قوت

ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ ...... ایڈمنسٹریشن اور ہندوستانی فوجیوں کے امور

کمانڈر انچیف کے ماتحت ہندوستان کے دفاع کے فوری انتظامات کو خطرے میں ڈالے بغیر منتخب ہندوستانی ارکان کو دفاعی محکموں میں اس سے زیادہ اختیارات نہیں دیے جا سکتے تھے۔ دفاع کا یہ نظام، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ہز میجسٹی کی حکومت کا اولین فرض اور ذمے داری ہے اور اتحادی اس سلسلے میں ہندوستان کی جو مدد کر رہے ہیں، اس کے پیش نظر کمان کی وحدت لازمی ہے۔

آپ نے قومی حکومت میں شریک ہونے سے جو انکار کیا ہے اس کا اصل سبب یہ ہے کہ حکومت کی جو شکل تجویز کی گئی ہے وہ ایسی نہیں ہے کہ اس کی بدولت آپ اپنے حسب منشا ہندوستان کے لوگوں کو یکجا کر سکیں۔

آپ نے دو تجویزیں پیش کی ہیں۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ اس وقت دستور بدلا جائے۔ میں اس ضمن میں یہ کہوں گا کہ آپ نے یہ تجویز پہلی مرتبہ گزشتہ شب کو پیش کی جب آپ کے پاس ہماری تجویزوں کو پہنچے ہوئے تین ہفتے گزر چکے تھے۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی کہوں گا کہ دوسرے نمائندوں میں سے ہر ایک نے، جس سے میں نے اس رائے کے متعلق گفتگو کی، یہ تسلیم کیا ہے کہ جنگ کے زمانے میں اس طرح کی کوئی قانونی تبدیلی عملاً ممکن نہیں ہوگی۔

آپ کی دوسری تجویز یہ ہے کہ ایک ایسی حکومت بنائی جائے جو صحیح معنوں میں قومی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پورے اختیارات رکھنے والی کابینہ کی حکومت ہو۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بڑے پیمانے پر بہت ہی پیچیدہ نوعیت کی آئینی تبدیلیوں کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔

موجودہ حالات میں اگر ایسا نظام آئینی روایت کے ذریعے عمل میں لایا گیا تو نامزد کی جانے والی کابینہ (جسے غالباً ملک کی بڑی سیاسی جماعتیں نامزد کریں گی) اپنے سوا کسی کے روبرو ذمے دار نہ ہوگی، اسے برطرف نہیں کیا جائے گا اور درحقیقت وہ اکثریت کی غیر محدود آمریت ہوگی۔

ہندوستان کی تمام اقلیتیں اس تجویز کو مسترد کر دیں گی کیونکہ اس طرح وہ سب کابینہ کی مستقل اور استبدادی اکثریت کے ماتحت ہو جائیں گی۔ یہ تجویز ان وعدوں سے بھی ہم آہنگ نہیں ہوگی جو ہز میجسٹی کی حکومت نے اقلیتوں کا تحفظ کرنے کے ضمن میں کر رکھے ہیں۔

ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں فرقہ وارانہ اختلافات اب بھی بہت گہرے ہیں، اس طرح کی غیر ذمے دار اکثریتی حکومت ممکن نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جب تک ہندوستان کے لوگ ایک نیا دستور مرتب نہیں کر لیتے، اس وقت تک ہز میجسٹی کی حکومت کو ہندوستان

کے لوگوں کے ان بڑے حصوں کے متعلق، جن سے اس نے وعدے کیے ہیں، اپنے فرائض کی انجام دہی جاری رکھنی چاہیے۔
ہز میجسٹی کی حکومت نے دستور میں ایسی مکمل تبدیلی کیے بغیر، جس کے بارے میں عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے کہ آج کے حالات میں ناقابل عمل ہوگی، اپنی تجویزوں میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کیا جا سکتا تھا، وہ پیش کیا ہے۔
اس طرح اگرچہ میں اور ہز میجسٹی کی حکومت دونوں مانتے ہیں کہ آپ کی ورکنگ کمیٹی دشمن کے خلاف ہر طریقے سے، جو اس کے امکان میں ہے، جنگ جاری رکھنے کی سخت خواہش مند ہے، ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی ورکنگ کمیٹی ان شرطوں پر، جو ہم نے خلوص کے ساتھ پیش کی تھیں، جنگ کی سرگرمیوں میں شریک ہونے پر آمادہ نہ ہوسکی اگرچہ ہمارے خیال میں ہندوستان کے مختلف طبقوں اور حصوں کو صرف انہی شرطوں کے تحت متحد کیا جا سکتا ہے۔

آپ کا مخلص

اسٹیفرڈ کرپس

میرا ارادہ ہے کہ اس جواب کو شائع کر دوں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

برلا ہاؤس

نئی دہلی

میں نے اسی روز خط کا جواب بھیج دیا۔

برلا ہاؤس

البوقرق روڈ۔ نئی دہلی

۱۱ اپریل ۱۹۴۲

ڈیئر سر اسٹیفرڈ!

آپ کا ۱۰ اپریل کا خط مجھے ابھی ملا ہے اور مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اسے پڑھ کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بہت تعجب ہوا ہے۔ چونکہ میں اس خط کا جواب فوراً دے رہا ہوں اس لیے جو مسائل آپ نے اٹھائے ہیں، ان میں سے چند ایک کے بارے میں ہی مختصراً لکھ سکتا ہوں۔
ہماری اصل قرارداد میں جن نکات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بہت اہم ہیں اور برطانوی تجاویز کے بارے میں کمیٹی کی سوچی سمجھی رائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ پر پہلے ہی واضح کر دیا گیا ہے، چونکہ ہم اس خطرے کے وقت ہندوستان کے دفاع اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بے حد متمنی ہیں اس لیے ان تجویزوں کو جو مستقبل کے بارے میں ہیں، فی الحال ملتوی رکھا جا سکتا ہے البتہ یہ ذمے داری اپنے کاندھوں پر لینے کا سوال صرف اسی وقت اٹھ سکتا ہے جب ذمے داری اور اقتدار حقیقی ہو۔
جہاں تک وزیر دفاع اور وزیر جنگ کے درمیان کاموں کی تقسیم کا سوال ہے، آپ نے وہ فہرست مہیا نہیں کی جس کی ہم نے درخواست کی تھی۔ اس کے بجائے آپ نے وزیر دفاع کے کاموں کی پرانی فہرست کا حوالہ دیا جو آپ جانتے ہیں کہ ہمیں بالکل منظور نہیں ہے۔ اپنے حالیہ خط میں آپ نے کچھ معاملوں کا ذکر کیا ہے جن کا جنگ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق ہے اور جو دوسرے شعبوں کے زیر انتظام ہوں گے۔ جہاں تک وزیر دفاع کا تعلق ہے، یہ بات واضح ہے کہ اس کا دائرۂ اختیار آپ کی بھیجی ہوئی فہرست کے مطابق ہوگا۔
کمانڈر انچیف کے ان اختیارات پر، جو معمول کے مطابق ہیں، کسی نے کوئی پابندی عائد کرنے کی تجویز پیش نہیں کی بلکہ ہم نے فراخدلی سے کام لیا اور اس پر بھی رضامند تھے کہ اسے بحیثیت وزیر جنگ کچھ مزید اختیارات دے دیے جائیں، لیکن یہ بات صاف ہے کہ دفاع کے بارے میں ہمارے اور برطانوی حکومت کے نظریے میں بڑا اختلاف ہے۔ ہم دفاع کو ایک قومی رنگ دے کر ہندوستان کے ہر مرد اور عورت کو اس میں شرکت کی دعوت دینا چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب اپنے عوام پر بھروسا کرنا اور اس عظیم

جدوجہد میں ان کا مکمل تعاون حاصل کرنا ہے۔اس کے برعکس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت کا نظریہ ہندوستانی عوام پر عدم اعتماد اور انہیں اصل اقتدار سے محروم رکھنے پر مبنی ہے۔آپ نے دفاع سے متعلق ہز میجسٹی کی حکومت کے فرائض منصبی اور ذمے داریوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس ذمے داری سے موثر طریقے سے عہدہ برآ ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہندوستانی عوام کو ذمے داری نہ سونپی جائے اور انہیں یہ باور نہ کرایا جائے کہ وہ واقعتاً ذمے دار ہیں۔ ماضی قریب کے واقعات اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کی حکومت یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ جنگ صرف جمہوری اور عوامی بنیاد پر ہی لڑی جا سکتی ہے۔

آپ کا یہ بیان درست نہیں کہ ہم تین ہفتوں کے بعد پہلی بار دستور میں تبدیلی کا سوال اٹھا رہے ہیں۔دوران گفتگو ہم نے کئی بار اس کا حوالہ دیا لیکن یہ درست ہے کہ ہم نے اس پر زور نہیں دیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم نئے مسائل کھڑے کرنا نہیں چاہتے تھے البتہ جب آپ نے اپنے خط میں واضح طور پر یہ کہا کہ ہم اس پر رضامند ہیں کہ جنگ کے زمانے میں آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی تو آپ کی غلط فہمی اور تاثر کو دور کرنے کے لیے ہمیں اس کی تردید کرنا پڑی۔

آپ کے خط کا آخری حصہ پڑھ کر ہمیں خاص طور پر تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس گفت وشنید کے دوران برطانوی حکومت کا رویہ روز بروز ہمارے خلاف ہوتا جا رہا ہے۔پہلی گفتگو میں ہم سے جو کچھ کہا گیا تھا اب اس سے یا تو انکار کیا جا رہا ہے یا اس کی تاویلیں کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔اس وقت آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک قومی حکومت قائم کی جائے گی جو کابینہ کی طرح کام کرے گی اور اس میں وائسرائے کی وہی حیثیت ہوگی جو انگلستان کے بادشاہ کی کابینہ کے روبرو ہے۔انڈیا آفس کے بارے میں آپ نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ اب تک کسی نے اس اہم مسئلے کو نہیں اٹھایا۔آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی عملی شکل یہی ہے کہ اسے ڈومینن کے دفتر سے منسلک یا اس میں ضم کر دیا جائے۔

یہ ساری تصویر جو آپ نے ہمارے سامنے کھینچی تھی، اسے اب اس گفتگو نے بالکل بگاڑ دیا ہے جو ہماری آخری ملاقات میں آپ سے ہوئی ہے۔

اپنے حالیہ خط میں آپ نے ایک ایسی دلیل پیش کی ہے جس کا دوران گفتگو کبھی ذکر نہیں آیا۔آپ نے خط میں اکثریت کی کامل آمریت کا حوالہ دیا ہے۔اس مرحلے پر یہ بیان دینا بہت تعجب خیز بات ہے۔ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے جو بھی مخلوط کابینہ بنائی جائے گی اسے مشکلات پیش آئیں گی لیکن اس سے بچنے کی بہت سی راہیں نکل سکتی ہیں۔اگر آپ نے یہ مسئلہ پہلے اٹھایا ہوتا تو اس پر گفتگو ہو سکتی تھی اور کوئی اطمینان بخش حل تلاش کیا جا سکتا تھا۔اب تک اس بارے میں صرف یہی تصور تھا کہ ایک مخلوط کابینہ بننی چاہیے جس کے ارکان کو آپس میں تعاون کرنا چاہیے۔ہم نے اسے منظور کر لیا تھا۔ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ کانگریس برسر اقتدار آئے لیکن ہمیں اس بات سے دلچسپی ضرور ہے کہ ہندوستانی عوام کو مجموعی حیثیت سے آزادی اور اقتدار ملے۔اس کا فیصلہ بعد میں کیا جا سکتا تھا کہ کابینہ کی تشکیل کیسے ہو اور وہ کس طرح کام کرے؟ اس سے پہلے یہ بنیادی مسئلہ حل ہونا چاہیے تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستانی عوام کو کس حد تک اختیارات سونپنے پر آمادہ ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہم نے کبھی اس کا حوالہ نہیں دیا اور نہ ہی اس پر گفتگو کی۔اس کے باوجود آپ نے یہ مسئلہ پہلی بار اس خط میں اٹھایا ہے جو غالباً آپ کا آخری خط ہے۔اس طرح آپ نے اصل اختلافی مسئلے کو ٹالنے کی کوشش کی ہے جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اپنی پہلی ہی ملاقات کے دوران میں نے کہا تھا کہ اس مرحلے پر فرقہ وارانہ یا اس طرح کے اور مسائل نہ اٹھائے جائیں۔جیسے ہی برطانوی حکومت حقیقی اقتدار اور ذمے داری منتقل کرنے کا فیصلہ کرے گی، متعلقہ لوگ باقی مسائل کامیابی کے ساتھ خود حل کر لیں گے۔آپ نے یہ تاثر دیا کہ آپ میرے اس نقطہ نظر سے متفق ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اگر برطانوی حکومت ایسی پالیسی اختیار نہ کرے جس سے تفرقہ بڑھتا ہے تو ہم سب خواہ کسی پارٹی یا گروپ سے تعلق رکھتے ہوں، مل جل کر ایک مشترکہ لائحہ عمل پر متفق ہو جائیں گے۔لیکن افسوس ہے کہ اس شدید خطرے کے وقت بھی برطانوی حکومت اپنی تباہ کن پالیسی سے دست کش نہیں ہو پا رہی۔مجبوراً ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ برطانوی حکومت حملے اور

جارحانہ کارروائیوں کے خلاف ہندوستان کے موثر دفاع کے مقابلے میں اس بات کو زیادہ اہمیت دیتی ہے کہ ہندوستان پر امکانی مدت تک اپنی گرفت قائم رکھے اور اسی مقصد کے پیش نظر وہ ملک میں نفاق اور انتشار کو تقویت دے رہی ہے۔ ہمارے لیے اور ہم سب ہندوستانیوں کے لیے ہندوستان کا دفاع اور سلامتی سب سے مقدم ہے اور ہم اسی پیمانے سے چیزوں کو جانچتے ہیں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ میرے نام بھیجے جانے والے خط کو شائع کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اصل قرارداد اور وہ خطوط شائع کردیں جو آپ نے ہمیں اور ہم نے آپ کو لکھے تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

مخلص

ابوالکلام آزاد

دی رائٹ آنریبل سر اسٹیفر ڈ کرپس
۳-کوئین وکٹوریہ روڈ
نئی دہلی

ضمیمہ نمبر ۴

ہندوستان چھوڑ دو قرارداد

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کی ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ کی قرارداد پر نہایت توجہ سے غور کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے ان واقعات پر بھی غور کیا جو بعد میں رونما ہوئے ہیں۔ اس میں جنگ کی صورت حال، برطانوی حکومت کے ذمے دار ترجمان کے بیانات اور وہ تبصرے اور تنقیدیں بھی شامل ہیں جو ہندوستان کے اندر اور باہر کی گئی ہیں۔ کمیٹی اس قرارداد کو منظور اور اس کی توثیق کرتی ہے۔ کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ اس کے بعد سے اب تک رونما ہونے والے واقعات نے اس قرارداد کو مزید حق بجانب ثابت کیا ہے اور یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ ہندوستان سے برٹش راج کا فوری خاتمہ نہ صرف ہندوستان بلکہ اقوام متحدہ کے نصب العین کی کامیابی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس حکومت کے تسلسل کی وجہ سے ہندوستان پستی کی طرف مائل اور کمزور ہوتا جا رہا ہے اور اس میں اپنا دفاع کرنے اور دنیا کی آزادی کی جدوجہد میں معاونت کرنے کی استعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔

کمیٹی نے روس اور چین کے محاذ جنگ پر بگڑتی ہوئی صورت حال پر مایوسی کا اظہار کیا ہے اور روسی اور چینی عوام جس بے جگری سے اپنی آزادی کے دفاع کی جنگ لڑ رہے ہیں اس کے لیے کمیٹی انہیں خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ اس روز بروز بڑھتے ہوئے خطرے کے پیش نظر یہ اشد ضروری ہے کہ وہ لوگ جو آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور جو لوگ جارحانہ کارروائیوں کا شکار ہونے والوں سے ہمدردی رکھتے ہیں، وہ اتحادیوں کی اب تک کی پالیسی کا جائزہ لیں جس کی وجہ سے انہیں پے در پے اور تباہ کن ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان پالیسیوں اور طریقوں پر قائم رہ کر کامیاب ہونا ناممکن ہے کیونکہ یہ بات بالکل ظاہر ہو چکی ہے کہ ناکامی ان کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ پالیسی آزادی سے زیادہ محکوم قوموں پر اپنا تسلط قائم رکھنے اور شہنشائیت کی روایات اور طریقوں کو جاری رکھنے پر مبنی ہے۔ برطانوی سلطنت کے مقبوضات حکمرانوں کے لیے طاقت اور توانائی کا باعث بننے کے بجائے ایک بوجھ اور لعنت بن گئے ہیں۔ ہندوستان جدید سامراجیت کا مثالی نمونہ ہے۔ یہی اب اصل عقدہ ہے کیونکہ ہندوستان کی آزادی وہ کسوٹی ہے جس پر برطانیہ اور اقوام متحدہ کو پرکھا جائے گا۔ اس کی آزادی ایشیائی اور افریقی قوموں کو امید اور ولولوں سے لبریز کر دے گی۔

غرض ہندوستان سے برطانوی اقتدار کا خاتمہ ایک ایسا بنیادی اور فوری مسئلہ ہے جس پر جنگ کے مستقبل اور جمہوریت اور آزادی کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ آزاد ہندوستان نازی ازم، فاشزم اور سامراجیت کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف اپنے عظیم وسائل کو بروئے کار لا کر آزادی کا ضامن بن جائے گا۔ اس کا اثر جنگ کے مادی حالات پر ہی نہیں پڑے گا بلکہ اس کی وجہ سے اقوام متحدہ کو ساری محکوم اور مظلوم انسانیت کی حمایت حاصل ہو جائے گی اور اس طرح ان اقوام کو، جن کے ساتھ ہندوستان بھی ہوگا، دنیا کی اخلاقی اور روحانی قیادت مل جائے گی۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہندوستان برطانوی سامراجیت کی علامت رہے گا اور اس بدنما دھبے کا اثر اقوام متحدہ کے مستقبل پر پڑے گا۔

موجودہ خطرات کا فوری تقاضا ہے کہ ہندوستان کو آزاد اور برطانوی شہنشائیت کو ختم کیا جائے۔ مستقبل کے بارے میں کوئی بھی یقین دہانی یا وعدہ موجودہ صورت حال پر اثر انداز نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ان خطروں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ان وعدوں سے عوام کے دل و دماغ پر وہ نفسیاتی اثر نہیں پڑ سکتا جس کی اس وقت اشد ضرورت ہے۔ صرف آزادی ہی ان کروڑوں انسانوں کے دلوں کو گرما سکتی ہے اور اس بے پناہ قوت کو بروئے کار لا سکتی ہے جو اس جنگ کی ماہیت کو فوراً بدل دے گی۔

ان حالات میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہندوستان سے برطانوی اقتدار کے خاتمے کا پرزور مطالبہ کرتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے اعلان کے بعد ایک عبوری حکومت بن جائے گی اور آزاد ہندوستان اتحادیوں کا حلیف بن کر آزادی کی مشترکہ جدوجہد

کی آزمائشوں اور مصیبتوں میں برابر کا شریک بن جائے گا۔ چونکہ عبوری حکومت ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے تعاون اور اشتراک ہی سے بن سکتی ہے اس لیے یہ ایک جامع حکومت ہو گی جس میں ہندوستانی عوام کے تمام اہم طبقوں کو نمائندگی دی جائے گی۔ اس حکومت کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی فوجی طاقت اور عدم تشدد کے اصولوں پر کاربند قوتوں کو بروئے کار لاکر اتحادیوں کے ساتھ ہندوستان کا دفاع کرے اور کھیتوں، کارخانوں اور دوسرے شعبوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی بہبود اور ترقی کا انتظام کرے کیونکہ اقتدار کے اصل مالک یہی محنت کش ہیں۔ عبوری حکومت دستور ساز اسمبلی کے لیے ایک اسکیم بنائے گی۔ یہ اسمبلی ہندوستان کے لیے ایک ایسا دستور مرتب کرے گی جو ملک کے ہر طبقے کے لیے قابل قبول ہو۔ کانگریس کا نظریہ یہ ہے کہ اس دستور کو وفاقی ہونا چاہیے جس میں وفاق کی ہر اکائی کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو اور یہ اکائیاں ہی بقیہ غیر مندرج اختیارات کی مالک ہوں۔ جہاں تک ہندوستان اور اتحادی اقوام کے درمیان مستقبل کے تعلقات کا سوال ہے، یہ ممالک باہمی گفت وشنید کے ذریعے ایسی صورت پیدا کرلیں گے جس میں سب کے لیے بہتری ہو اور جو دفاع کے مشترکہ کام کو تعاون کے ساتھ انجام دینے میں معاون ثابت ہو۔ ہندوستان آزاد ہوا تو زیادہ موثر طریقے سے حملے کی مدافعت کر سکے گا کیونکہ اس کے پیچھے عوام کی متحدہ قوت اور خواہش کارفرما ہو گی۔

ہندوستان کی آزادی ان ایشیائی ملکوں کے لیے آزادی کی علامت اور پیش خیمہ ہو گی جو دوسرے ملکوں کے زیر اقتدار ہیں۔ برما، ملایا، ہند چینی، ایران اور عراق کو بھی غیر ملکی تسلط سے مکمل آزادی ملنی چاہیے۔ یہ بات پوری طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ جو ملک اس وقت جاپانیوں کے قبضے میں ہیں، جنگ کے بعد ان پر کسی دوسری سامراجی طاقت کا قبضہ نہیں ہو گا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لیے اگرچہ ہندوستان کی آزادی اور اس خطرے کے وقت ملک کا دفاع مقدم ہے لیکن کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ مستقبل کے امن، سلامتی اور دنیا کی منظم ترقی کے لیے قوموں کے ایک ایسے عالمی وفاق کی ضرورت ہے جس میں تمام آزاد قومیں شامل ہوں۔ دور جدید کے مسئلوں کا اس کے سوا کوئی حل نہیں ہے۔ یہ عالمی وفاق رکن ملکوں کی آزادی، جارحانہ کارروائیوں کے دفاع، ایک قوم کے ہاتھوں دوسرے کے استحصال کی موثر روک تھام، قومی اقلیتوں کے تحفظ، تمام پسماندہ علاقوں اور قوموں کی ترقی اور دنیا بھر کے وسائل کو یکجا کر کے انہیں تمام ملکوں کے مشترک مفاد کے لیے بروئے کار لانے کا ضامن ہو گا۔ اس عالمی وفاق کے قیام کے بعد تمام ملکوں میں اسلحے کی تخفیف عملاً ممکن ہو جائے گی۔ قومی فوجوں اور بحری اور فضائی بیڑوں کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ ایک عالمی وفاقی دفاعی فوج پوری دنیا میں امن وامان برقرار رکھے گی اور جارحانہ کارروائیوں کا سدباب کرے گی۔

آزاد ہندوستان ایسے عالمی وفاق میں بخوشی شریک ہو گا اور بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے لیے دوسری قوموں کے ساتھ برابری کی بنیاد پر پورا تعاون کرے گا۔

جو بھی ملک اس کے بنیادی اصولوں سے اتفاق کرے گا، اسے اس عالمی وفاق میں شامل ہونے کا حق ہو گا۔ لیکن موجودہ جنگ کے پیش نظر فی الحال یہ وفاق صرف اقوام متحدہ پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اگر اس وقت یہ قدم اٹھایا گیا تو نہ صرف جنگ بلکہ محوری ملکوں کے عوام اور مستقبل کے امن پر بھی اس کا بہت گہرا اثر پڑے گا۔

کمیٹی نہایت افسوس کے ساتھ یہ محسوس کرتی ہے کہ جنگ کے المناک اور تباہ کن سبق اور ان خطرات کے باوجود، جو اس وقت دنیا کو درپیش ہیں اور چند ملکوں کی حکومتیں اس وقت ایک عالمی وفاق کی طرف یہ ناگزیر قدم اٹھانے پر تیار ہیں، برطانوی حکومت کے تاثرات اور غیر ملکی اخبارات کی گمراہ کن نکتہ چینیوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کی مزاحمت کی جا رہی ہے حالانکہ اس مطالبے کا اولین مقصد ہندوستان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اس موجودہ خطرے کا مقابلہ کر سکے، اپنے دفاع کا انتظام کر سکے اور اس آڑے وقت پر چین اور روس کی مدد کر سکے۔ کمیٹی ایسا کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتی جس سے چین اور روس کا دفاع خطرے میں پڑ جائے، جن کی آزادی بہت قیمتی ہے اور اس کا ہر قیمت پر تحفظ ہونا چاہیے یا جس سے اقوام متحدہ کی مدافعانہ استعداد میں کسی طرح کی کمی واقع ہو۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہندوستان اور ان ملکوں کے لیے خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

ایک بیرونی حکومت کی اطاعت اور بے عملی کی وجہ سے ہندوستان پست ہوتا جارہا ہے اور اس میں اپنا دفاع کرنے اور بیرونی حملے کی مدافعت کرنے کی استعداد گھٹتی جارہی ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے نہ تو بڑھتے ہوئے خطرات کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اقوام متحدہ کے ملکوں کی کوئی خدمت کی جا سکتی ہے۔ اب تک برطانیہ اور اقوام متحدہ پر ورکنگ کمیٹی کی مخلصانہ اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس سے ہندوستان اور دنیا کی ضرورتوں سے ناواقفیت اور ہندوستان کی آزادی کے مطالبے کی جانب غیر ملکی حلقوں کے معاندانہ رویے کا اظہار ہوتا ہے جو نسلی برتری اور بے جا تسلط قائم رکھنے والی ذہنیت کا خاصہ ہے۔ یہ ذہنیت ایک ایسی قوم کے لیے ناقابل برداشت ہے جو خوددار ہے اور جسے اپنی قوت اور اپنے مطالبے کے حق بجانب ہونے پر پورا اعتماد ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی عالمی آزادی کے پیش نظر برطانیہ اور اقوام متحدہ سے ایک بار پھر اپیل کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کمیٹی یہ بھی محسوس کرتی ہے کہ قوم کو ایک ایسی تحکم پسند سامراجی حکومت کے خلاف اپنے عزم اور ارادے کے اظہار سے باز رکھنے کا کوئی جواز نہیں ہے جو اس پر مسلط ہے اور جو اسے اپنے اور انسانیت کے مفاد میں کام کرنے سے روکتی ہے چنانچہ یہ کمیٹی ہندوستان کی آزادی اور خودمختاری کے پیدائشی حق کو ثابت کرنے کے لیے عدم تشدد کے اصولوں کے مطابق وسیع پیمانے پر عوامی جدوجہد شروع کرنے کی اجازت دیتی ہے تاکہ ملک پچھلے بائیس سال کی پرامن جدوجہد میں حاصل کی ہوئی اہنسا کی قوت کو بروئے کار لا سکے۔ یہ جدوجہد لازمی طور پر گاندھی جی کی قیادت میں ہوگی اس لیے کمیٹی ان سے اپیل کرتی ہے کہ وہ قوم کی قیادت کا فریضہ انجام دیں اور اس سلسلے میں مناسب اقدامات تجویز کریں۔

کمیٹی ہندوستان کے عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ آنے والے خطروں اور صعوبتوں کا استقلال، ہمت اور صبر کے ساتھ مقابلہ کریں اور تحریک آزادی کے تربیت یافتہ سپاہیوں کی طرح ہدایات پر عمل کریں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی تحریک کی اساس عدم تشدد پر ہے۔ ممکن ہے ایک وقت ایسا آئے جب ہدایات جاری کرنا یا انہیں عوام تک پہنچانا مشکل ہو اور کوئی کانگریس کمیٹی کام نہ کر سکتی ہو۔ ایسی صورت میں ہر مرد اور عورت کو، جو اس جدوجہد میں شریک ہے، عمومی ہدایات کے اندر رہ کر اپنی جدوجہد کو جاری رکھنا ہوگا۔ اس طویل اور دشوار سفر میں، جس کے درمیان دم لینا ممکن نہیں اور جو بالآخر ہمیں نجات اور آزادی کی منزل تک پہنچائے گا، ہر ہندوستانی کو خود اپنا راہبر بننا پڑے گا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے آزاد ہندوستان کی مستقبل کی حکومت کے بارے میں اپنا نقطہ نظر صاف بیان کر دیا ہے لیکن وہ تمام متعلقہ فریقوں پر یہ بھی واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس جدوجہد کو شروع کرنے سے اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ کانگریس کو اقتدار حاصل ہو۔ اقتدار جب بھی حاصل ہوا، وہ ہندوستان کے تمام لوگوں کی ملکیت ہوگا۔

ضمیمہ نمبر ۵

برطانوی حکومت کا ۳ جون کا بیان

۱- ۲۰ فروری ۱۹۴۷ کو ہز میجسٹی کی حکومت نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ جون ۱۹۴۸ تک برٹش انڈیا میں حکومت کا اختیار ہندوستانیوں کے ہاتھ میں منتقل کرنا چاہتی ہے۔ ہز میجسٹی کی حکومت کو امید تھی کہ ملک کی بڑی پارٹیاں کیبنٹ مشن کے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ کے پلان کے مطابق عمل کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گی اور ہندوستان کے لیے ایک ایسا دستور مرتب ہو جائے گا جو تمام متعلقہ فریقوں کے لیے قابل قبول ہو۔ یہ امید پوری نہیں ہو سکی۔

۲- مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی پی اور برار، آسام اور اڑیسہ اور شمالی سرحدی صوبوں کے نمائندوں کی اکثریت اور دہلی، اجمیر، میرواڑہ اور کورگ کے نمائندوں نے نیا دستور مرتب کرنے کا خاصا کام مکمل کر لیا ہے۔ دوسری طرف مسلم لیگ پارٹی نے، جس میں بنگال، پنجاب اور سندھ کے اکثر نمائندے اور برٹش بلوچستان کا ایک نمائندہ شامل ہے، دستور ساز اسمبلی کی کارروائی میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

۳- ہز میجسٹی کی حکومت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ اقتدار کی منتقلی ہندوستان کے لوگوں کی مرضی کے مطابق ہو۔ اگر ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے درمیان اتفاق ہوتا تو یہ کام بہت آسان ہو جاتا لیکن چونکہ ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے اس لیے ہز میجسٹی کی حکومت پر یہ فرض عائد ہو گیا ہے کہ ایسا طریقہ دریافت کرے جس سے ہندوستان کے لوگوں کی خواہش معلوم کی جا سکے۔ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے ساتھ مکمل صلاح مشورے کے بعد ہز میجسٹی کی حکومت نے اس پلان کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ہز میجسٹی کی حکومت یہ بات صاف کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا منشا ایسا دستور بنانا نہیں ہے جو آخری اور قطعی حیثیت رکھتا ہو، یہ معاملہ ہندوستانیوں کے آپس میں طے کرنے کا ہے، نہ ہی اس پلان میں ایسی کوئی بات موجود ہے جو ہندوستان کو متحد رکھنے کے لیے مختلف طبقوں کے درمیان گفتگو میں مانع ہو۔

۴- ہز میجسٹی کی حکومت موجودہ دستور ساز اسمبلی کے کام میں کوئی رکاوٹ ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اب چونکہ بعض صوبوں کے لیے، جن کی تفصیل نیچے درج ہے، انتظام کیا جا چکا ہے، ہز میجسٹی کی حکومت امید کرتی ہے کہ اس اعلان کے نتیجے میں ان صوبوں کے مسلم لیگی نمائندے، جن کی اکثریت دستور ساز اسمبلی کے کام میں شریک ہے، اب دستور سازی میں پوری شرکت کریں گے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ اسمبلی جو آئین بنائے گی وہ ملک کے ان حصوں میں نافذ نہیں ہو گا جو اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ ہز میجسٹی کی حکومت کو اطمینان ہے کہ جو طریق کار نیچے درج کیا جا رہا ہے وہ ایسے لوگوں کی رائے معلوم کرنے کا بہترین طریقہ ہے کہ ان کا آئین (الف) موجودہ دستور ساز اسمبلی میں مرتب کیا جائے گا؟ یا (ب) ایسی نئی اور جداگانہ دستور ساز اسمبلی میں جو ان علاقوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو گی جنہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شریک نہیں ہوں گے۔

جب ایسا کر لیا جائے گا تو یہ تعین کرنے کا امکان ہو جائے گا کہ اختیار کس مقتدر جماعت یا جماعتوں کو منتقل کیا جائے گا۔

۵- بنگال اور پنجاب کی صوبائی قانون ساز اسمبلیوں سے، جن میں ان کے یورپی اراکین شامل نہیں ہوں گے، کہا جائے گا کہ وہ اپنے دو دو حصے کر لیں، ایک وہ جو مسلم اکثریت کے علاقوں کے نمائندوں اور دوسرا جو صوبے کے بقیہ حصے کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ ضلعوں کی آبادی کا تعین ۱۹۴۱ کی مردم شماری کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ اس اعلان کے ساتھ ضمیمے کے طور پر ان دونوں صوبوں کے وہ اضلاع درج ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

۶- ان دونوں صوبوں میں سے ہر ایک کی قانون ساز اسمبلی کے دونوں حصوں کے اراکین، جن کا اجلاس الگ الگ ہو گا، اس

بارے میں رائے دینے کے مختار بنائے جائیں گے کہ صوبہ تقسیم کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ اگر کسی حصے کی اکثریت تقسیم کے حق میں فیصلہ کرے تو صوبے کو تقسیم کر دیا جائے گا اور اس کے مطابق انتظام کیا جائے گا۔

۷- مناسب ہوگا کہ تقسیم کے بارے میں فیصلہ کرنے سے پہلے ہر حصے کے نمائندوں کو معلوم ہو کہ اگر بعد میں متحد رہنے کا فیصلہ کیا گیا تو صوبہ مجموعی طور پر کس قانون ساز اسمبلی میں شریک ہوگا۔ اس لیے اگر دونوں میں سے کسی قانون ساز اسمبلی کے ارکان اس کا مطالبہ کریں تو یورپی ممبروں کو چھوڑ کر قانون ساز اسمبلی کے باقی تمام ارکان کا ایک اجلاس ہوگا جس میں اس معاملے کے متعلق فیصلہ کیا جائے گا کہ اگر دونوں حصے متحد رہنے کا فیصلہ کریں تو صوبہ مجموعی اعتبار سے کس قانون ساز اسمبلی میں شامل ہوگا؟

۸- اگر یہ فیصلہ کیا گیا کہ تقسیم کی جائے گی تو قانون ساز اسمبلی کا ہر ایک حصہ ان علاقوں کی طرف سے، جس کی وہ نمائندگی کرتا ہے، طے کرے گا کہ پیراگراف نمبر ۴ میں جو دو صورتیں تجویز کی گئی ہیں ان میں سے کس کو اختیار کرے گا؟

۹- بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلیوں کے ممبر دو حصوں میں، جن میں سے ایک مسلم اکثریت اور دوسرا غیر مسلم اکثریت کے ضلعوں کی نمائندگی کرتا ہوگا، تقسیم کے مسئلے کا فیصلہ کرنے کے فوری مقصد کے لیے اجلاس منعقد کریں گے۔ یہ ایک بالکل ابتدائی اور خالصتاً عارضی کارروائی ہے کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ ان صوبوں کی آخری اور قطعی تقسیم کے لیے حد بندی کے مسئلوں کی تحقیق ضروری ہوگی اور جیسے ہی تقسیم کے متعلق فیصلہ ہو جائے گا، صوبوں میں سے ہر ایک کے لیے ایک باؤنڈری کمیشن مقرر کر دیا جائے گا جس کی رکنیت اور اختیارات و فرائض متعلقہ لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد طے کیے جائیں گے۔ اس کمیشن کو ہدایت کی جائے گی کہ وہ پنجاب کے دونوں حصوں کی حد بندی متصل مسلم اور غیر مسلم اکثریت کی بنیاد پر کر دے۔ اسے اس کی بھی ہدایت دی جائے گی کہ وہ معاملے کے دوسرے پہلوؤں کا بھی لحاظ رکھے۔ بنگال کے باؤنڈری کمیشن کو بھی اسی قسم کی ہدایات جاری کی جائیں گی۔ جب تک حد بندی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق عملدرآمد نہیں ہو جائے گا اس وقت تک وہ حدیں، جو ضمیمے میں بتائی گئی ہیں، وقتی طور پر صحیح سمجھی جائیں گی۔

۱۰- سندھ کی صوبائی قانون ساز اسمبلی، جس میں یورپی ارکان شامل نہیں ہوں گے، اپنے ایک خصوصی اجلاس میں ان دونوں متبادل صورتوں کے متعلق فیصلہ کرے گی جو پیراگراف نمبر ۴ میں درج ہیں۔

۱۱- شمال مغربی سرحدی صوبے کی پوزیشن سب سے الگ ہے۔ اس صوبے کے تین میں سے دو نمائندے موجودہ دستور ساز اسمبلی کی کارروائی میں پہلے ہی حصہ لے رہے ہیں لیکن صوبے کے جغرافیائی مقام اور دوسری باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ ظاہر ہے کہ اگر پورے پنجاب یا اس کے کسی حصے نے فیصلہ کیا کہ وہ موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شریک نہیں ہوگا تو اس کی ضرورت ہوگی کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کو اپنی حیثیت کے متعلق غور کرنے کا دوبارہ موقع دیا جائے۔ اگر ایسی صورت پیش آئی تو ان لوگوں سے، جنہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبے کی موجودہ قانون ساز اسمبلی کا انتخاب کیا ہے، استصواب کیا جائے گا کہ وہ پیراگراف نمبر ۴ میں درج دونوں میں سے ایک طریق کار کا انتخاب کریں۔ استصواب گورنر جنرل کی سرپرستی اور صوبائی حکومت کے مشورے سے عمل میں آئے گا۔

۱۲- برٹش بلوچستان نے ایک نمائندے کا انتخاب کیا ہے لیکن وہ موجودہ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوا۔ اس کے جغرافیائی مقام کی وجہ سے اس صوبے کو بھی اپنی حیثیت پر دوبارہ غور کرنے اور پیراگراف نمبر ۴ میں درج طریق کار میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا موقع دینا ہوگا۔ ہز ایکسیلینسی گورنر جنرل غور کر رہے ہیں کہ اس کے لیے بہترین صورت کیا ہوگی؟

۱۳- آسام گو غیر مسلم اکثریتی صوبہ ہے لیکن سلہٹ کا ضلع، جو بنگال سے ملا ہوا ہے، وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اگر بنگال تقسیم کیا جائے تو سلہٹ کو بنگال کے مسلم حصے میں شامل کر دیا جائے۔ اس لیے اگر یہ طے کیا گیا کہ بنگال تقسیم ہوگا تو سلہٹ کے ضلع میں گورنر جنرل کی سرپرستی میں اور آسام کی صوبائی حکومت کے مشورے سے اس مسئلے کو طے کرنے کے لیے ریفرنڈم کرایا جائے گا کہ سلہٹ کا ضلع صوبہ آسام میں شامل رہے یا اسے مشرقی بنگال کے نئے صوبے میں ضم کر دیا جائے۔ اس کے بعد ایک باؤنڈری کمیشن قائم کیا جائے گا جس کے اختیارات اور فرائض پنجاب اور بنگال کے باؤنڈری کمیشن جیسے ہوں گے

تاکہ وہ سلہٹ ضلع کے مسلم اکثریت کے علاقوں اور اس سے متصل ضلعوں کے مسلم اکثریت کے علاقوں کی حدیں مقرر کردے۔ جب یہ حدیں مقرر ہو جائیں گی تو پورا علاقہ مشرقی بنگال میں شامل کر دیا جائے گا۔ صوبہ آسام کا باقی حصہ بہرحال موجودہ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں بدستور شرکت کرتا رہے گا۔

۱۴- اگر یہ طے ہوا کہ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دیا جائے تو نئے انتخابات ضروری ہوں گے تاکہ یہ صوبے اپنے نمائندوں کو اس اصول کے مطابق، جو کیبنٹ مشن کے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ کے پلان میں درج ہے، ہر دس لاکھ پر ایک نمائندہ منتخب کر سکیں۔ اگر سلہٹ کے ضلع کو مشرقی بنگال کا ایک حصہ بنانے کا فیصلہ ہوا تو اس صورت میں ایسا ہی انتخاب سلہٹ میں کرانا ہوگا۔ ہر علاقے کو حسب ذیل تفصیل کے مطابق نمائندے منتخب کرنے کا حق ہوگا۔

صوبے	عام نشستیں	مسلمان	سکھ	میزان
ضلع سلہٹ	۱	۲	......	۳
مغربی بنگال	۱۵	۴	......	۱۹
مشرقی بنگال	۱۲	۲۹	......	۴۱
مغربی پنجاب	۳	۱۲	۲	۱۷
مشرقی پنجاب	۶	۴	۲	۱۲

۱۵- ان مختلف علاقوں کے نمائندے، ان ہدایات کے مطابق، جو انہیں دی جائیں گی، یا تو موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوں گے یا ایک نئی دستور ساز اسمبلی بنے گی جو اُن نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔

۱۶- جس قسم کی بھی تقسیم طے پائے، اس کے انتظامی نتائج کے سلسلے میں درج ذیل فریقوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جلد از جلد شروع کرنا ہوگا۔

(الف) نمائندے اور متعلقہ مقتدر جماعت، جو اختیارات کی وارث ہوگی، ان تمام امور کے بارے میں، بشمول دفاع، مالیات اور مواصلات، جو اس وقت مرکزی حکومت کے ذمے ہیں۔

(ب) مختلف مقتدر جماعتوں، جو اختیارات کی وارث ہوں گی، ان کے اور ہز مجسٹی کی حکومت کے درمیان ایسے معاہدے کرنے کی غرض سے جو اختیارات کی منتقلی کے سبب پیدا ہوں گے۔

(ج) جو صوبے تقسیم ہوں، ان میں صوبائی نظام حکومت سے متعلق امور کے بارے میں، جیسے اثاثہ جات اور قرضے، پولیس اور دوسری ملازمتیں، ہائیکورٹ اور صوبائی ادارے وغیرہ۔

۱۷- ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کے قبائل سے وہ مقتدر جماعت معاہدے کرے گی جو موجودہ حکومت کی جانشین ہوگی۔

۱۸- ہز مجسٹی کی حکومت اس بات کو صاف کر دینا چاہتی ہے کہ مندرجہ بالا فیصلوں کا تعلق صرف برٹش انڈیا سے ہے اور ہندوستانی ریاستوں کے متعلق اس کی پالیسی میں جو کیبنٹ مشن کی ۱۲ مئی ۱۹۴۶ کی یادداشت میں بیان کی گئی ہے، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

۱۹- یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ کارروائیاں، جن کا اوپر ذکر آیا ہے، جلد سے جلد مکمل کر لی جائیں تاکہ یہ مقتدر جماعتیں، جو موجودہ حکومت کی جانشین ہوں گی، اپنے آپ کو اقتدار لینے کے قابل بنا سکیں۔ وقت بچانے کے لیے مختلف صوبے یا صوبوں کے حصے، جہاں تک ممکن ہوگا اس پلان کی شرائط پر الگ الگ عمل کریں گے۔ موجودہ دستور ساز اسمبلی اور نئی دستور ساز اسمبلی (اگر بنائی گئی) اپنے متعلقہ علاقوں کے لیے آئین مرتب کرنا شروع کر دیں گی۔ ظاہر ہے کہ اپنے لیے قواعد وہ خود بنائیں گی۔

۲۰- ملک کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں نے بار بار اپنی اس خواہش پر اصرار کیا ہے کہ ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی جلد سے جلد عمل میں آنی چاہیے۔ ہز مجسٹی کی حکومت کو اس خواہش سے پوری ہمدردی ہے اور وہ اس پر رضامند ہے کہ آزاد ہندوستان کی حکومت یا حکومتوں کے قیام کے لیے جون ۱۹۴۸ سے پہلے کوئی تاریخ متعین کر کے اقتدار کی منتقلی عمل میں لے آئے۔ یہ سمجھ کر اس خواہش کو

جلد سے جلد پورا کرنے کا واحد عملی طریقہ یہی ہے ہز میجسٹی کی حکومت کا ارادہ ہے کہ اسی اجلاس کے دوران اسی سال ڈومینین حیثیت کی بنیاد پر ایک یا دو مقتدر جماعتوں کو (جو اس اعلان کے مطابق فیصلہ کرنے سے قائم ہوں گی) اختیارات منتقل کرنے کے لیے قانونی تجویز پیش کرے۔ اس کارروائی کا ہندوستان کی دستور ساز اسمبلیوں کے اس حق پر کوئی اثر نہیں ہوگا کہ وہ مناسب وقت پر طے کریں کہ ہندوستان کا وہ حصہ، جس میں انہیں اختیار ہے، دولت مشترکہ میں شامل رہے یا نہ رہے۔

ہز ایکسیلینسی گورنر جنرل وقتاً فوقتاً مندرجہ بالا انتظامات پر عمل کرنے کے طریق کار اور دوسرے مسائل کے متعلق حسب ضرورت مزید اعلانات کرتے رہیں گے۔

پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کے ضلعے ۱۹۴۱ کی مردم شماری کے مطابق حسب ذیل ہیں۔

پنجاب

لاہور ڈویژن:...... گوجرانوالہ، گورداسپور، لاہور، شیخوپورہ، سیالکوٹ

راولپنڈی ڈویژن:...... اٹک، گجرات، جہلم، میانوالی، راولپنڈی، شاہ پور

ملتان ڈویژن:...... ڈیرہ غازی خان، جھنگ، لائل پور، منٹگمری، ملتان، مظفر گڑھ

بنگال

چٹاگانگ ڈویژن:...... چٹاگانگ، نواکھلی، تپرہ

ڈھاکا ڈویژن:...... باقر گنج، ڈھاکا، فرید پور، میمن سنگھ

پریذیڈنسی ڈویژن:...... جیسور، مرشد آباد، ندیا

راج شاہی ڈویژن:...... بوگرہ، دیناج پور، مالدہ، پبنہ، راج شاہی، رنگ پور

اشاریہ

(شخصیات)

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصے میں مجرموں کا یہ کٹہرا ہے، تمہارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی! میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا! آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کریں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے، وقت اس کا جج ہے۔ وہ جو فیصلہ لکھے گا اسی کا فیصلہ آخری ہوگا!

ابوالکلام آزاد

ISBN: 969-883-500-9
9789698835002